زاہدہ حنا

تتلیاں ڈھونڈنے والی

(افسانے)

زاہدہ حنا

تتلیاں ڈھونڈنے والی

(افسانے)

تتلیاں ڈھونڈنے والی

(افسانے)

مصنفہ:

زاہدہ حنا

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

104/B ـ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ـ ۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : **تتلیاں ڈھونڈنے والی** (افسانے)
مصنفہ : زاہدہ حنا
رابطہ : zahedahina@gmail.com
تعداد : ۴۰۰

ناشر : انیس امروہوی
○ **تخلیق کار پبلشرز**
104/B - یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی - ۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش
مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی - ۱۱۰۰۰۶
- کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی - ۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲ (یو۔پی)
- رائی بک ڈپو، ۷۳۴ - اولڈ کٹرہ، الہ آباد - ۲۱۱۰۰۲ (یو۔پی)
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی - ۴۰۰۰۰۸
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ - ۸۰۰۰۰۴ (بہار)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی - ۱۱۰۰۰۶

T.P.: 0196 ISBN: 978-93-80182-11-7
TITLIYAAN DHOONDNE WALI *(Short Stories)* 2010
By ZAHEDA HINA Rs 280.00
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B - YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI - 110092
Ph.: 011-22442572, 9811612373 E-mail:qissey@rediffmail.com

○

بُھلّے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ھور

اَجل کی راہ پر

تتلیاں، جگنو، خوشبو ڈھونڈنے والوں کے نام

○○

فہرست

○○

ناکجا آباد

جاتی ہوئی دھوپ ستونوں سے لپٹ کر دھیرے دھیرے یوں اتر رہی ہے جیسے کوئی آہستہ آہستہ تہ خانے کی سیڑھیاں اترتا ہے۔ محرابوں میں جہاں کچھ دیر پہلے دھوپ کی چادر تنی ہوئی تھی اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ محرابیں میری بانہوں کی مانند خالی اور ویران ہیں۔ جامن اور پیپل کے زرد پتے ہوا کے بگولوں کے ساتھ ان محرابوں میں ایک لمحے کے لئے اپنا چہرہ دکھاتے ہیں پھر تھک ہار کر زمین پر گر جاتے ہیں۔ میں چبوترے سے ٹیک لگائے کھڑی ہوں اور ان ستونوں اور محرابوں کو دیکھتی ہوں' ان کا سُونا پن اور اداسی مجھے یاد دلاتی ہے کہ یہ جگہ میرے گھر سے کس قدر مشابہ ہے' اپنی تعمیر میں نہیں' اپنی تنہائی اور ویرانی میں۔

ابھی کچھ دیر بعد جب دھوپ ستونوں سے اتر کر خاک میں مل جائے گی تو ملازم شور مچاتے ہوئے کچھ چیزیں گراتے اور کچھ سنبھالتے ہوئے آئیں گے۔ کرسیاں گھسیٹ کر نیم ہلالی انداز میں رکھی جائیں گی پھر سفید میز پوشوں سے بجی ہوئی میزیں ان کرسیوں کے سامنے نہایت سلیقے سے لگا دی جائیں گی۔ اس کے بعد آوازوں کا' قدموں کی چاپ' بچوں کی ہنسی اور بوڑھوں کی بڑبڑاہٹ کا ایک ملا جلا شور بلند ہوگا اور سب لوگ اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیں گے۔ ملازم ایک مرتبہ پھر آئیں گے۔ اس مرتبہ وہ دبے پاؤں آئیں گے' ان میں سے ہر ایک کے ہاتھوں میں اسٹین لس اسٹیل کی چمکتی ہوئی ٹرے ہوگی جس میں چائے کے برتن کھنک رہے ہوں گے اور اشتہا انگیز چیزوں کی خوشبو پیور سیلون ٹی کی میٹھی مہک میں

کھل مل جائے گی۔ بچے پلیٹوں میں پڑی ہوئی چیزوں پر ٹوٹ پڑیں گے' بڑے انہیں سلیقے سے کھانے کی ہدایت کریں گے اور بوڑھے کھانس کھانس کر اپنے وجود کا احساس دلائیں گے۔ پھر یہ سب لوگ باتیں کرنے لگیں گے۔ حال کی باتیں' مستقبل کی باتیں' اگلی فیکٹری کا منصوبہ' آئندہ ہفتے خریدے جانے والے پلاٹ کا ذکر' ان لائسنسوں کا تذکرہ جن کے وہ خواب دیکھتے ہیں جن کے حصول کی خاطر وہ اپنا آپ بیچ سکتے ہیں۔ بچے نئے کامکس خریدنے کی فرمائش کریں گے اور بیویاں جو دو منزلہ اپارٹمنٹس میں علیحدہ علیحدہ رہتے ہوئے بھی جوائنٹ فیملی کا لطف اٹھاتی ہیں' روزانہ کی طرح آج بھی ان جدید اپارٹمنٹس کی پشت پر بنے ہوئے پرانے وضع کے چبوترے پر اس بوڑھے کے ساتھ چائے پییں گی جو سب سے نمایاں مقام پر بیٹھ کر جانے کیا سوچتا ہے۔ سنجیدہ چہروں والے یہ مرد جو آپس میں بھائی ہیں یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کاروبار بڑھانے اور پھیلانے کے لئے پبلک ریلیشنگ اور دنیاداری کس قدر ضروری ہے' وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے باوجود اچھی اچھی باتیں کریں گے اور ان میں سے کسی کو بھی ماضی یاد نہیں آئے گا کیونکہ ان کے لئے ماضی بہت دور رہ گیا ہے۔

وہ بوڑھا چائے پیتے پیتے ان سب کے بے روح چہروں کو دیکھے گا اور پھر نگاہیں جھکا لے گا' یہ سب لوگ جو اس کا اپنا خون ہیں' ان کے چہروں پر خوشامد کی گرد ہے۔ یہ اس سے اور اس کے شاندار ماضی سے کٹے ہوئے لوگ ہیں' کٹی ہوئی پتنگیں۔ وہ انہیں حقارت سے دیکھے گا اور اس کی موم گی مونچھوں میں غصے کی تھرتھراہٹ دوڑ جائے گی' پھر وہ خاموشی سے مجھے دیکھے گا اور مجھ میں اپنا چہرہ ڈھونڈے گا' اپنا چہرہ اور اس کے علاوہ دوسرے اور بہت سے چہرے' بہت سی یادیں' بہت سی باتیں۔

جب ان ستونوں اور محرابوں پر' دروں اور دیواروں پر میری نظر پڑتی ہے تو مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے' وہ گھر جو مجھ سے زیادہ یہاں باتیں کرنے والوں کا گھر تھا لیکن جسے اس بوڑھے کے سوا سب بھول چکے ہیں۔ یہ باتیں اگر میں بآوازِ بلند سوچنے لگوں تو یہ لوگ قہقہے مار کر ہنسیں گے اور مجھ سے پوچھیں گے کہ کس گھر کی باتیں کرتی ہو؟ تمہارا گھر تو یہ ہے' جس

کے چبوترے سے ٹیک لگائے تم کھڑی ہو اس کے سوا تمہارا گھر بھلا کہاں ہے؟ اور ان لوگوں کو ہنسنا ہی چاہیے کیونکہ انہیں نہیں معلوم کہ گھر اینٹوں سے بنی ہوئی چار دیواری، چھت اور کمروں کا نام نہیں، گھر تو وہ جگہ ہے جو ہمارے اندر بسی ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایسی جگہ میرا گھر ہو جہاں میں نے آنکھ نہ کھولی ہو زندگی نہ گزاری ہو بلکہ جسے میں نے دیکھا تک نہ ہو۔ اس سے میرا روح کا رشتہ ہو بالکل ایسے ہی جیسے بہت سے لوگوں کا روح کا رشتہ مقدس مقامات اور مزاروں سے استوار ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے کبھی ان جگہوں کو دیکھا نہیں ہوتا' ان مزاروں کی خاک اپنے چہروں پر نہیں ملی ہوتی لیکن وہ جگہیں ان کا گھر ہوتی ہیں۔ ایسے گھر جن میں ان کی روح آباد ہو۔

میں سوچتی ہوں کہ وہ گھر اب کس حال میں ہوگا جس کی روشن پرچھائیں میرے وجود پر اپنا سایہ ڈالتی ہے۔ شاید اس کی چھتیں گر گئی ہوں اور دیواریں ڈھ گئی ہوں' اس کے آنگن میں اور کیاریوں میں خودرو پودے اور گھاس اُگ آئی ہو اور اس گھاس میں سانپ اور بچھو سر سراتے ہوں اور اس کے در و دیوار پر گزرے ہوئے وقت کے بھوت ناچتے ہوں لیکن وہ برباد اور ویران گھر میرے دل میں کس کس طرح آباد ہے' اس کے وجود کی خوشبو کی کیسی لپٹیں اٹھتی ہیں' دھرتی کی مہک' مٹی کی خوشبو۔

مٹی کی خوشبو پر مجھے وہ قبریں یاد آئیں جو بہت سی برساتوں کے بعد دھنس گئی ہوں گی' جن پر اب نہ چراغ جلتا ہے' نہ اُگر کی خوشبو پھیلتی ہے اور نہ ان کے سرہانے بیٹھ کر دھیمی آواز سے کوئی رونے والا رہا ہے۔ ان قبروں کو چھونے والی باد شمال مجھے آواز دیتی ہے' مشرق میں پھیلے ہوئے سرمئی پہاڑوں کے سلسلے میری طرف بانہیں پھیلاتے ہیں اور چندتن شہید پیر مجھے اپنے قدموں میں بلاتے ہیں۔ آج بھی شام جب ان پہاڑوں کے دامن میں پھیلتی ہے تو شیر اپنی کچھاروں سے نکلتے ہیں اور ان قبروں کے سامنے قلعے کے پہریداروں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں' پھر رات کی تاریکی میں ان کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں ان شہید مردوں کے مزار پر چراغ کی طرح روشن رہتی ہیں۔ یہ آنکھیں میرا انتظار کرتی ہیں' حسن خان کی باؤلی اور آدم خان کی اٹلی اور شیر شاہ کے تالاب کی منڈیروں پر میرے

نام کے دیوے جلتے ہیں۔ اللہ اللہ میں اپنے وجود پر کس قدر مُصر ہوں' وہی اَنا کی جنگ' لب و لہجے کا طمطراق' لاموجود الا اللہ' جب خدا کو اپنے وجود پر اتنا اصرار ہے تو پھر یہ اصرار مجھے کیوں نہ ہو کہ میں بھی موجود تو ہوں۔

گھر ویران' قبریں تنہا اور ان میں سونے والے بے آرام۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ دیوزاد اجداد نے بونے جانشینوں کو جنم دیا اور ان بونے جانشینوں کی اولاد وہ لوگ ہیں جو یہاں ہر شام شور مچاتے ہیں اور محض بیکار باتیں کرتے ہیں' یہ سب کتنے خوش اور کس قدر آباد ہیں۔ میں یہاں ان سب لوگوں کی موجودگی کے باوجود تنہا ہوں' صرف ایک لمس ایسا ہے جو میرے سر اور پشت پر تھرتھراتا ہے اور میرا احساس تنہائی چند ساعتوں کے لئے معدوم ہو جاتا ہے۔ یہ بوڑھا لمس اس شام کتنا جوان تھا جب اس نے مجھے میرے کُل سے جدا کیا تھا اور میں اس کی جدائی کا نوحہ نہ پڑھ سکی تھی' ماتم نہ کر سکی تھی کہ میں گلاب کی ایک شاخ تھی' ایک ایسی شاخ جو آج کے بوڑھے اور کل کے جوان کو اس لئے بہت عزیز تھی کہ میں گلاب کے جس پودے کا حصہ تھی اسے اس کے باپ نے محبت سے اپنے گھر کے آنگن میں لگایا تھا۔

محبتوں کا یہ سلسلہ بہت دراز تھا۔ اس آنگن کے ہر درخت اور پودے سے رفتگاں کی یاد وابستہ تھی۔ جامن کا پیڑ دادا نے لگایا تھا' جوہی پھوپھی اماں کے ہاتھوں کھلی تھی' امرود بادا جان کا لگایا ہوا تھا اور ہار سنگھار دادی مرحومہ کی یادگار تھا۔ ہر یاد سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی تھی اور خاندانی ورثے کے طور پر اگلی نسلوں کو دی جا رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح آدم نے اپنی روایت شیث کو سونپی اور شیث نے انوش کو' انوش نے قینان کو اور قینان نے محللی ایل کو' محللی ایل نے یارد کو' یارد نے حنوک کو اور حنوک نے متوشالح کو اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا' چلتا رہا پھر میرے بزرگ کے آنگن تک پہنچا۔

میں اپنے آس پاس کھڑے جامن اور پیپل کے پیڑوں کو دیکھتی ہوں اور حیران ہوتی ہوں۔ نہ جانے یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ انہیں اس زمین میں کس نے لگایا تھا اور ان کی جڑیں زمین میں جانے کہاں تک پھیلی ہیں۔ یہ پیڑ ان لوگوں کی باقیات ہیں جو

آج یہاں نہیں ہیں اور جانے کہاں ہیں۔ یہ بھی ان انسانوں کی طرح ہیں جن کا حسب نسب وقت کی اکھاڑ پچھاڑ میں گم ہو چکا اور اب یہ بے حیثیت اور گم نام ہیں۔ میں بھی انہی کی طرح بے حیثیت ہوں' میرا شجرۂ نسب تو اسی آنگن میں رہ گیا جس میں میری جڑیں تھیں۔اپنے سر اور پشت پر تھرتھراتے ہوئے لمس سے کبھی کبھی مجھے نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ اسی لمس نے مجھے گھر سے بے گھر کیا' مجھے میرے قدموں کی گیلی مٹی سے دور کیا۔ یہ سب چیزیں اس وقت جب کہ موجود تھیں کتنی معمولی اور غیر اہم تھیں لیکن اب جبکہ یہ کہیں نہیں ہیں کتنی اہم ہو گئی ہیں۔

اہم اور غیر اہم باتیں' کتنی بہت سی یادیں' کتنے بہت سے لمحے جو میرے وجود میں زہرِ قاتل کی طرح سرایت کر چکے ہیں آن کی آن میں چہرہ دکھاتے ہیں اور پھر وحشی ہرن کی طرح یاد کے جنگل میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ تب بہت سی آوازیں شکاری کتوں کی طرح میرا تعاقب کرتی ہیں' میں ان کے قدموں کی چاپ سن کر بھاگتی ہوں اور بھاگتی چلی جاتی ہوں' پھر میرا سانس اکھڑنے لگتا ہے' میں زمین پر گر جاتی ہوں اور یہ آوازیں چاروں طرف سے مجھے گھیر لیتی ہیں۔ یہ ابھی اپنے نوکیلے دانتوں سے میری گردن ادھیڑ دیں گی' میری پنڈلیاں چبا جائیں گی اور پھر...... پھر دوسرے دن بھی یہی کھیل دہرایا جائے گا اور تیسرے دن بھی۔

یاد کی دھند میں لپٹی ہوئی سہ پہر کے سائے پھیل رہے ہیں۔ بڑے دالان میں لڑکیاں تخت پر آبِ رواں کے دوپٹے پھیلائے بیٹھی ہیں۔ مٹی کی خلچیوں میں گلابی' نیلے' سرخ اور سبز رنگ گھلے ہوئے ہیں۔ گوند کے سفوف نے انہیں گاڑھا کر دیا ہے۔ ججو بن بہو نے رنگ کی ان خلچیوں میں پرانے اور دبیز کپڑوں کو تہ کر کے بھگو دیا ہے۔ اب لکڑی کے خوبصورت بھاگل پوری ٹھپے جن پر طرح طرح کے بیل بوٹوں کے نقش ابھرے ہوئے ہیں' رنگ میں بھیگے ہوئے ان دبیز کپڑوں پر پھیر کر تر کیے جائیں گے اور دوپٹے چھاپے جائیں گے۔ ججو بن بہو بی بی کی ساڑھیاں لئے بیٹھی ہیں۔ ایک ساڑھی لہریا رنگی جائے گی اور دوسری تلنگا رنگ' وہ لہریا رنگ کے لئے 'سوت کی ڈوریوں کو مروڑی دے رہی ہیں۔

لڑکیوں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے ہیں، شام سر پر کھڑی ہے، کوئی لمحہ جاتا ہے کہ منا کو بوا اپنا جھم جھماتا پرات سر پر دھرے، مانگ میں سیندور، ماتھے پر بڑی سی بندیا سجائے، الٹا آنچل اوڑھے، کڑے بجاتی، ہاتھی دانت کے چوڑے اور چاندی کی چوڑیاں چھکاتی آ پہنچیں گی۔ رام رام کرتے ہوئے پرات سر سے اتار کر دالان کی دہلیز پر رکھیں گی پھر بی بی کو ہاتھ جوڑ کر بندگی کریں گی اور ''گوڑ لگے ہیں بی بی'' کہہ کر زمین پر بیٹھ جائیں گی۔ پرات پر سے ململ کا دوپٹا ہٹائیں گی تو گرما گرم سنبوسے، پیاؤ، اندرسے، تلکٹ، چنے کے چٹ پٹے، منگریلا پڑے نمک پارے اور املی کے پنے کی خوشبو سے سارا دالان مہک جائے گا۔'' بھئی جلدی کرو، میاں بس اب اٹھنے والے ہیں'' ایک لڑکی۔ نے دوسری لڑکیوں سے کہا ہے'' تنی لڑکن لوگ جلدی کرا، تو لوگن تو نگوڑا ہاتھن نہیں چلتا'' بجو بن بہو ناراض ہوتی ہیں۔

جلدی کرو، پردہ گراؤ، وقت کا رہوار ان سب کو اپنے قدموں تلے روندتا گزر رہا ہے۔ زندگی، موت، اجالا اور اندھیرا اور پھر اجالا۔ طاقوں میں رکھے دیے جلاؤ۔

شام ڈھل چکی، ماماؤں نے بیلے۔ کے کھلتے پھول سرخ اک رنگے بیں لپیٹ کر گھڑوں کے سر پوشوں پر دھرے اور چھڑکاؤ کیے آنگن میں پلنگڑیاں گھسیٹ کر ایک طرف سلیقے سے لگا دیں۔ ان پلنگڑیوں پر خوبصورت بیل بوٹوں والے سوتی غالیچے بچھے ہوئے ہیں جو میاں پچھلے برس مونگیر سے لائے تھے۔ دوسری طرف چوکوں کا تخت لگا ہے جس پر چاندنی کھنچی ہے اور چاندنی پر طبلے کی طرح کسے ہوئے گاؤ تکیے رکھے ہیں۔ تخت کے ساتھ پیچوان دہکتا ہے، عظیم آبادی تمباکو کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے۔ ابھی میاں مغرب کی نماز پڑھ کر بڑے در سے کھنکارتے ہوئے نکلیں گے اور اپنا دوشالہ سنبھالتے ہوئے تخت پر آ بیٹھیں گے، پیچوان کی نے ہاتھ میں تھام کر بھرے بھرے ہونٹوں تک لے جائیں گے پھر تمباکو کی خوشبو اور آنگن میں پرا جمائے پودوں پر کھلتے ہوئے پھولوں کی مہک میں گم ہو جائیں گے۔

بھادوں کا مہینہ ہے، بی بی حضرت خواجہ خضر کا روزہ کھول کر بڑی بڑی روٹیوں پر بھورا کتھا، ڈلی اور پان رکھ کر اور نیاز دے کر باہر پلنگڑی پر آ بیٹھیں گی۔ ڈلی کتریں گی اور نئے پانوں کی ڈھولی کو الٹ پلٹ کر دیکھیں گی۔ ان کی آب رواں کی ساڑی میں ٹکی ہوئی ابرک

جھلملائے گی۔ بالیوں میں گندھے ہوئے بیلے کے پھول سر کی جنبش کے ساتھ جھولتے رہیں گے اور وہ بیڑا لگاتے ہوئے ہلکے سروں میں گنگنائیں گی۔ الاہ تیری گلیوں میں برسے نور بیلا بھی بویا' چنبیلی بھی بوئی' الاہ میں نے بوئے ہزاروں پھول' بیلا بھی پہنا چنبیلی بھی پہنی الاہ تیری گلیوں میں برسے نور

دالان سے پرے' دہلیز سے پرے' صدر دروازے سے پرے' سیتا کنڈ پر' حسن خان کی باؤلی پر' بڑے امام باڑے پر' شیر شاہ کے روضے پر' کیمور کی پہاڑیوں پر' بدری نرائن پر اور چندتن شہید پیر کے مزار پر الاہ کا نور برستا رہے گا۔

باورچی خانے میں بھولو بہومٹی کی کوری سکوریوں میں غازی میاں کی انکھیاں جما رہی ہیں۔ آٹے کی آنکھ بنی ہے' چینی اور دودھ میں پکائی گئی ہے' رات کے کھانے سے پہلے مولوی صاحب مردانے سے بلائے جائیں گے اور وہ مسعود سالار غازی کی نیاز دیں گے۔ سکوریوں میں جمی ہوئی' چینی اور دودھ میں پکی ہوئی آنکھیں راہ دیکھیں گی' جانے والوں کی راہ۔

اوبڑ کھابڑ گلی میں میونسپلٹی کی لالٹین ہلدی ایسی روشنی پھیلا رہی ہے۔ یہ روشنی چند گز کے بعد اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ گلی سے کوئی پالکی گزر رہی ہے۔ کہاروں کے ننگے پیروں کی چاپ پر ان کی آواز غالب ہے' ہانپتی ہوئی' ٹوٹتی ہوئی آواز۔ اونچا نیچا دیکھ کے' بی بی کی سواری آئی' اونچا کھالا دیکھ کے' اونچا نیچا دیکھ کے۔

کہاروں کی آواز دور چلی گئی ہے اور گلی تومڑی کی آواز سے بھر جاتی ہے۔ یہ آواز گلی والوں کو یاد دلاتی ہے کہ آج بدھ' سولہوں سُدھ ہے۔ آج کی رات باؤل شاہ کی رات ہے۔ باؤل شاہ کی ملال انگیز اور پاٹ دار آواز صدیوں پرانے گھروں کی دیواروں' دروں' تھموں اور ڈاٹوں پر سر ٹپکنے لگتی ہے۔ لکھ لکھ پتیا کے بھیجن کنور سنگھ۔ اے سن امر سنگھ بھائی ہو رام۔ چمڑے کے ٹٹروا دانت سے ہو کاٹے' کہ چھتری کا دھرم نسائے ہو رام۔ بتیا کے کارن سے بابو کنور سنگھ' فرنگی سے ہو ریڑھ بڑھائے ہو رام۔

مرزا عبدالستار بیگ سہرامی بادامی کاغذ پر خواجۂ خواجگان' سلطان الہند معین الدین

چشتی کے باب میں لکھتے لکھتے رک گئے ہیں' باؤل شاہ کی آواز کا خنجر ان کے سینے میں ہمیشہ کی طرح اتر گیا ہے۔ وہ جرمن شیشے کی چمنی والے دو بتی لیمپ کی لو کو دیکھتے ہیں۔ اس کی دونوں بتیوں کی لو پر انہیں اپنے باپ کا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آتا ہے' پھر وہ چہرہ لہریں لینے لگتا ہے اور دریائے جہلم کے کنارے اس پیڑ کی ڈالیوں پر پھول کی طرح کھلنے لگتا ہے جس پر اس چہرے کے توانا بدن اور باغی روح نے زندگی کی آخری سانس لی تھی۔

مرزا عبدالستار بیگ کی آنکھیں پُرآب ہو جاتی ہیں۔ جہلم کی سوندھی مٹی بہت دور ہے۔ پیپل کا وہ پیڑ بہت دور ہے جس پر ان کے باپ نے سولی پائی تھی اور جس کے سائے میں سہسرام کی مٹی سے کاڑھا ہوا وہ شہید خون سوتا ہے۔ مرزا دلدار بیگ عرف خاکی شاہ' خاکی لباس پہننے والے اور خاک ملنے والے کو اگر جہلم کے مہر بہاول بخش نے پیپل کے ہرے پیڑ کی ڈالی سے اتار کر سپرد خاک کیا اور پھر خاکی شاہ کے نام سے یاد کیا' تو کیا غلط کیا۔

مرزا عبدالستار بیگ ولد مرزا دلدار بیگ۔ شہید باپ کا صوفی منش بیٹا' بادامی کاغذ پر نیلی روشنائی سے لکھے ہوئے اپنے حروف کو دیکھتا ہے' پچھوا چل رہی ہے۔ ریت گھڑی کے نیچے دبے ہوئے کاغذ پچھوا کے چلنے سے پھڑ پھڑاتے ہیں۔ جرمن لیمپ کی لویں بھڑکتی ہیں۔ مسالک السالکین فی تذکرہ الواصلین' سلوک اور تصوف کی منزلیں' وصل اور فراق کے درجے' شہید باپ کے صوفی مزاج بیٹے نے اپنی اس کتاب میں سب چیزیں سمیٹ لی ہیں۔

باؤل شاہ کی آواز بہت دور چلی گئی ہے اور سمٹ کر آواز کا نقطہ بن گئی ہے۔ جگدیش پور کی طرف سے آتی ہوئی ہوائیں کنور سنگھ' امر سنگھ اور نشان سنگھ کے خون کی خوشبو سے بھیگی ہوئی ہیں۔ یہ راجپوتوں کے خون کی خوشبو ہے جو لال قلعے کی طرف پیر کر کے نہیں سوتے تھے اور جو اپنے بادشاہ کے لئے کمپنی بہادر کی فوجوں سے لڑ مرے تھے۔

کچھ دور پر تھانے میں فرنگی راج کے نائبین اپنی مونچھوں کو بل دے رہے ہیں اور باؤل شاہ کی آواز کا ڈنک اپنی سماعتوں میں اترنے نہیں دیتے۔

دائرہ کے سجادہ نشین کا ہاتھ کانپ جاتا ہے۔لوہے کی کھلی ہوئی صندوقچی اشرفیوں سے بھری ہوئی ہے اور ان کی گداز انگلیاں ان اشرفیوں کے ابھرواں حصوں کو چھو رہی ہیں۔

وہ باؤل شاہ کی دور جاتی ہوئی آواز سن کر حقارت سے سر کو جھٹکتے ہیں۔ سہسرام میں کاسٹلے صاحب کی نیل فیکٹری جب باغیوں نے لوٹی تو انہوں نے باغیوں کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن ان موذیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چلی تھی۔ پھر انہی کی کوششوں سے شہر کو باغیوں سے پاک کیا گیا۔سہسرام کے مجسٹریٹ بیکر صاحب اور آرہ کے ویک صاحب نے انہیں دربار سے سندِ وفاداری دلوائی۔ ''حضرت'' کا خطاب عطا ہوا۔ وہ سہسرام میں سرکارِ انگلشیہ کے دست راست ہیں۔کنور سنگھ اور اُس جیسے دوسرے تمام نابکار کیفر کردار کو پہنچائے جا چکے ہیں۔ملکہ ٹوریہ کے راج میں اب ہر طرف چین ہی چین ہے اور ایک یہ باؤل شاہ ہے کہ ابھی تک کنور سنگھ امر سنگھ گائے جاتا ہے۔ملکہ ٹوریا کے چہرے والی اشرفیاں ان کی انگلیوں سے پھسل کر آہنی صندوقچی میں گر رہی ہیں۔

مرزا عبدالستار بیگ سہسرامی کی ریت گھڑی میں ریت پھسل رہی ہے وقت گزر رہا ہے۔

مرزا صاحب ریت کی گھڑی کو دیکھتے ہیں' وقت بہت گزر گیا۔کام ابھی بہت باقی ہے۔ وہ سنبھل کر خواجۂ خواجگان' سلطان الہند معین الدین چشتی اجمیری کے باب میں ایک جملہ لکھتے ہیں'' راہِ محبت وہ راہ ہے کہ جو کوئی عشقِ دوست میں اس راہ پر آیا بے نام و نشاں ہوا۔''

وہ رک کر اپنے لکھے ہوئے جملے کو دوبارہ پڑھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ سلوک کی منزلیں عشقِ حقیقی میں مبتلا صوفیوں کے علاوہ عشقِ بشر میں گرفتار عارفوں نے بھی طے کی ہیں۔

وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جب ان کے باپ اور ان جیسے دوسرے اَن گنت ہندوستانیوں کو پھانسیاں لگ رہی تھیں' عین اسی زمانے میں ہندوستان سے ہزاروں میل دور لندن کے ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں رہنے والا ایک جرمن' ہندوستان کے بارے میں اور ہندوستانی جنگ آزادی کے بارے میں مراسلوں پر مراسلے لکھ رہا تھا اور اس کے لکھے ہوئے مراسلے ''نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' میں چھپ رہے تھے۔

یہ وہ عارف تھا کہ جس کی شطحیات کچلے ہوئے مظلوم انسانوں کو حیاتِ نو کی نوید دینے والی تھیں۔ یہ وہ تھا کہ جو مراتبِ طریق کے پانچوں مرحلوں علم، عمل، نیت، صدق اور عشق سے سربلند و سرخرو گزرا تھا۔ یہ وہ تھا جس کے بارے میں ایک کشمیری نژاد برہمن زادہ بے ساختہ کہنے والا تھا "آں کلیم بے تجلی، آں مسیحِ بے صلیب۔

عشقِ بشر کی انتہاؤں کو پہنچنے والے اس جرمن نے اپنے ایک مراسلے میں جہلم کی اس بغاوت کے بارے میں لکھا تھا جس کے نتیجے میں مرزا دلدار بیگ اور ان کے ساتھیوں نے پھانسی پائی۔ ایک دوسرے مراسلے میں اُن کے پرکھوں کے علاقے پٹنہ، آرہ اور شاہ آباد کی بغاوتوں کی تفصیلات لکھی تھیں۔ راجا کنور سنگھ اور راجا امر سنگھ کے حملوں کا ذکر کیا تھا۔

مرزا عبدالستار بیگ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ جرمن ایک یارِ وفادار بھی رکھتا تھا اور اسی یارِ وفادار نے جس کا نام فریڈرک اینگلز تھا "نیویارک ڈیلی ٹریبیون" میں لکھا تھا کہ جگدیش پور کے جنگل باغیوں کی آماجگاہ ہیں اور ان کی کمان امر سنگھ کے ہاتھ میں ہے جس نے گوریلا جنگ کی تکنیک سے بہتر واقفیت اور عملی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔

اُس یارِ وفادار نے جب یہ جملہ لکھا تھا اس وقت وہ بھی ہوچی منہ اور چی گویرا کے نام سے واقف نہ تھا جنہیں اس کے بعد ہونا تھا اور جن کا شمار گوریلا جنگ کے ماہرین میں ہونے والا تھا۔

انسان کس قدر کم جانتا ہے۔ اپنے زمانے کے بارے میں، اپنے بعد آنے والے زمانے کے بارے میں، انسان بچوں کی طرح ہے، انہی کی طرح ناواقف، انہی کی طرح لاعلم۔

نچلے آنگن میں بچے جمع ہیں اور کھیل رہے ہیں۔ ان کی آواز مرزا صاحب تک آ رہی ہے۔ آلو گالو ماموں چور، باگھ جیسے بگولا جیسے، ساون ماس کریلا پھولے، پھول پھول کی بالیاں، باوا گئے گنگا، لائے سات پیالیاں، ایک پیالی پھوٹ گئی، نیولے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، کھنڈا ماروں یا چھری؟

بہت سے بچوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہوتی ہیں "کھنڈا۔"
اور پھر پہلی آواز چیخ کر کہتی ہے "تیری ماں کا پیٹ ٹھنڈا!"

اس کے ساتھ ہی بہت سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز ہے اور ساتھ ہی ان کے گلوں سے پھوٹتے ہوئے قہقہوں کے جھرنے ہیں جو مختلف دروں میں گم ہو جاتے ہیں۔

رات کو فراغت کے بعد یہی بچے اپنی بوا کو گھیر کر بیٹھیں گے اور شہزادہ فرخندہ بخت کی کہانی سنانے کی فرمائش کریں گے۔ بوا اپنی پن کُٹی میں پان کوٹتے ہوئے انہیں ٹالیں گی لیکن بچے ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ پھر بوا کی بوڑھی مگر گرج دار آواز آنگن کے اس گوشے کو بھر دے گی۔

سوتا سب سنسار' جاگتا پاک پروردگار' ایک تھا بادشاہ' ہمارا تمہارا خدا بادشاہ' کانوں سنی کہتے ہیں۔ اس بادشاہ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا پر نعمت سے اولاد کی محروم تھا۔ اسی غم میں رات دن روتا تھا اور جان اپنی کھوتا تھا۔ ایک دن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک فقیر ملک شام سے پھرتا پھراتا بادشاہ کے محل کے نیچے میں آیا۔

یہ آواز رات کے سناٹے کو ہلاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہے گی اور کہانی کا سفر جاری رہے گا۔ پھر نیند ان بچوں کو گھیرنے لگے گی اور جب ہنکارا بھرنے والا کوئی نہ رہے گا تو بوا کہانی ناتمام چھوڑ کر ایک ٹھنڈی سانس بھریں گی اور خوابوں کے محل میں بھٹکنے لگیں گی۔

اس محل میں خون کی سوگ نشیں یادوں کا رنگ بکھرا ہوا ہے۔ جہلم کی مٹی میں امانت کے طور پر سونے والا وہ شہید اور زندہ خون جو رگوں میں دوڑتا تھا تو اپنے ریلے میں فرنگیوں کو دور تک لے گیا تھا اور جب غلطاں بخاک ہوا تو اپنے خاندان کی پیشانی پر فخر و تمکنت کی تحریر لکھ گیا۔ وہ خون جس کا سفر سہسرام سے شروع ہوا اور جہلم کی مٹی میں آسودہ ہوا۔ اس خون کا نمک' بوا اور ان کی اولادوں کے بدن میں اتنی دور تک اتر گیا کہ اب ان کے خوابوں میں بھی اس خون کی سوگ نشیں یادیں ہیں۔ بیچاری بوا اور ان جیسے بیچارے تمام لوگ خداوند خدا کے بنائے ہوئے عظیم نظام کے حقیر بندے۔

خداوند خدا کی تعظیم کرو کہ اس نے انسانوں کو طبقوں میں تقسیم کیا اور پھر ان طبقوں میں کچھ کو حاکم اور کچھ کو محکوم کیا۔

خاموش رہو' یہاں سب چپ سادھے ہوئے ہیں۔ دروں میں آویزاں آنکڑوں

میں لٹکتی ہوئی لالٹینیں حسبِ معمول جھول رہی ہیں' ہوا کی تیزی سے ان کی لو کبھی تیز ہو جاتی ہے تو کچے شیشے پر کاجل کی لکیر کھنچ جاتی ہے۔

میں نے اس آنگن میں کاجل کی بہت سی لکیروں کا منہ دھلتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ سسکیاں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں جو اس آنگن میں آدھی رات کے بعد ابھریں اور پھر اسی آنگن کی مٹی میں دفن ہو گئیں۔ وہ سبھی سبھی محبتیں اور نرم و نازک سائے جو سوز دروں سے شمع کی طرح پگھل کر بہہ گئے۔ کسی کے لبوں کو چھونے کی آرزو میں کانپتی ہوئی انگلیاں اور کسی کے قدموں کی چاپ سن کر زرد پڑ جانے والے چہرے۔ اب نہ وہ چاہنے والے رہے اور نہ محبتیں اور رفاقتیں رہیں۔ سب کچھ ختم ہوا' وقت کی آگ میں بھسم ہوا۔ اس آنگن میں جس میں نہ جانے کتنی ڈولیاں اتریں اور نہ جانے کتنے ڈولے وہاں سے اٹھے۔ اب وہاں کچھ نہیں' خاک اڑتی ہے۔'' جائے عبرت سرائے فانی ہے۔'' اب یہ باتیں خواب ہیں' طرح دار اور توانا زندگی کے تمام مناظر وقت نے اس طرح لپیٹ دیے ہیں جس طرح کینوس پر بنے ہوئے کسی ڈرامے کے مختلف سین ڈنڈوں پر لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ وہ سب لوگ اور تمام چیزیں جو زندہ تھیں اور تا ابد زندہ رہنے کی خواہش رکھتی تھیں' کسی ڈرامے کے بے جان منظر کی طرح تاریخ کے ڈنڈوں پر لپیٹ دی گئیں لیکن میں اپنی یادوں کے مناظر لپیٹنے کی بجائے کھول دیتی ہوں۔

میں جب زخمی بدن یہاں لائی گئی تو گلاب کی ایک چھوٹی سی شاخ تھی اور اب ایک اونچا پودا ہوں۔ نوکیلی مونچھوں والا یہ بوڑھا مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے یہاں اس چبوترے کے پاس بہت حفاظت سے مجھے پرورش کیا ہے اور پھر اس نے میرے وجود کو تقسیم بھی کیا ہے۔ میرے وجود کی قلمیں دوسری کیاریوں میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن میں آج بھی اپنے آپ کو گلاب کی وہی زخمی شاخ محسوس کرتی ہوں جسے یہ شخص اپنے پردادا اور نگر دادا کے گھر سے اس مکان میں لایا تھا۔ یہ شخص نہیں جانتا کہ جب وہ مر جائے گا تو اس کے بیٹے اور پوتے اور بہوئیں اس کے پروردہ درختوں اور پودوں کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ وہ دور ختم ہوا جب باپ کی چھوڑی ہوئی بے قیمت چیز بھی بیٹے کی قیمتی میراث ہوتی تھی۔ یہ

سب لوگ جو اپنے اپنے سینوں میں چاند پر جانے کی خواہش چھپائے بیٹھے ہیں' یہ سب حال کے باشندے ہیں' یہ خلاء سے آئے ہیں اور خلاء میں گم ہو جائیں گے۔ گمنامی ان کا مقدر ہے اور گمراہی ان کا راستہ۔ سو انہیں ان کی راہ پر چلنے دو کہ انسانوں کا ہر گروہ اسی راہ پر چلتا ہے جو اس کا مقسوم ہے اور مقسوم کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتی اور جانتی بھی ہوں۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ مقسوم کو میں نہیں مانتی اور مانتی بھی ہوں۔

آج میرے بدن پر کوئی گلاب نہیں کھلا ہے' میری بانہیں خالی ہیں اور دل کسی ویران گھر کی طرح بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ اس خالی گھر میں ہوا گزری ہوئی آوازوں' کہی ہوئی باتوں اور بھولی بسری یادوں کا ناٹک رچاتی ہے۔ پردہ اٹھتا ہے اور پردہ گرتا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے اور پھر اٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ حجاب درمیاں آتے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں' پرچھائیاں نزدیک آتی ہیں اور دور ہو جاتی ہیں۔ آواز ابھرتی ہے پھر معدوم ہو جاتی ہے۔ عدم اور وجود سب وقت کا کھیل ہے اور آواز بھی عدم میں ایک وجود ہے۔ عدم میں ایک وجود؟ یہ بھی خوب رہی۔ سربریدہ آوازیں' بصارت سے محروم مناظر اور آنے والے دنوں کے چھلاوے میرے سامنے موت کا رقص کرتے ہیں اور جب میں چیخیں مارتی ہوں تو یہ تمام سراب اور سائے معدوم ہو جاتے ہیں۔ یہ جو عدم سے وجود میں آئے تھے پھر عدم کی سرزمین کی طرف لوٹ جاتے ہیں لیکن میرے لئے واپسی کی تمام راہیں مسدود ہیں۔ چاروں کھونٹ آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے دیو پہرا دیتے ہیں اور ہواؤں کے اُڑن کھٹولے میں بیٹھ کر خوشبوئے پیراہنِ یوسف کی سواری بھی نہیں آتی۔

سواری نہیں آتی اور مجھے کہیں کا بھی راستہ نہیں ملتا۔ ''ناکجا آباد'' سے سفر پر نکلی تھی' راستے میں اسمِ اعظم میرے ذہن سے محو ہوا اور اب ''ناکجا آباد'' کا راستہ بھول چکی ہوں۔ قبیلے جب ہری بھری چراگاہوں سے منہ موڑتے ہیں اور اپنے خیموں سے انحراف کرتے ہیں تو اسمِ اعظم ان کے حافظے سے محو ہو جاتا ہے۔

میں اور تم ہم سب راستے سے بھٹکی ہوئی روحیں ہیں' دیوالی کے دیئے جلاؤ کہ آفتاب برجِ میزان میں آ پہنچا اور اب لکشمی دیوی اپنے بیٹے بل راج کو تحت الثریٰ سے آزاد کراتی

ہے۔ گھروں کی منڈیروں پر اور طاقوں اور دیواروں پر اتنے دیے جلاؤ کہ ہوائیں اور فضائیں روشن ہو جائیں اور ہم بھی بل راج کی طرح تحت الثریٰ کی قید سے نجات پائیں۔ پھر ہم دیوں کی روشنی میں اپنی روحوں کو دھوئیں گے' انہیں روشنی کی الگنی پر پھیلائیں گے اور پھر اپنی روشن روحوں کو پہن لیں گے۔ ہم اپنی روحوں کو اس طرح پہن لیں گے جس طرح پھول خوشبو کو پہنتا ہے' شمع روشنی کو پہنتی ہے اور دل عشق کو پہنتا ہے۔

دھوپ اب نہ ستونوں پر ہے اور نہ مٹی کے ذرّوں میں' اب صرف دھوپ کا سایہ ہے اور اس سائے کی روشنی میں پرندے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ ان پرندوں کے شور کے ساتھ میرے کانوں میں ایک بھاری بھرکم اور سرئیت آمیز آواز گونجتی ہے "تنکر چن چن محل بنایا' نا گھر تیرا نا گھر میرا' یہ ہے چڑیِن رین بسیرا" اور پھر چھنے کی آواز ان بولوں پر چھا جاتی ہے۔ یہ آواز اور اسی طرح کی دوسری بہت سی آوازیں جو زندگی کا رمز سمجھاتی تھیں' کھو گئی ہیں اور حافظے کا شہر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہیں۔

بے ڈھنگی آوازوں کا شور ہے۔ ملازموں نے کرسیاں گھسیٹنی شروع کر دی ہیں۔ میں اس اہتمام کو دیکھتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چبوترا ایک چھوٹا سا اسٹیج ہے۔ حکمرانوں کا دیا ہوا رات بہ نہ کھانے والوں کی اور سولیاں پانے والوں کی اولادیں اپنے اپنے مکالمے دہراتی ہوئی اسٹیج پر آتی ہیں۔ وقت اور تاریخ کے جبر نے انہیں جو کردار دیے ہیں' انہیں نہایت شکر گزاری اور فرمانبرداری کے ساتھ ادا کرتی ہیں۔

میں ان چہروں کو دیکھتی ہوں تو چیخ چیخ کر کہتی ہوں کہ اپنے مکانوں میں چھپ جاؤ' تمام دروازے کھڑکیاں اور روشن دان بند کر لو' پھر اپنے ناخنوں سے سرنگیں کھود و کہ فرمانبرداروں اور شکر گزاروں کے لئے پناہ کہیں نہیں ہے۔

دریائے جہلم کے کنارے پیپل کا ایک پیڑ سر اٹھائے جھومتا ہے۔ اس کی شاخوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ شکر گزاروں اور فرمانبرداروں میں سے نئے لوگ اٹھ رہے ہیں۔ یہ مستقبل کو پہنچیں گے اور قرمزی مسافتوں کو طے کریں گے۔ یہ اپنی اپنی راہ جائیں گے اور میں ناگ آباد کا راستہ ڈھونڈتی ہوں۔

○○

زیتون کی ایک شاخ

بوندیں چمپا کی خوشبو پر، کامنی کی رنگت پر اور مٹی کی پیاس پر برس رہی ہیں۔ کمرے کے اندر بھولے بسرے گیتوں کے بول ہیں۔ مینھ کی بوندیں اور گیتوں کے بول کھرنڈ جمے ہوئے زخموں پر برستے ہیں تو زخم جیسے کھل اٹھتے ہیں۔ بوندیں برس رہی ہیں اور زخموں کے گلاب کھلے ہوئے ہیں۔ ان گلابوں کی شاخوں پر ابھرے ہوئے نوکیلے کانٹے یاد کی انگلیوں میں چبھتے ہیں تو نہ کچھ سوچنے کو جی چاہتا ہے اور نہ کرنے کو۔ میں الجھ کر میز پر رکھا ہوا ''پاکستانی ادب'' کا ''امریکی ادب نمبر'' اٹھاتی ہوں اور اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہوں، میں صفحوں پر صفحے پلٹتی ہوں۔ پھر میری نگاہیں ایک صفحے پر رک جاتی ہیں۔

اور تب یاد کی انگلیاں وقت کی بند مٹھی میں پھڑپھڑاتے ہوئے لمحوں کو محسوس کرنا چاہتی ہیں جو موجود کی شاخ سے اڑے اور ناموجود کی طرف پرواز کر گئے۔ لمحوں کے یہ پرندے وقت کی بند مٹھی میں رہتے ہیں اور اب کبھی مائل بہ پرواز نہیں ہوتے، لیکن یاد کی انگلیاں ان کے وجود کی گرمی اور خوشبو اور ان کے بدن کی کپکپاہٹ کو محسوس کرنا چاہتی ہیں۔ یاد کے ہونٹ ان ناموجود پرندوں کے بدن پر اپنے ہونٹ رکھنا چاہتے ہیں۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا میں نے لکھتے لکھتے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تھا۔ شیشے کی بلندوبالا دیوار کے اُدھر مینہ کا جھالا برس رہا تھا اور بارش کے بہت سے قطرے اس شفاف دیوار پر اس طرح رکے ہوئے تھے جیسے وہ شیشے کی دیوار نہ ہو دیوارِ گریہ ہو۔

سامنے ذرا فاصلے پر بنے ہوئے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا سرسبز لان' پھولوں کے بوجھ سے لچکتے ہوئے پودے اور آتش رنگ کلیوں سے ڈھکے ہوئے پیڑ مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ تھا' لیکن پیاسی زمین اور مینہ کے وصال کی آنچ اور خوشبو کہیں نہیں تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اپنے گھر کے آنگن میں نہیں' امریکی قونصلیٹ کے اسنیک بار میں بیٹھی ہوئی تھی اور قونصلیٹ از فرش تا عرش ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ شیشے کی ان دیواروں کے پیچھے سے میں اڑتے ہوئے بادل' مینہ کے جھالے اور سڑک پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پانی کو دیکھ تو سکتی تھی لیکن محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ پیاسی مٹی کی سوندھی خوشبو کے اور میرے درمیان یہ شفاف دیواریں حائل تھیں۔

اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں شیشے کے ایک بلند و بالا محل میں مقید ہوں جہاں قدم قدم پر نیلی آنکھوں والے سفید دیو پہرا دیتے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی میں بے چین سی ہوگئی۔

ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ لے کر میں نے ایک بار پھر لکھنے میں مصروف ہونا چاہا' لیکن چند لمحوں میں مجھے احساس ہوگیا کہ خیال کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے اور ذہن میں پگھلتے ہوئے نت نئے سانچوں میں ڈھلتے ہوئے لفظ اچانک میری گرفت سے نکل گئے ہیں۔ میں نے بے بسی کے عالم میں اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی' کتنے خوش و خرم چہرے اور کیسے تر و تازہ بدن یہاں آباد تھے۔

برابر کی میز پر بیٹھے ہوئے لڑکوں نے کسی بات پر زور کا قہقہہ مارا اور ان ہی پر کیا منحصر تھا' اسنیک بار میں تو ہر طرف قہقہوں کی دھنک نکلی ہوئی تھی۔ کل رات ویت نام جانے والا امریکی بحری جہاز کراچی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا تھا اور صبح سے ہی قونصلیٹ کی راہداریوں میں بھانت بھانت کے امریکی لڑکے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ میرین یونیفارم میں تھے اور بعض امریکن آرمی کی وردی پہنے ہوئے تھے' بعض ایسے بھی تھے جو شوخ رنگ کی قمیصوں اور نکروں میں تھے۔ یہ سب لڑکے جن کی ابھی کھیلنے کھانے کی عمریں تھیں' اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ایسی جنگ لڑنے جا رہے تھے جو ان کی اپنی

جنگ نہ تھی۔

میں نے ان لڑکوں کے چہروں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ یہ ہنستے کھلکھلاتے چہرے نہ جانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتاریں گے اور ان میں سے نہ جانے کتنے خود بھی خاک وخون میں لپٹے ہوئے موت کی نیند سو جائیں گے۔ ایک لمحے کے لئے دکھ کا سایہ میرے ذہن کے افق پر لہرایا اور پھر گم ہوگیا۔

لیکن یہ سب کچھ ان کا انتخاب تھا' پھر اس انجام پر دکھ کیسا؟ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ انہیں انسانوں کے کسی گروہ کو کچلنے کا بھلا کیا حق پہنچتا ہے؟ میں نے سوچا اور میری نگاہوں میں وہ تمام تصویریں گھوم گئیں جو دوسرے تیسرے اخباروں اور رسالوں میں چھپتی تھیں۔ شمالی ویتنامیوں کی لاشوں پر قہقہہ لگاتے ہوئے امریکی فوجیوں' ماؤں سے بچھڑے ہوئے ننھے بچوں اور نیپام بموں سے جھلسے ہوئے چہروں کی تصویریں۔ انہیں دنوں برٹرینڈ رسل کی مشہور کتاب ''ویتنام میں جنگی جرائم'' شائع ہوئی تھی' میں نے اس کتاب کو کئی مرتبہ پڑھا تھا اور ہر مرتبہ میری آنکھیں اشکبار ہوئی تھیں' ہر مرتبہ میرے دل میں اس بوڑھے فلسفی کے لئے محبت کے اور عقیدت کے سوتے ابلے تھے۔ یہ شخص مجھ جیسے کمزور انسانوں کے لئے منارۂ نور کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ شخص جو مذہب' رنگ' نسل اور زبان کی تفریق سے بلند ہوکر سوچتا تھا۔ رسل کا خیال آتے ہی میری نظروں کے سامنے اس بدھ بھکشو کی تصویر گھوم گئی جس نے امریکی جارحیت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے آپ کو نذرِ آتش کرلیا تھا۔ زندگی دنیا کے تمام انسانوں کو کس قدر محبوب تھی' لیکن مہاتمابدھ کے اس ماننے والے نے دوسروں کے لئے جینے کا حق طلب کرتے ہوئے اپنی زندگی بھینٹ کر دی تھی۔ یہ مشہور اور یہ گمنام لوگ کتنے بڑے تھے' کیسے بلند وبالا تھے۔ اور یہ سب کچھ سوچتے ہوئے مجھے اپنے حال پر ہنسی آ گئی۔

کتنی عجیب سی بات ہے کہ امریکی قونصلیٹ میں ملازم ہوں' وائس آف امریکہ اردو سروس میں پروگرام پروڈیوسر اور اسکرپٹ رائٹر ہوں' دن رات پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد کے بارے میں فیچر لکھتی ہوں اور ان سب باتوں کے باوجود امریکیوں کی ہر بات سے

اختلاف کرتی ہوں' ان کے ہنستے ہوئے چہروں کو دیکھ کر میرے وجود میں جیسے زہر گھل جاتا ہے۔

میں نے پچھلے ایک برس میں امریکی امداد' امریکی عظمت اور امریکی نقطۂ نظر کے بارے میں نہ جانے کتنے اسکرپٹ لکھے تھے اور کیسے نہ لکھتی۔ حکومت امریکہ ان بے معنی اور بے روح باتوں کو دل نشیں انداز میں لکھنے کی منہ مانگی قیمت ادا کر رہی تھی۔ میں اکثر سوچتی کہ آئیڈیل' آدرش' خواب' یہ سب کتنے خوبصورت اور دل آویز لفظ ہیں' لیکن روپیہ جو کہ محض مایا ہے اور ہر عہد میں لعنت قرار دیا گیا ہے' وہی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ خواب پیسے کے بغیر نہیں خریدے جاسکتے۔ آدرش کی باتیں بھوکے پیٹ اور ننگے تن زیادہ دنوں نہیں چلتیں۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ اپنے تمام اسکرپٹ کسی امریکی افسر کے منہ پر مار کر بھاگ جاؤں اور پھر کبھی پلٹ کر اس شیش محل کا رخ نہ کروں' لیکن پھر مجھے خیال آتا کہ اپنے نقطۂ نظر کی خاطر مجھے ان لوگوں کو سزا دینے کا بھلا کیا حق پہنچتا ہے جن کا انحصار صرف میری ذات پر ہے اور جو بہت بے بس اور بہت مجبور ہیں۔ مجبوری اور بے بسی کا یہ کتنا عجیب دائرہ تھا جس کے گرد ہم سب بے تکان چکر کاٹ رہے تھے۔ لیکن جس سے باہر نکل جانا' جس سے فرار حاصل کرنا ہم میں سے کسی کے بس میں نہ تھا' لیکن نہیں' بات شاید صرف اتنی سی تھی کہ میں نے اپنی کمینگیوں کو چھپانے کے لئے دوسروں کا بہانہ ڈھونڈ لیا تھا' میں کس قدر کمزور' کتنی بے بضاعت اور کیسی حقیر تھی' میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

میں نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کو دیکھا جن میں کچھ سادے تھے اور کچھ میری تحریر سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ دراصل Saul Bellow ساؤل بیلو کی کہانی The Gonzaga Manuscript کی ریڈیائی تشکیل تھی جسے مجھ کو دوپہر تک مکمل کرنا تھا اور اسی لئے میں صبح ہی سے اسنیک بار میں چلی آئی تھی کہ یہاں بیٹھ کر کافی پیوں گی اور اسکرپٹ پر کام کروں گی لیکن اب خیال کی رو بھٹک کر نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئی تھی اور میں خالی الذہن ہوگئی تھی۔

امریکی لڑکے اپنی عادت کے مطابق زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور شور مچا رہے تھے "ابھی تو یہ آفت چار دن تک مسلط رہے گی۔" میں نے بیزاری سے سوچا۔ صبح میں جیسے ہی اسنیک بار میں داخل ہوئی تو مسز شیرازی نے باہر نکلتے ہوئے یہ مژدہ سنایا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں کیونکہ اس طرح جہاز پر موجود کچھ نئی اور غیر سنسر شدہ فلمیں قونصلیٹ میں کام کرنے والے دیکھ سکیں گے۔

میں نے آگے کی طرف جھک کر نیچے دیکھا۔ سفید ٹائلوں والے تالاب کے کنارے چھلکے پڑ رہے تھے اور ان پر برستے ہوئے مینہ کے قطروں سے جا بجا حباب بن رہے تھے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ موسم بہت دنوں بعد اتنا خوبصورت اور اس قدر ظالم ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں شہر کی سڑکوں پر بارش میں بھیگتی ہوئی چلتی رہوں۔ یہاں تک کہ سمندر کے کنارے جا پہنچوں اور وہاں اس بے چین اور بے قرار پانی کو دیکھوں جو نہ جانے کن شہروں اور ویرانوں کو چھوتا ہوا یہاں تک آتا ہے۔

"اکسکیوز می" کسی نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا ایک لمبا تڑنگا امریکی لڑکا ایک ہاتھ میں بیئر کاٹن اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلیوں سے بھرا گلاس تھامے کھڑا تھا۔

"دراصل یہاں اس نشست کے سوا کوئی اور خالی جگہ نہیں ہے۔" اس نے ذرا شرمندہ سے لہجے میں میز کے گرد پڑی ہوئی دوسری خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے کوفت سی ہوئی لیکن پھر خیال آیا کہ میں تو اب یہاں سے اٹھنے ہی والی ہوں پھر یہاں کوئی بھی بیٹھے مجھے کیا۔ میں نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات اور ساؤل بیلو کی کہانیوں کا مجموعہ سمیٹ کر ایک طرف کر دیا اور وہ لڑکا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"تم قونصلیٹ میں کام کرتی ہو؟" اس نے سنہرے رنگ کی بیئر شفاف گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"میں وائس آف امریکہ کی اردو سروس میں پروگرام پروڈیوسر ہوں۔"

"اچھا!" اس نے کچھ اس طرح سے کہا جیسے اسے یہ سن کر قدرے حیرت ہوئی ہو

میں نے اسے تیز نظروں سے دیکھا' وہ سمجھ گیا کہ میں نے اس کے لہجے کی حیرت کو پسند نہیں کیا۔ ''دراصل مجھے پاکستانی لڑکیوں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''ایشیا کے بارے میں امریکیوں کو واقعی کچھ زیادہ معلوم نہیں۔'' میری زبان سے بے اختیار ایک طنزیہ جملہ پھسل گیا جسے سن کر وہ خوش دلی سے مسکرایا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی چند لمحوں کے لئے مسکراہٹ میں چھپ گئی ہے۔

میں نے کاغذات اور کتاب سمیٹ کر اٹھنا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے کاغذات پر رکھ دیا۔ ''میرا مقصد تمہیں ڈسٹرب کرنا نہیں تھا۔ تم اپنا کام کرو۔''

''تمہارے یہاں بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنا اسکرپٹ اپنے کمرے میں بیٹھ کر لکھ لوں گی۔'' میں نے کہا۔

''اگر تم یوں اٹھ کر چلی جاؤ گی تو مجھے شرمندگی ہوگی' اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ میں تنہا ہوں اس لئے تمہارے دس پندرہ منٹ کے ساتھ کو غنیمت سمجھوں گا۔'' اس نے متانت سے کہا۔

''لیکن یہاں ہمارے اتنے بہت سے ساتھی موجود ہیں پھر تنہائی کا بھلا کیا سوال ہے۔'' میں نے ان لڑکوں کی طرف اشارہ کیا جو چند لمحے پہلے اندر داخل ہوئے تھے اور نشستیں خالی نہ ہونے کی وجہ سے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے کوک یا بیئر پی رہے تھے۔

''ان لڑکوں میں میرا جی نہیں لگتا۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور بیئر کا گلاس اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ نہ جانے کس قسم کا انسان تھا میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس کے سنہرے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ آنکھیں جھکائے بڑی سنجیدگی سے بیئر کے جھاگ کو دیکھ رہا تھا اور پھر میں اپنی خواہش کے برخلاف وہاں سے نہ اٹھ سکی کیونکہ میرے اندر ایک نامعلوم سا جذبۂ تجسس سر اٹھا رہا تھا۔ یہ لڑکا نوجوان تھا اور دنیا کی دولت مند ترین قوم کا ایک فرد تھا۔ اس کے سامنے شاندار مستقبل پھیلا ہوا تھا' لیکن وہ محض اپنے ملک کے سیاستدانوں اور صنعتکاروں کی ہوسِ زر کی تسکین کے

لئے ایک ایسی سرزمین کی طرف جا رہا تھا جہاں خون کا سمندر بہہ رہا تھا اور شاید اس کا گرم اور جوان خون بھی اس سمندر میں شامل ہونے والا تھا تو کیا یہ لڑکا واقعی اداس ہے؟

''میرا نام ایڈگر کوہن ہے۔'' اس نے بہت غیر متعلق سے انداز میں مجھے اپنا نام بتایا' میرا نام سن کر اس نے خالص امریکی لہجے میں اسے زیر لب دہرایا۔ ''خاصا مشکل نام ہے۔'' وہ آہستہ سے ہنسا' پھر اس کی نظر میری خالی پیالی کی طرف گئی۔ ''تمہاری کافی ختم ہوگئی ہے...... اب تم کیا پیو گی؟'' اس نے پوچھا اور پھر وہ میرے انکار کے باوجود کاؤنٹر سے کوکا کولا کا ڈبا اور برف کی ڈلیوں سے بھرا ہوا گلاس لے آیا۔

پھر یوں ہوا کہ اس صبح مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا ادراک ہوا کہ امریکی بھی انسان ہو سکتے ہیں اور وہ بھی ہماری طرح جنگ' محبت' بے وفائی اور موت کے دکھ اٹھاتے ہیں۔

ایڈگر نے مجھے بتایا کہ وہ کیلیفورنیا کا رہنے والا ہے۔ اس نے کیلیفورنیا یونیورسٹی برکلے سے ساؤتھ ایشین اسٹڈیز میں ایم ایس کیا ہے اور اب Drafting یعنی جبری بھرتی کے قانون کے تحت ویتنام جا رہا ہے۔ وہ بیئر کے گھونٹ بھرتا رہا اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ اس نے باتیں کرتے کرتے جیب سے والٹ نکالا' چمڑے کے اس پرس میں اس کی ماں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میں نے اس چھوٹی سی رنگین تصویر کو دیکھا۔ کھپریل کی چھت والے چھوٹے سے گھر کے سبزہ زار پر ایک بوڑھی امریکی عورت کھڑی تھی۔ اس کے بیشتر بال چاندی کے رنگ کے تھے اور چہرے پر دکھ اور تنہائی کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ ایک شفیق اور محبت کرنے والی ماں کا چہرہ تھا جس کے اکلوتے بیٹے کو محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ اس چہرے کی کوئی قومیت نہ تھی۔

''میرے ڈیڈی امریکن ایئر فورس میں تھے۔ جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو انہیں محاذ پر بھیج دیا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' مما ہر شام چرچ جا کر ان کے لئے جیزز کرائسٹ اور ہولی مدر سے دعائیں کرتی تھیں اور شمعیں جلاتی تھیں' لیکن ان کی دعائیں کسی کام نہ آئیں۔ ہاں' ایک دن ڈیڈ کے ختم ہونے کی خبر ضرور آ گئی۔ ان کے طیارے کو فضائی حملے

کے دوران شمالی کوریا کے کسی گنر نے مار گرایا تھا۔ ممّا کا سوگوار چہرہ مجھے آج تک نہیں بھولتا۔ پھر ممّا بوڑھی ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ ان کے سر کے بال سفید ہو گئے ...... وہ مجھ سے چھپ کر راتوں کو روتی تھیں۔ انہیں ڈیڈ سے بہت محبت تھی اور ان کی شادی کو اس وقت صرف چھ سال ہوئے تھے جب ڈیڈ کوریا بھیج دیئے گئے۔ ہم نے انہیں ڈیڑھ سال سے نہیں دیکھا تھا اور ہم نے تو ان کا آخری دیدار بھی نہیں کیا۔ ہم انہیں مہاگنی کے تابوت میں نہ لٹا سکے' ڈیڈ کا تابوت کسی بمبار طیارے کا ڈھانچہ بنا اور ان کی یونیفارم ان کا کفن۔ پھر جب میں بڑا ہوا تو ممّا نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کبھی فوج میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے جنگ سے' اور خون سے نفرت تھی۔ جنگ میرے ڈیڈ اور ہماری مسرتوں کو نگل گئی تھی۔'' اس کی آواز کانپ گئی۔

''تاریخ سے مجھے بہت دلچسپی ہے' تاریخ کی کتابیں مجھے بالکل کہانیوں کی طرح لگتی ہیں۔ پھر جب میں نے ایم ایس کیا تو میں کسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کے خواب دیکھتا تھا لیکن وہ خواب ہی کیا جو پورے ہو جائیں۔ اور اب مجھے خوابوں کی تعبیر یہ ملی ہے کہ میں کسی کالج میں تاریخ پڑھانے کے بجائے ویتنام جا رہا ہوں۔ وہاں لوگوں کو گولیوں کی زبان سکھاؤں گا۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی انگلیاں کاٹ کر پھینک دوں تاکہ میں کسی رائفل کی لبلبی دبانے کے قابل نہ رہوں۔ کبھی خودکشی کو جی چاہتا ہے' پھر مجھے ممّا کا خیال آتا ہے۔ میں نہیں رہا تو وہ مر جائیں گی یا پھر شاید روتے روتے اندھی ہو جائیں۔ میں جہاز کے عرشے پر کھڑا پہروں سمندر کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ سمندر میں کود جاؤں' لیکن پھر مجھے ممّا یاد آتیں' وہ میرے آنے سے پہلے بہت روئی تھیں۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اس کا گلاس خالی ہو گیا تھا اور بیئر کا ٹن بھی۔

وہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اپنے دکھوں کا مداوا پوچھ رہا ہو' جیسے اپنے زخموں کے لئے مرہم کا طلبگار ہو۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس سے کیا کہوں' اسے کس طرح دلاسا دوں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے یہاں بیٹھے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں نے اسنیک بار کی کیشیر مسز خان کی طرف دیکھا۔ وہ کیش رجسٹر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں اور

میری طرف دیکھ رہی تھیں، لیکن مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر انہوں نے فوراً نظریں چرا لیں۔ میں کچھ بے آرام سی ہو گئی۔

''میں نے اپنی Morbid باتوں میں تمہارا بہت وقت ضائع کیا حالانکہ تم کام کر رہی تھیں۔'' ایڈگر کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''تم نے قطعاً میرا وقت ضائع نہیں کیا اور نہ تمہاری باتیں Morbid تھیں۔ تمہارا احساس اور تمہاری تلخی بہت سچی ہے۔ اس وقت جب تم باتیں کر رہے تھے تو مجھے ڈیوڈ مچل بہت یاد آیا تھا۔ تم نے اس کا نام ضرور سنا ہوگا۔ اس نے ویت نام جانے اور فوجی خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ڈیوڈ زیادہ باہمت اور زیادہ بہادر ہے، اس نے نہ جانے کا فیصلہ کیا اور اب نہایت فخر سے اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ تم کھل کر انکار نہ کر سکے، شاید سماجی دباؤ کی وجہ سے لیکن کم سے کم یہ تو ہے کہ تم جنگ کو قابل نفرت جانتے ہو اور اس احساس کا عذاب سہہ رہے ہو۔ ورنہ بیشتر امریکی تو ابھی تک اپنی حکومت کے مؤقف کو درست سمجھتے ہیں۔ تم ڈیوڈ مچل نہیں ہو پھر بھی بہت قابل قدر ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ شاید وہ ڈیوڈ مچل کا نام سن کر شرمندہ ہو گیا تھا۔

''تم صحیح کہہ رہی ہو۔ میں جنگ سے نفرت کرتا تھا اس کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ویتنام جانے سے انکار کر دوں اور دوسروں کے استہزا اور تمسخر کا نشانہ بنوں اور سرکاری دباؤ برداشت کروں۔ میں بہت بزدل ہوں، محض خواب دیکھنے والا ایک ست الوجود انسان اور کچھ بھی نہیں۔'' اس نے بہت دل گرفتہ لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لئے مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس کے سامنے ڈیوڈ مچل کا نام کیوں لیا، اس کا ڈیوڈ سے موازنہ کیوں کیا۔

''میں نچلی منزل میں 129 میں بیٹھی ہوں۔ تم اگر چاہو تو گھنٹے بھر بعد وہاں آ جانا۔ میں اتنی دیر میں اپنا کام نمٹا لوں گی۔'' میں نے کہا اور اپنی چیزیں سنبھالتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اور پھر جب میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ساؤل بیلو کی کہانی کا اسکرپٹ مکمل کر

رہی تھی تو مجھے بار بار ایڈگر کا خیال آیا۔ میں ایڈگر جیسے ان بہت سے دوسرے نوجوانوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جنہیں جنگ سے نفرت تھی لیکن چونکہ وہ بزدل تھے اس لئے خاموشی سے سر جھکا کر میدان جنگ کی طرف چل دیئے تھے۔ جنگ پر جانا کس قدر ہولناک بات تھی' میری نگاہوں میں ایڈگر کا شاندار سراپا گھوم گیا۔ ہوسکتا ہے وہ کسی حریت پسند کی گولی کا نشانہ بن جائے یا کسی بارودی سرنگ پر پاؤں پڑتے ہی اس کے بدن کے چیتھڑے اڑ جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس طرح زخمی ہو کہ اس کا ہاتھ یا اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے۔ مجھے ایڈگر کی ماں کا خیال آیا۔ وہ کس قدر بدنصیب عورت تھی' اس کا شوہر جنگ کی بھینٹ چڑھا تھا اور اب اس کا بیٹا جنگ کے جہنم زار میں اترنے والا تھا۔ میں لرز کر رہ گئی۔ اس وقت نہ جانے وہ کیا کر رہی ہوگی۔ شاید ایڈگر کو خط لکھ رہی ہو یا اس کے لئے پل اوور بن رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت جو کام کر رہی ہوگی وہ ایڈگر ہی سے متعلق ہوگا۔ میری اماں بھی تو اپنے اس بیٹے کے لئے ہی جیتی تھیں جو ہزاروں میل دور جا کر بیٹھ رہا تھا اور سات سال سے پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماؤں کے دل شاید ایک ہی خمیر سے اٹھائے جاتے ہیں۔

وہ جب آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو میں اس کی طرف پشت کئے ایک ڈراما ایڈٹ کر رہی تھی۔ یہ اسٹیفن کرین کی مشہور کہانی The Red Badge of Courage کی ریڈیائی تشکیل تھا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''تم اپنا کام مکمل کرلو پھر باتیں کریں گے۔'' ایڈگر نے کہا اور میری ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ میز کے ساتھ رکھی ہوئی کیبنٹ پر میری چند ذاتی کتابیں بجی ہوئی تھیں۔ وہ ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور میں پھر ایڈیٹنگ مشین کی طرف متوجہ ہوگئی۔ پروگرام ایڈیٹنگ کی وجہ سے کمرے میں خاصا شور مچ رہا تھا۔ میں ٹیپ کو Rewind کرتے ہوئے مختلف ''ٹیک'' کاٹ کاٹ کر ڈسٹ بن میں پھینکتی چلی گئی۔ دس منٹ بعد تمام مکالمے تسلسل میں تھے اور اب مسئلہ صوتی اثرات کو شامل کرنے کا رہ گیا تھا اور یہ کام آفریدی صاحب اور ریکارڈنگ روم کے شیڈول پر منحصر تھا۔ میں نے ٹیپ لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور ایڈیٹنگ

مشین کا سوئچ بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری نظر اپنے کمرے کی کھڑکیوں سے باہر بھٹکی۔قونصلیٹ کے عقبی حصے کے سرسبز وشاداب لان پر ابھی تک ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور غضب کا سماں تھا۔

اس نے مجھے اٹھتے دیکھا تو میری ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر مقابل کی ایک کرسی میں دھنس گیا۔

''ایڈگر' تم کچھ پیو گے؟؟ میں نے پوچھا۔

''نہیں اب مزید پینے کی ہمت نہیں۔تمہارے آنے کے بعد سے اب تک میں بس پیتا ہی رہا ہوں۔یوں بھی بیئر کے مگ میں غم ڈبوئے نہیں جاسکتے۔اس لئے مزید پینا فضول ہے۔تم میرے لئے کھانے کو کچھ منگالو' مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''کیا کھاؤ گے؟'' میں نے ریسیور اٹھا کر اسنیک بار کا نمبر ڈائل کرنا چاہا۔

''اپنی پسند کی کوئی بھی پاکستانی ڈش منگالو۔''

''لیکن یہاں تو کوئی پاکستانی ڈش ملے گی نہیں۔''

''اچھا لیکن میں تو کوئی پاکستانی چیز کھانا چاہ رہا تھا۔'' ایڈگر نے قدرے مایوسی سے کہا۔میں اسے دیکھتی رہی پھر میں نے آہستہ سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔اس لمحے میرا جی چاہا کہ میں ایڈگر کے ساتھ کہیں باہر کھانا کھاؤں۔موسم کس قدر خوبصورت تھا اور محاذ جنگ پر جانے والا یہ لڑکا کس قدر تنہا' اداس اور مضمحل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں قونصلیٹ کی عمارت سے نکل کر پورٹیکو میں کھڑے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ عمارت سے باہر نکلتے ہی سوندھی مٹی کی خوشبو سے معطر ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔میں نے ایک گہری سانس لی' میں اس خوشبو کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی تھی۔

''تم یہیں پورٹیکو میں کھڑی رہو' میں آگے بڑھ کر ٹیکسی پکڑتا ہوں۔'' ایڈگر نے کہا۔

''نہیں مجھے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے۔ہم آگے بڑھ کر ٹیکسی پکڑ لیں گے''۔ میں نے کہا۔ مجھے بارش میں بھیگنا بہت پسند تھا لیکن اس وقت پورٹیکو میں نہ رکنے کی ایک

وجہ یہ بھی تھی کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہاں کھڑا دربان اور اس سے باتیں کرتا ہوا موٹر پول کا ڈرائیور اور شیشے کے دروازوں کے پیچھے سے جھانکتا ہوا کرچین ریسپشنسٹ مجھے ایڈگر کے ساتھ کسی ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھے۔ میں جانتی تھی کہ اسوقت بھی وہ لوگ ایک دوسرے کو بڑے معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرا رہے ہوں گے۔

میں ایڈگر کے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی بادلوں سے ڈھکے آسمان تلے آ گئی۔ سڑک پر دونوں جانب پانی جمع ہوگیا تھا اور ہم دونوں گندے پانی سے بچ بچ کر فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ ہمارا رخ ہوٹل میٹروپول کی طرف تھا۔ پھر چند ہی لمحوں بعد سامنے سے ایک خالی ٹیکسی گزری تو ایڈگر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ''کولمبس'' کا نام لیا۔ ''کولمبس'' دور افتادہ تھا اور بہت کم لوگ وہاں جاتے تھے۔

ہم جب ''کولمبس'' کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو میری توقع کے عین مطابق ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔ ایک دور افتادہ گوشے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور بس' میں نے کونے کی ایک میز منتخب کی جہاں سے ہم شیشے کی بڑی کھڑکیوں سے باہر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں ایڈگر کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ مجھے ایک چھوٹا سا بچہ لگا جس کی کوئی خواہش پوری نہ ہوئی ہو اور وہ اداس بیٹھا ہو۔

''ایڈگر'' میں نے آہستگی سے اس کا نام لیا' وہ چونک گیا۔'' مجھے اپنے بارے میں بتاؤ' اپنی مما کے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اتنی بہت سی باتیں بتانے کے لئے ہیں' ویسے تم بہت اچھی سامع ہو' بولتی کم اور سنتی زیادہ ہو۔ تم جیسے لوگ بڑے اچھے دوست ہوتے ہیں۔'' اس نے کہا ''میں دیر سے سوچ رہا ہوں کہ کاش تم مجھے کیلیفورنیا میں ملی ہوتیں' ہم اچھے دوستوں کی طرح ساتھ رہتے پھر میں ویک اینڈ پر تمہیں مما کے پاس لے جاتا۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوتیں۔'' وہ خوابناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔

وہ محاذ پر جانے والوں کی مخصوص نفسی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی شناسائی کو دوستی' محبت اور نہ جانے کیا کیا فرض کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جنگِ عظیم پر لکھے جانے والے کئی ناول اور ان کے کردار یاد آئے۔ شاید موت کا سامنا کرنے والوں کو ایسے سہارے بھی بہت ہوتے ہیں۔ ''بچوں کی طرح جاگتے میں' خواب نہ دیکھو' اگر محاذ پر بھی اسی طرح خواب دیکھتے رہے تو یہ خواب تمہاری جان لے کر ٹلیں گے۔'' میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

''میں خواب نہیں دیکھ رہا' صرف خواہش کر رہا ہوں۔ محاذ پر جانے والے کم از کم آرزو کا حق تو رکھتے ہیں۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں خاموشی سے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس جملے کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر اس نے گفتگو شروع کر دی۔ ''تم مجھے یہی الزام دو گی کہ میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں' لیکن یقین کرو اگر تم مجھے وہاں مل جاتیں تو میں تمہیں اپنے گھر لے جاتا اور اپنی لائبریری دکھاتا۔ تمہیں یقیناً کتابوں سے خاصی دلچسپی ہے۔ میں نے ابھی تمہارے کمرے میں کئی بہت اچھی کتابیں دیکھی ہیں۔ میری ذاتی لائبریری میں تاریخ کے علاوہ لٹریچر کی بہت سی کتابیں ہیں۔ دراصل میں تاریخ اور ادب کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کرسکتا۔ یونان کی تاریخ کی بہت سی الجھنیں' یونانی ادب پڑھے بغیر سمجھ میں نہیں آتیں۔ اسی طرح اگر ہمیں لوئی چہاردہم کا عہد سمجھنا ہے تو اس کے لئے ادب کی عینک لگانی پڑتی ہے۔ اگر ہم انقلابِ فرانس کی راہ ہموار کرنے کے لئے اسباب تلاش کریں تو مادام ژفریں اور ان کے سالون' اور وہاں جمع ہونے والے جید ادیبوں اور فنکاروں کے ذکر سے فرار ممکن نہیں' چھوڑو' ہٹاؤ ان باتوں کو۔ میں بھی بھلا کیا باتیں لے بیٹھا۔'' اس نے نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''تم قطعاً بے کار باتیں نہیں کر رہے۔ مجھے تمہارے نقطہ نظر سے اتفاق ہے۔ تم نے جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایم اے کیا ہے۔ اس لئے تم نے ہماری تاریخ تو یقیناً پڑھی ہوگی؟''

میں نے پوچھا۔

''تمہاری تاریخ؟ یعنی پاکستان کی تاریخ؟''

''میرا مطلب ہے کہ برصغیر ہندو پاک کی تاریخ'' میں نے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا اگلا جملہ کیا ہوگا۔ ہر امریکی اس موضوع پر بات کرتے ہوئے یہی کہتا تھا اور امریکیوں پر ہی کیا منحصر تھا' اس بارے میں تمام غیر ملکی ایک طرح سے سوچتے تھے۔

''ہاں برصغیر کی تاریخ ہمارے نصاب میں تھی' لیکن واقعی تم لوگوں کا جواب نہیں ہے۔ پاکستان میں رہتے ہو اور پورے برصغیر کی تاریخ کو اپنی تاریخ کہتے ہو۔ لاکھوں انسانوں کے خون سے تم نے اپنے ملک کی سرحدیں کھینچی ہیں۔ تمہارا سرحد پار کی تاریخ سے بھلا کیا تعلق؟'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔

''مجھے معلوم ہے۔ تم سب ہمارا مذاق اڑاتے ہو اور تم بھی اپنی جگہ صحیح کہتے ہو۔ ہم نے ایک ملک کو تقسیم تو کر دیا لیکن اپنا ماضی کاٹ کر نہ پھینک سکے۔ ہماری کتنی ہی چیزیں وہیں رہ گئیں کیونکہ وہ دھرتی کا حصہ تھیں۔

''تاج محل جس پر تم امریکی جان دیتے ہو' وہ ہم نے بنایا۔ غالب جس کی شاعرانہ عظمت کے ڈنکے ان دنوں انگلستان میں پٹتے ہیں وہ ہمارا تھا۔ ہم میں سے تھا۔ اشوک کے کتبے اور نالندہ کے کھنڈرات جتنے ان کے تھے' اتنے ہی ہمارے بھی تھے۔ سب کچھ ہمارا اور ان کا مشترک سرمایہ تھا۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی' تم نے ہماری صرف تاریخ پڑھی ہے' ہمارا ادب نہیں پڑھا۔ تم کچھ نہیں جانتے' ہمیں سمجھنا چاہتے ہو تو ہمارا ادب پڑھو۔ میں اب تک جتنے غیر ملکیوں سے ملی ہوں' وہ سب اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اس میں تم لوگوں کا قصور نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تم ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے ہو اور ہم تڑپ اٹھتے ہیں۔ تمہارے نام کے ساتھ کوہن لگا ہے۔ تم یہودی ہو اور تم نے سینکڑوں برس ہجرت کا عذاب سہا ہے لیکن کیسی دلچسپ بات ہے کہ تم ان فلسطینیوں کا دکھ نہیں سمجھتے جنہیں اپنے گھروں سے نکلنا پڑا اور تم ہمارے عذاب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہم کہ پہلے برٹش انڈیا کی قومیت رکھتے تھے اور اب پاکستان میں مہاجر ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی

بھیڑیں ہیں۔ تمہیں یرمیاہ جیسا نوحہ گر ملا تھا۔ لیکن ہمیں تو کوئی یرمیاہ بھی میسر نہیں آیا۔"
میں نے الجھ کر باہر دیکھا...... میری طبیعت گھبرانے لگی تھی۔ موسم کا حسن نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

"تاریخ دراصل بہت الجھا ہوا معاملہ ہے' اس کی بات کرنے بیٹھو تو گفتگو ہمیشہ غلط رنگ اختیار کر لیتی ہے۔" ایڈگر نے نیپکن سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں اب گھر جاؤں گی۔"

"کل تم سے ملاقات ہو سکے گی یا نہیں؟" ایڈگر نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہیں ایک بجے کے بعد اپنے کمرے میں ملوں گی۔ کل صبح مجھے ایک ڈراما ریکارڈ کرانا ہے۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر طے ہو گیا۔ ہم دونوں کل دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے اور اس کے بعد بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" ایڈگر نے خوش ہو کر کہا۔ عجیب لڑکا تھا' چند گھنٹوں کی ملاقات میں اس طرح گھل مل گیا تھا جیسے برسوں کا شناسا ہو۔ اور اب کتنے آرام سے کل دوپہر کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ کوئی بہانہ کر دوں' لیکن یہ لڑکا جو گھر سے اتنی دور تھا اور شدید تنہائی کا شکار تھا' اسے مایوس کرنا میرے لئے ممکن نہ ہو سکا۔

"ایڈگر اب چلنا چاہئے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ باہر بارش تھم گئی تھی اور بادل چھٹتے جا رہے تھے۔

ہم دونوں "کولمبس" سے نکل کر باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ "میں تمہیں قونصلیٹ کے قریب اتاروں گی۔" میں نے کہا اور وہ سر ہلا کر میرے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے قونصلیٹ کے برابر ٹیکسی رکوائی تو وہ "کل ملیں گے" کہہ کر اتر گیا۔ ٹیکسی آگے بڑھی تو میں نے پلٹ کر دیکھا' اس نے مجھے پلٹتے دیکھا تو ہاتھ ہلانے لگا' میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا' ٹیکسی مڑی اور پھر وہ میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

اس رات میں نے عجیب خواب دیکھے۔

دھان کے کھیتوں میں بچے بھاگ رہے تھے۔ یہ کھیت سرخ پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور بھاگتے ہوئے بچوں کے حلقہ چشم خالی تھے اور ان کے ہاتھ نہ تھے۔

وہ بچے تھے اور کھیتوں میں اپنی کھوئی ہوئی چیزیں ڈھونڈ رہے تھے۔ اپنے ہاتھ' اپنی آنکھیں اور تب بچوں کے اس ہجوم کے درمیان ایک فاختہ آسمان سے زمین کی طرف گری۔ اس کی چونچ میں زیتون کی ایک شاخ تھی اور اس شاخ پر پتے کی جگہ امریکی پرچم تھا۔ پرچم پر کیچڑ کے دھبے تھے اور اس پر نیلے ستارے چمک رہے تھے۔ دست بریدہ اور آنکھوں سے بچے ان نیلے ستاروں کی طرف لپکے' ان میں سے ہر بچہ دوسرے بچے سے پوچھتا تھا ''تمہاری ماں کہاں ہے' ہر جگہ بس آگ اور دھواں ہے۔'' پھر بہت سی آوازوں نے بچوں کی آوازوں کے ساتھ آواز ملائی' دھواں ہے' دھوں ہے۔ ہر طرف ان الفاظ کی بازگشت تھی۔ چوک میں الاؤ کی طرح جلتے ہوئے بھکشوؤں کے بدن سے دھواں بل کھاتا اٹھ رہا تھا اور آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ دھوئیں کے اس منارے پر ایڈگر کھڑا تھا۔ اپنی ہتھیلی پر اپنا سر اٹھائے' پھر وہ بھاگنے لگا۔ جلتے ہوئے تیر اس کے تعاقب میں تھے۔ اس نے ٹھوکر کھائی اور اس کا سر لڑھکتا ہوا دھان کے ایک کھیت میں جا گرا۔ اس کا سنہرے بالوں والا سر دھان کے کھیت میں کھڑے سرخ پانی پر تیر رہا تھا۔ کھلی آنکھوں میں خوبصورت دنوں کے خواب تھے اور ان خوابوں پر سوگ کی سیاہ چادر تھی۔

پھر مجھے پوسیڈون کا جواں سال بیٹا ایلی روتھیس نظر آیا۔ وہ ہاتھوں میں ایک طلائی کلہاڑی لئے ہوئے زیتون کے اس سرسبز درخت کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس کے باپ کی شکست کا نشان بن کر زمین سے پھوٹا تھا۔ ایلی روتھیس نے کلہاڑی اٹھائی اور زیتون کے اس درخت پر وار کیا لیکن اس کا وار خالی گیا اور اس کی دھاردار کلہاڑی خود اس کے اپنے پیروں پر آ کر لگی۔ وہ قدرآور نوجوان پابریدہ ہو کر زمین پر آ گرا اور آن کی آن میں ختم ہو گیا۔ تب اچانک اس نوجوان کا چہرہ لہریں لینے لگا۔ یوں جیسے ساکن پانی میں کنکر پھینکا جائے تو پانی دائرے بنانے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد جب ایلی روتھیس کا چہرہ ساکت ہوا تو

میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

وہ ایڈگر کا چہرہ تھا۔ وہ ایڈگر کا پابریدہ اور خوں آلود بدن تھا۔ خون زیتون کے درخت کو سیراب کر رہا تھا اور طلائی کلہاڑی پر لہو کے دھبے تھے۔

میری آنکھ کھلی تو میرا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا آسمان پر پو پھٹ رہی تھی۔

....

دوسرے دن ڈیڑھ بجے کے قریب جب میں ریکارڈنگ روم سے اپنے کمرے کی طرف آئی تو ایڈگر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں صبح سے کام میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ مجھے اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا لیکن اب ایڈگر کو دیکھ کر مجھے نامعلوم سی خوشی ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی مجھے رات کے ڈراؤنے خواب یاد آ گئے۔

''جانتی ہو آج کی سب سے اچھی خبر کیا ہے'' ایڈگر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بھئی۔ مجھے تو آج صبح سے اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

''کل شام جب میں یہاں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ انفارمیشن کا ایک ٹرینی کیلیفورنیا میں میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ میں نے آج کے لئے اس کی گاڑی لے لی ہے۔ دوسری اچھی خبر یہ ہے کہ پیلس میں A Farewell to Arms چل رہی ہے۔ میں نے اس کی بکنگ کرالی ہے۔ کھانے سے نمٹ کر گھومیں گے پھر فرسٹ شو دیکھیں گے۔'' غرض یہ کہ اس لڑکے سے نجات کی صورت نہیں ہے، میں نے سوچا۔ ''تم نے بلاوجہ فلم کی بکنگ کرالی، اب مجھے اپنے گھر فون کرنا پڑے گا''۔ میں نے کہا:

''ہاں فوراً فون کر دو اور اپنے گھر والوں سے لمبی چھٹی لے لو۔'' اس نے کہا۔

''تمہارا شاید دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ پاکستان ہے امریکہ نہیں کہ آدھی رات تک میں تمہارے ساتھ گھومتی رہوں۔'' میں نے ذرا جھنجلا کر کہا:

''میں تو اب بس دو دن کا مہمان ہوں۔ میرے لئے تم اپنے اصول نہیں توڑ سکتیں؟''

''یہ اصول کی بات نہیں'' میں نے کہا۔ وہ اپنے آپ کو یوں مہمان کہہ رہا تھا جیسے میں

نے اسے تار بھیج کر بلوایا ہو۔ پھر اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اس پر رحم سا آ گیا۔ وہ منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ میں نے ٹیلیفون اپنی طرف گھسیٹا اور گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک بار پھر ''کولمبس'' میں بیٹھے تھے۔ ''تم نے اے فیرویل ٹو آرمز'' آج سے پہلے دیکھی ہے یا نہیں؟'' کھانے کے بعد ایڈگر نے کوکا کولا کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

''میں اس فلم کو کئی برس پہلے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں آخر میں بہت روئی تھی۔ کیتھرین کی موت کے بعد فریڈرک جب بارش میں بھیگتا ہوا واپس ہوتا ہے تو اس کی بے بسی اور اس کا بے پایاں الم دل کے ٹکڑے کر دیتا ہے''۔ میں نے یادوں کو کریدتے ہوئے کہا۔

''یہ میری بہت پسندیدہ فلموں میں سے ایک ہے۔ محض اتفاق ہے کہ آجکل یہ فلم یہاں چل رہی ہے۔ میں نے اس کا پوسٹر دیکھا تو سوچا کہ محاذ پر جانے والا ایک انسان تمہیں اس کے علاوہ بھلا اور کون سی فلم دکھا سکتا ہے۔ شاید اسی طرح تمہیں میری تنہائی اور اذیت کا احساس ہو سکے۔''

''اس کی ضرورت نہ تھی' مجھے تمہاری کیفیات کا اچھی طرح اندازہ ہے' ورنہ میں یہاں تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی نہ ہوتی۔'' میں نے کہا۔

ہم ''کولمبس'' میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ایڈگر بہت اچھی باتیں کرتا تھا۔ دھیمے لہجے میں بہت اچھی باتیں۔ اسے تاریخ سے عشق تھا' وہ دیر تک انقلابِ فرانس کی باتیں کرتا رہا۔

''اگر میں ویتنام سے گھر واپس پہنچ گیا تو ہندوستان کا سفر ضرور کروں گا اور فتح پور سیکری جاؤں گا اور سکندرہ بھی۔ مجھے اکبر اعظم کا مدفن دیکھنے کی حسرت ہے۔ تصویروں سے تو مجھے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا مدفن اس کے شایانِ شان نہیں۔'' اس نے باتوں کے دوران کہا۔ اس شام ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ پھر ہم نے فلم دیکھی۔ ہم فلم دیکھ کر نکلے تو اس کا حزن ہم دونوں پر طاری تھا۔

☆

وہ کراچی میں ایڈگر کا تیسرا دن تھا۔ اس دن میں قونصلیٹ نہ گئی۔ وہ تمام دن میں نے سوتے جاگتے گزارا۔ سوتے میں خواب اور جاگتے میں حقیقتیں۔ دن میں کئی مرتبہ ایڈگر کا فون آیا لیکن میں نے گھر میں سب سے کہہ دیا تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے دفتر سے کسی کا فون آئے تو یہ نہ بتایا جائے کہ میں گھر پر موجود ہوں۔

وہ شام میں نے کلاسیکی موسیقی سنتے اور ''سد عارت'' پڑھتے گزاری۔

☆

چوتھا دن رخصت کا دن تھا۔

ایڈگر دس بجے کے قریب میرے کمرے میں آیا۔ اس وقت وہ یونیفارم میں تھا۔ اسے یونیفارم میں دیکھ کر مجھے عجیب سی تکلیف ہوئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا اور کرسی کھینچ کر میرے مقابل بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کل میرے دفتر نہ آنے کی شکایت کرے گا۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا بس خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا ''میرے جانے کا وقت آ پہنچا' میں تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔''

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس سے کیا کہوں' وہ امام ضامن کی اصطلاح سے ناواقف تھا' ورنہ میں اس سے کہتی کہ جاؤ میں نے تمہیں امام کی ضامنی میں دیا۔ اس لمحے میری نگاہوں کے سامنے جھلسی ہوئی لاشوں اور روتے ہوئے بچوں اور نابینا عورتوں کی تصویریں گھوم گئیں۔ اور اب ایڈگر ایسی ہی تصویروں کی تعداد میں اضافے کے لئے جا رہا تھا۔ پھر میں بھلا اسے امام کی ضامنی میں بھلا کیسے دے سکتی تھی' لیکن میں دعا کے بغیر بھی کس طرح رخصت کرتی۔ جنہیں آپ دوست جانیں ان کی زندگی کے لئے دعا تو بلا ساختہ نکلتی ہے۔ اور تب اس لمحے میں نے جانا کہ انسان کیسے عذاب میں مبتلا ہے اور نا کردہ گناہوں کی سزا پاتا ہے اور اس سزا اور عذاب کا خاتمہ نہیں ہے۔

میں اس کے ساتھ پورٹیکو تک آئی۔ ''میں تمہارا کرم زندگی بھر نہیں بھولوں گا''۔ اس نے پہلی اور آخری مرتبہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور

لپک کر سیاہ رنگ کی لیموزین میں جا بیٹھا جس میں اس کے کئی ساتھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کار روانہ ہوئی تو اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر فوراً ہی منہ پھیر لیا۔

....

بوندیں چمپا کی خوشبو پڑ کامنی کی رنگت پر اور مٹی کی پیاس پر برس رہی ہیں۔ کمرے کے اندر بھولے بسرے گیتوں کے بول ہیں۔ مینہ کی بوندیں اور گیتوں کے بول کھرنڈ جمے ہوئے زخموں پر برستے ہیں تو زخم جیسے کھل اٹھتے ہیں۔

بوندیں برس رہی ہیں اور زخموں کے گلاب کھلے ہیں۔ ان گلابوں کی شاخوں پر ابھرے ہوئے نوکیلے کانٹے یاد کی انگلیوں میں چبھتے ہیں تو نہ کچھ سوچنے کو جی چاہتا ہے اور نہ کچھ کرنے کو۔ میں الجھ کر میز پر رکھا ہوا ''پاکستانی ادب'' کا ''امریکی ادب نمبر'' اٹھاتی ہوں اور اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہوں۔ میں صفحوں پر صفحے پلٹتی ہوں پھر میری نگاہیں ایک صفحے پر رک جاتی ہیں۔ یہ ایک بارہ سالہ امریکی بچی باربرا ہاؤڈلرا کی نظم کا ترجمہ ہے۔

وہ...... وہ ایک لشکارا
روپہلا اور سنہری
روپہلا اور سنہری
روپہلے پرندے اڑتے ہیں
سنہرا پانی برستا ہے
دھان لہر کی تال
نئے پانی کے ساتھ بھڑک کر جھلس جاتے ہیں۔

میری نگاہیں اس نظم کی ایک ایک سطر کو میکانکی انداز میں پڑھتی چلی جاتی ہیں، پھر میں آخری سطروں تک پہنچتی ہوں۔

سن امریکہ، سن دھیان سے
ہائی پھونگ سے اٹھتی بچوں کی چیخیں
لمبی اور صاف سنائی دیتی ہیں یہ چیخیں

اور میری آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ اُبھرتا ہے' میری آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں۔ ایڈگر اس نظم کو پڑھتا تو پھڑک اٹھتا لیکن اس نے یہ نظم نہیں پڑھی۔ یہ نظم 69 میں امریکہ کے ایک گمنام اور نہایت کم تعداد میں شائع ہونے والے رسالے میں چھپی تھی اور پھر وہ پرچا بحقِ سرکار ضبط ہو گیا تھا۔

''ایڈگر' کاش تم نے یہ نظم پڑھی ہوتی'' میں خواہش کرتی ہوں۔

میری میز کی نچلی دراز میں دوسرے اور بہت سے خطوط کے ساتھ چند ایئر لیٹر بھی ہیں جو ایڈگر نے مجھے جنوبی ویت نام سے بھیجے تھے' اور انہی خطوط کے ساتھ ایک امریکی ایئر لیٹر ہے جو آج سے سات برس پہلے میرے نام آیا تھا۔ میں نے اس خط کو بار بار پڑھا ہے' ایک بار پھر اسے پڑھنے کی خواہش میرا سینہ کھرچنے لگتی ہے۔ میں اٹھ کر اپنی میز کی دراز کھولتی ہوں اور امریکہ سے آنے والا ایئر لیٹر نکال کر پڑھتی ہوں۔

میری بچی!

تم مجھے نہیں جانتیں لیکن میں اپنے بیٹے کے خطوط میں تمہارا ذکر بار بار پڑھ چکی ہوں۔ تم نے تنہائی کے چند عذاب ناک دنوں میں اس کا دکھ بٹایا تھا اور تمہارے خطوں سے اسے تسکین ہوتی تھی۔ وہ اپنے ہر خط میں تمہیں نہایت محبت اور احترام کے ساتھ یاد کرتا رہا۔

میں تمہیں یہ خط اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میرا بیٹا اور تمہارا دوست آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہائی پھونگ میں ختم ہوا۔ ایڈگر کی خواہش تھی کہ اگر وہ محاذ پر کام آ جائے تو تمہیں اس کے انجام کی اطلاع دے دی جائے۔

والدہ ایڈگر

میں اس خط کو جسے گذشتہ سات برس میں نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھ چکی ہوں' بار برا ہائیڈلرا کی نظم کے درمیان رکھ دیتی ہوں۔

○○

صرصرِ بے اماں کے ساتھ

ریت کا فرش ہمارے دائیں اور بائیں جانب بچھا ہے اور اس کے درمیان ناہموار سڑک پر سید انیس شاہ جیلانی کی نئی ٹویوٹا کرولا ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی ہے۔

میں سوچتی ہوں کہ وقت فرشِ مشجر کی مانند پھیلا ہوا ہے اور ہم اس پر سفر کرتے ہیں' پھر ہمیں فنا کے طاق پر رکھ دیا جاتا ہے لیکن وقت سفر نہیں کرتا' وقت بوڑھا نہیں ہوتا' وقت کو موت نہیں آتی۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوں' جا بجا ریت کے ٹیلے سورج کی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ گھوڑوں پر سوار چند نوجوان ریت اڑاتے ہوئے ہمارے پہلو سے گزر گئے ہیں۔ کار میں لگے ہوئے ریکارڈر پر خان صاحب عبدالکریم خان بھیرویں الاپ رہے ہیں۔ جمنا کے تیر' گوکل ڈھونڈی' بندرا بن ڈھونڈی' جمنا کے تیر۔ اس آواز کی اداسی میرے وجود پر سایہ کر رہی ہے۔ لہروں کے شور میں اسی آواز کی بازگشت ہے اور ہوا کی سنسناہٹ انہی الفاظ کو دہراتی ہے۔ گوکل ڈھونڈی' بندرا بن ڈھونڈی' جمنا کے تیر۔

میری نظر زرد رنگ کی ایک کار پر پڑتی ہے جو ریت میں پھنسی ہوئی ہے۔ کئی نوجوان چہلیں کرتے ہوئے پہیوں کے آس پاس سے ریت ہٹا رہے ہیں۔ ہماری گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ میں گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھتی ہوں۔ ارد گرد کام کرتے ہوئے چند مزدور انہیں ہاتھوں سے ریت ہٹاتے دیکھ کر اپنے پھاوڑے لیے آ گئے ہیں اور تیزی سے

ریت ہٹانے لگے ہیں۔

کوئی سخت چیز میرے پہلو میں چبھتی ہے۔ میں اسے ہٹانا چاہتی ہوں تو میرے ہاتھ کسی کتاب سے الجھتے ہیں، میں اسے اٹھاتی ہوں۔ یہ گہری سبز جلد کی ایک ضخیم بیاض ہے۔ پہلے صفحے پر انیس شاہ کی موتیوں جیسی جلی اور دلکش تحریر میں ان کا پورا نام لکھا ہے اور اس کے نیچے 'حیرت شملوی اکادمی' اور 'محمد آباد۔ رحیم یار خاں' کا نام تحریر ہے۔ میں صفحے پلٹتی ہوں نامور لوگوں کے لکھے ہوئے حروف، یہ مولانا غلام رسول مہر کی اور یہ رئیس احمد جعفری کی تحریر ہے، اس صفحے پر جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ یہ احسان دانش کی نگارش ہے۔ ورق پر ورق الٹتے چلے جاتے ہیں اور ناموں پر نام گزر رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کی تحریریں جن سے اس شخص کی دوستی اور جن سے محبت کی اس نے بہت قیمت دی ہے۔

مجھے انیس شاہ کے ذاتی کتب خانے 'مبارک لائبریری' کی نادر کتابوں، مخطوطوں اور ادیبوں اور شاعروں کے بے شمار مکتوبات کا خیال آ رہا ہے۔ یہ شخص جو کاتبِ تقدیر سے اپنے نصیب میں 'جاگیرداری' لکھوا کر لایا تھا اور مزاج شاعرانہ اور دانش ورانہ پایا تھا، یہ اپنے ماحول میں کس قدر تنہا اور کتنا بے آرام ہوگا۔

انیس شاہ کی ذات میں مجھے ہر لحہ ایک پشتینی جاگیردار اور گمنام ادیب کے دو وجودوں کی کشمکش نظر آئی ہے۔ ان کی ادب دوستی اور علم نوازی نے ان کی جاگیر کو ٹھپ کیا اور ان کی جاگیرداری نے ان کے اندر کے ادیب کو بے دعویٰ رکھا۔ ہر لحہ ادب کے مسائل میں گم اور ہر ساعت اچھی کتابوں اور نادر مخطوطوں کی تلاش میں سرگرداں۔ اس شخص کی زندگی کے تضاد، اس کی زخمی روح اور بے چین ذہن نے مجھے ہمیشہ بہت ملول کیا ہے۔

میں بیاض بند کر کے اپنے دائیں جانب دیکھتی ہوں جہاں ایک خاصا بڑا بحری جہاز سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اب ہم اس سے خاصے قریب ہو گئے ہیں۔ جہاز کی پیشانی پر لکھا ہوا نام Two Rivers صاف پڑھا جا رہا ہے۔ نام کے نیچے شرقِ اوسط کے جگمگاتے ہوئے شہر بیروت کا نام ہے۔

میں اس جہاز کو دیکھنے لگتی ہوں جو نہ جانے کس طرح بھٹک کر اس سمت آ نکلا،

پھر طوفانی لہروں نے اسے خشکی پر لا پھینکا اور اب یہ کئی ماہ سے ریت میں دھنسا کھڑا ہے۔ ان دنوں شہر والوں نے اس کی زیارت کو ایک مشغلہ بنا لیا ہے۔ چاند کی چڑھتی تاریخوں میں اس کے پہلو پانی میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن ان دنوں چاند کی آخری تاریخیں ہیں' سمندر تھکا ہوا ہے اور دور دور تک پھیلی ہوئی ریت کے لب خشک ہیں۔ انیس شاہ گاڑی کو ریتیلی ڈھلان کی طرف لے جا رہے ہیں۔

''ارے بھئی گاڑی کہیں پھنس نہ جائے'' میں پریشان ہو کر کہتی ہوں۔

انیس شاہ اپنی گھنی مونچھوں کے سائے میں مسکراتے ہیں اور گاڑی آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی ریت پر جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں اور بہت سی کاریں اور اسکوٹریں کھڑی ہیں' لوگ گاڑیوں سے اتر کر ٹہل رہے ہیں۔ کچھ لوگ کیمرے لائے ہیں اور ''کلک'' کی آواز کے ساتھ جہاز کے پس منظر میں دوستوں اور عزیزوں کے عکس محفوظ کر رہے ہیں۔ فانی انسان نے اپنے وجود کو آئندہ زمانوں تک محفوظ کرنے کے لیے بہت سے طریقے اختیار کئے ہیں۔ یہ سب لوگ چند برس میں ختم ہو جائیں گے لیکن اپنے بعد موجود رہنے کی خواہش تصویروں کی شکل میں باقی رہے گی۔

میں ذہن میں کنکھجوروں کی طرح رینگتے ہوئے خیالات کو جھٹک کر نیچے اترتی ہوں۔ انیس شاہ تیز تیز چلتے ہوئے جاتے ہیں اور جہاز کے زنگ آلود پہلو کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ محمد شاہ جہاز سے زیادہ جہاز کو دیکھنے والی لڑکیوں کے جائزے میں مصروف ہے اور انیس شاہ کے یار جانی اچھو میاں کو جہاز سے کوئی دلچسپی نہیں' وہ اور سومرو بے تعلقی سے ریت پر ٹہل رہے ہیں' سومرو اور اچھو میاں کے درمیان سرائیکی میں کوئی بحث ہو رہی ہے۔

جہاز کی ریلنگ سے ٹکے ہوئے کئی لوگ ہمارا تماشا دیکھ رہے ہیں' بالکل اسی طرح جیسے ہم اس جہاز کو تماشا سمجھ کر دیکھنے آئے ہیں۔ یہ عملے کے لوگ ہیں جو ہمہ وقت جہاز پر رہتے ہیں اور جہاز کے نکالے جانے کے منتظر ہیں۔ جہاز کی آہنی سیڑھی کے ساتھ بہت موٹے رسّے کی ایک پرانی اور خاصی گھِسی ہوئی سیڑھی ہوا کے ساتھ جھول رہی ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نوجوان جو چہرے مہرے سے لبنانی یا اردنی معلوم ہوتا ہے' رسّی کی

اس سیڑھی پر پیر رکھتا ہے اور جھولتا ہوا نیچے آ رہا ہے۔ اس کی نگاہ ان لڑکیوں پر جمی ہوئی ہے جو ایک مرسڈیز کار سے اتر رہی ہیں۔ وہ نوجوان اپنی بد رنگ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر 'ڈن ہل' کا پیکٹ نکالتا ہے' ایک سگرٹ سلگاتا ہے اور ان لڑکیوں کی طرف بڑھتا ہے۔ ان کے قریب پہنچ کر وہ ان سے کچھ کہتا ہے تو ان میں سے ایک دلکش لڑکی زور سے ہنستی ہے' پھر وہ سب لڑکیاں اس سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ وہ انہیں جہاز کی طرف اشارہ کر کے کچھ بتا رہا ہے۔

میں ریتیلی ڈھلان کے کنارے پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ جاتی ہوں۔ انیس شاہ نے اچھومیاں اور سومرو کو آواز دے کر اپنی طرف بلایا ہے اور اب وہ ان کی تصویریں کھینچنے میں مصروف ہیں۔ میں خالی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوں' باہر کتنی رونق ہے لیکن اندر کی ویرانی کا بھلا کیا علاج۔ میں جھک کر ریت پر مشتری کی انگلی سے لکھتی ہوں' یادِ یارِ مہرباں آید ہمی' چند لمحوں تک اپنے لکھے ہوئے کو دیکھتی ہوں اور پھر ریت پر لکھے ہوئے حروف کو بہ یک جنبشِ انگشت مٹا دیتی ہوں۔ لفظ ریت میں مل جاتے ہیں اور ناپید ہو جاتے ہیں۔ جس طرح انسان مٹی میں مل جاتا ہے اور معدوم ہو جاتا ہے۔ ہوا ریت کے ذروں کو اپنے دامن میں سمیٹے چکراتی پھر رہی ہے اور یاد کے بگولے میرے ذہن میں رقصاں ہیں۔

''آپ کا بھی جواب نہیں' یہیں بیٹھی رہ گئیں' اچھا اب اٹھیے' کچھ کھانے پینے کا سلسلہ بھی ہونا چاہیے'' انیس شاہ مجھ سے مخاطب ہیں۔ ان کا کیمرہ لمحوں کو مقید کر کے ان کے شانے پر جھول رہا ہے۔

اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ اس جہاز کو دیکھ کر مجھے کتنی بہت سی اور کیسی سریت آمیز باتیں یاد آ رہی ہیں۔ وہ باتیں جنہیں میں نے اپنے بچپن میں سنا اور میرے ماں باپ نے اپنے بچپن میں۔ ماضی کی وہ داستانیں جنہیں کسی مقدس امانت کی طرح انہوں نے مجھے منتقل کر دیا تھا اور یہ سلسلہ ہمارے خاندان میں کب سے چلا آ رہا تھا۔

''شاہ جی' میرا تو ابھی یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا' مجھے کچھ دیر یہاں چھوڑ

دیجیے' واپسی میں لے لیجیے گا۔'' میں ان سے کہتی ہوں۔

'' صاحب آپ بھی خوب ہیں' یعنی اس ویرانے میں آپ کو تنہا چھوڑ کر ہم چلے جائیں' سبحان اللہ کیا کہنے ہیں آپ کے۔'' وہ تیکھے لہجے میں کہتے ہیں۔

'' اچھا تو پھر اپنا یہ ملازم یہاں چھوڑ جائیں'' میں ان کے ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتی ہوں جسے وہ محمد آباد سے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتے ہیں پھر محراب خان کو اشارے سے پاس بلا کر کچھ کہتے ہیں۔ وہ سر ہلاتا ہے اور مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

'' واپسی میں ذرا دیر ہو جائے گی' میں ان لوگوں کو ڈاجم کار اور پلے لینڈ بھی لے جاؤں گا کچھ سیر تو کرا دوں۔ اچھا یہ بتایئے کہ آپ کے لیے کیا لے کر آؤں؟'' انیس شاہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھتے ہیں۔

'' کچھ لانے کی ضرورت نہیں، بس خود واپس آ جایئے گا''۔

میرا جواب سن کر وہ مسکراتے ہیں اور گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔

میں گہرا سانس لیتی ہوں، کبھی کبھی تنہا ہونے اور آشنا چہروں سے منہ چھپا لینے کو جی چاہتا ہے، یہ بھی ایک ایسا ہی لمحہ ہے۔ دن کے آثار ڈوبتے سورج کی روشنی میں چھپ رہے ہیں۔ میں اس جہاز کو دیکھتی ہوں جو نہ جانے کن شہروں کو جانے کے لیے نکلا تھا لیکن اب ریت کی دلدل میں گھٹنوں گھٹنوں دھنسا کھڑا ہے۔ جہاز کے حاشیوں پر ادھر ادھر لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں، اس کے باوجود اس پر عجیب سی آسیب زدگی ہے، جیسے اس میں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ اس کے وجود پر گہرا حزن اور اداسی ہے، وہی اداسی جو گلّے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ کے چہرے پر ہوتی ہے۔

شاید یہ میری نظر کا فتور ہو لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے ساحل پر بھی حزن اور اداسی کی لکیر کھینچ دی ہے۔ اس ساحل میں اور دیبل میں کیسی عجیب سی مماثلت ہے۔ وہاں بھی پتھر کی ایک نصف نمودار دیوار ہے جس نے شہر کو اپنی پناہ میں لینے کی کوشش کی تھی پر شہر کو اور شہر والوں کو پناہ نہیں مل سکی تھی اور یہ بھی ایک دیوار ہے جو اگر وقت کی گرد

میں چھپ جائے پھر کسی اور زمانے کی نسلیں اس دیوار کو کھود کر نکالیں تو شاید وہ اسے شہر پناہ جانیں، لیکن یہ دیوار سمندر کا راستہ روکے ہوئے ہے اور وہ دیوار سمندر کی جانب سے آنے والے قزاقوں کا راستہ روکتی تھی۔

وہ بھی ایک ایسی ہی اداس اور حزن سے معمور شام تھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور میں دیبل (بھنبھور) کے جنوبی دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ انیس شاہ چلتے چلتے تھک گئے تھے اور دروازے کے قریب ایک اونچی سی ٹیکری پر جا بیٹھے تھے۔ میں نے اس دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ان جہازوں کا تصور کیا تھا جو اپنے بادبانوں میں ہوائیں سمیٹے آتے تھے اور دیبل کے گھاٹ پر لگتے تھے اور بے اندازہ سامان تجارت کے علاوہ دور افتادہ زمینوں سے آنے والوں کو لے کر آتے تھے۔

اس شام میں ان سیڑھیوں سے اتر کر گھاٹ تک گئی اور وہاں پھیلی ہوئی ریت میں یوسف نوبختی کے نقش قدم ڈھونڈے لیکن ہوا سارے نقش اڑا کر لے گئی تھی اور وقت نے کسی نشان کی حفاظت نہیں کی تھی۔ ساحل کے قریب نمک کے بے شمار ٹیلوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ سمندر کی آنکھوں کا نمک ہے جو ساحل پر جمع ہو گیا ہے لیکن رات کے اندھیروں میں اور شام کے دھندلکوں میں جو آنسو انسان بہاتے ہیں اور ان آنسوؤں میں جو نمک ہوتا ہے وہ کس ساحل پر جمع ہوتا ہے؟ اس کے ٹیلے کس مقام پر کھڑے ہو کر گنے جا سکتے ہیں؟

ایک کالا تیتر میرے قریب سے بولتا اڑ گیا تھا اور تب میں نے اس ساحل پر ایک الوداعی نظر ڈالی تھی جہاں صدیوں پہلے میرے جد نے قدم رکھا تھا۔ واپسی پر انیس شاہ قدم قدم پر رکتے ہوئے اور جھک جھک کر اپنی انگلیوں سے مٹی کریدتے چلے تھے اور جب ہم شیو مندر پہنچے تھے تو انہوں نے مٹھی کھول کر میری طرف کئی چیزیں بڑھا دی تھیں، گہرے سبز رنگ کی چینی کے کسی برتن کے تین چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، صیقل شدہ چینی کا ٹکڑا اور گہرے نیلے رنگ کی چینی کے دو ٹکڑے جن پر کسی پھول کے نامکمل نقش تھے۔ سفید، نیلے اور سبز رنگ کی چینی کے یہ ٹکڑے مختلف برتنوں کا حصہ رہے ہوں گے۔ جانے یہ چیزیں کن

گھروں کی زینت ہوں گی۔ یہ ٹکڑے کس خم کا، جانے کس پیالے کا جزو ہوں گے، جانے کن حنائی انگلیوں کے ریشمی لمس نے انہیں محسوس کیا ہوگا، جانے کن لبوں نے اس پیالے کو اپنے ہونٹوں سے لگایا ہوگا؟ میں جو انہیں دیکھ رہی تھی، چھو رہی تھی دیکھ رہی تھی تو میری انگلیاں بھی خاک میں ملنے والی تھیں اور میری آنکھوں کو بھی حشرات الارض کی غذا بننا تھا۔

عنکبوتِ وقت کا جالا کائنات کے گرد بنا گیا ہے اور ہم اس تارِ عنکبوت میں پھنسے پھڑپھڑاتے ہیں۔ وقت سے نجات نہیں اور فنا سے پناہ نہیں۔ پھر میں کیوں ہوں اور میرے جدِ اعلیٰ بہروز پور ہرمز کیوں تھے اور میرے جد یوسف نوبختی کیوں تھے اور یزد کا آتشکدۂ آذرخش کیوں تھا؟

جب ہر چیز کو فنا کا ذائقہ چکھنا ہے تو پھر یہ سب چیزیں کیوں ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ یہ ہمیں اپنی ایک جھلک دکھائیں اور پھر یہ ہماری آنکھوں سے اور ہم ان کے سامنے سے اوجھل ہو جائیں اور اپنے پیچھے حزن کی ایک لکیر چھوڑ جائیں، ہمارے بعد فنا کے راستے پر چلنے والے آئیں اور حزن کی اس مٹتی لکیر کو دیکھیں تو اپنے سروں پر خاک ڈالیں اور اپنے گریبانوں کو چاک کریں اور اپنی آنکھوں سے اشکِ افسوس بہائیں۔ کائنات کی یہ بساط کیا محض اسی لیے بچھائی گئی ہے؟

میں ریت میں اپنے جد کے نقشِ قدم کیا ڈھونڈوں کہ بادِ صرصر نے انہیں مٹا دیا اور ریگستان سے نخلستان کو جانے والا راستہ گم ہو چکا ہے۔ تمام راستے گم ہو چکے ہیں اور ان راستوں پر چلنے والے فراموش کیے جا چکے ہیں۔ ذکر بیکار ہے اور ذکر لاحاصل ہے۔ سوختگاں کا ذکر کیا، ہاں ذکر سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ سوختگاں کا ذکر کیا، دست فشاں گزر گئے۔

افق پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آگ بھڑکتی ہے اور آگ گھروں میں، بازاروں میں، آسمانوں میں اور آتشکدوں میں بھڑکتی ہے۔ میرا خاندان گزشتہ ساڑھے تیرہ سو برس سے آتشکدوں کے بجائے مسجدوں میں سجدے گزارتا رہا ہے لیکن کبھی کبھی میرے اندر ایک قدیم روح بیدار ہوتی ہے اور تب میں اس روشن آگ کو دیکھنا چاہتی ہوں جو کبھی

نہیں بجھتی۔

میرے شہر کی ایک بارونق سڑک پر سرمئی رنگ کی ایک عمارت ہے، اس عمارت میں سیاہ دیواروں والا ایک حجرہ ہے اور اس حجرے میں کبھی نہ بجھنے والی یہ آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں سیاہ دیواروں والے اس حجرے میں قدم رکھوں اور اس درخشاں آگ کے سامنے جھک جاؤں، پھر زرتشت بہ رام پژدو کی زبان میں کہوں، یکے تازہ کن قصۂ زرہ تشت، بہ نظم دری و بہ خط ذرشت۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے سینے میں آگ کا کون سا درجہ روشن ہے۔ کیا یہ وہ آگ ہے جو آذرخش کے معبد میں بھڑکتی تھی اور برزِ سواہ کہلاتی تھی اور جس کی حضوری کے لیے شہنشاہ پیادہ پا آتے تھے اور جس کے سامنے دوزانو ہو کر وہ اس کی حمد کرتے تھے اور خوشبودار لکڑیوں کی نذر پیش کرتے تھے کہ جب وہ خوشبو دار لکڑیاں اس مقدس آگ کا ایندھن بنیں تو روشنی فانی انسانوں کے سینوں کو پاک کردے۔

یا پھر میرے سینے میں 'وھوفریان' بھڑکتی ہے؟

نہیں، یہ آگ کا چھٹا درجہ ہے، اسے 'آتش ہجر' کہتے ہیں۔

آگ کا چھٹا درجہ بھڑکتا ہے۔ صندل، کیسر، عود اور عنبر کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ یاد کا خوشبودار دھواں بل کھاتا ہوا آسمانوں کی طرف بلند ہوتا ہے اور میں اس کی اسیر ہوں، یہ دھواں مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ دھوئیں کی اس دائرہ نما چادر نے منڈپ کی شکل اختیار کرلی ہے اور اس منڈپ میں سینے راما Cinerama کا کھیل جاری ہے۔ میرے چاروں طرف چہرے ہیں اور آوازیں ہیں، شہر، جنگل اور پہاڑی سلسلے ہیں، جھیلوں میں کنول کھل رہے ہیں۔ سفید پروں والے بگلے ان جھیلوں میں اپنی گلابی چونچیں ڈبوتے ہیں۔ جھرنوں کی گنگناہٹ ہے اور دریاؤں سے مانجھیوں کی آوز بلند ہوتی ہے۔

اور تب یاد کے منڈپ کی دیواروں پر مگدھ ماں زمردیں دوشالہ اوڑھے، گنگا کو اپنی مانگ میں سجائے، ہاتھوں میں سون اور گنڈک کے کنگن، پیروں میں ساردا اور گھاگھرا کی آلتا پہنے ابھرتی ہے۔ مگدھ ماں کی تعظیم کرو کہ یہ نروان کی دھرتی ہے۔ کند اپور کے مہاویر

اور کپل وستو کے شہزادے گوتم کو گیان اسی دھرتی پر ملا ہے۔ یہاں والمیکی نے رامائن لکھی اور ودیاپتی نے اپنی کویتائیں گنگنائی ہیں۔ یہاں دنیا کی پہلی جمہوری ریاست ویشالی کے عظیم نالندہ کے اور راج گریہہ کے کھنڈرات ہیں۔ یہاں بھیم بسار، اجات سترو، چندر گپت موریہ اور اشوک اعظم کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ یہ وہ دھرتی ہے جس کی سیاسی اور مذہبی نو آبادیات تکشلا، بامیان، بلخ، قندھار اور لنکا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ راجا سہاسترارام کا شہر سہاسارام ہے۔ یہاں حسن خان کا بیٹا اور ابراہیم خان کا پوتا، فرید شیر خان جاہ وجلال کے ساتھ آرام کرتا ہے۔ اس کے عظیم الشان ہشت پہلو مدفن کو چھوتے ہوئے پانی پر کنول تیرتے ہیں۔

پانی مجھے اپنی طرف بلاتا ہے اور کنول اپنی نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ شیر خاں کے مدفن کے ساتوں دروازے میرے لیے کھلے ہیں، پر میرے پیر نہیں اٹھتے، مجھے راستہ نظر نہیں آتا۔ اور تب میری بے تاب آواز پانیوں پر سفر کرتی ہے، میری آواز بلندیوں اور پستیوں پر اڑان بھرتی ہے۔ 'چال چلن موہے من کو بھاوے۔ رنگ ڈھنگ وا ادھک سہاوے۔ اُس بن دل کو رہے کلیس۔'

کیمور کی پہاڑیاں مجھ سے پوچھتی ہیں 'اے سکھی ساجن؟'

میری زخمی آواز ایک بار پھر پر کھول کر اُڑتی ہے اور شمال کا رخ کرتی ہے' ناسکھی دیس ...... ناسکھی دیس آواز کی بازگشت میرا تعاقب کرتی ہے اور میں وحشت زدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہوں، عالمِ اضطراب میں ٹہلنے لگتی ہوں۔ میری نظر اس تنہا اور اداس جہاز پر پڑتی ہے تو مجھے بے ساختہ دیبل یاد آتا ہے، منصورہ یاد آتا ہے۔ یاد کی منطق نہیں' اس کی کڑیاں اتنی الجھی ہوئی اور بکھری ہوئی ہیں کہ ان کا ملانا محال ہے۔ میں ٹہلتے ٹہلتے خاصا آگے نکل جاتی ہوں، اچانک میری نظر ایک صاحب پر پڑتی ہے جو پریشاں حالی کے عالم میں سر جھکائے ادھر ادھر کچھ دیکھتے پھر رہے ہیں۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ نگاہیں اٹھاتے ہیں اور مجھے دیکھتے ہیں۔ ''کیا آپ نے یہاں کہیں ایک چھوٹی سی سیاہ ڈائری دیکھی ہے''؟ وہ معذرت کرتے ہوئے پوچھتے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ ان کے غیر ملکی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ

صاحب اندازاً پینتالیس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔ تانبے جیسی رنگت پر آئن اسٹائن کی سی کھچڑی مونچھیں بہت اچھی لگ رہی ہیں، قلموں کے آدھے بال سیاہ ہیں اور آدھے سفید، جانے کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔

''جی نہیں، میں نے تو نہیں دیکھی۔'' میں جواب دیتی ہوں۔

''اس ڈائری میں میری بہت اہم یادداشتیں ہیں'' وہ عجب لاچاری سے مجھے بتاتے ہیں۔ان کے لہجے میں اتنی بے بسی ہے کہ میں بے ساختہ ان کے ساتھ چلنے لگتی ہوں۔ وہ جس راستے سے گزرے تھے، اسی پر واپس پلٹ رہے ہیں۔ اب ہر طرف اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مضطرب ہیں اور تب اچانک میری نگاہ سیاہ رنگ کی کسی چیز پر پڑتی ہے جو ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں ہے۔ میں جھک کر اسے اٹھاتی ہوں، یہ سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی ڈائری ہے، اس کی چرمی جلد سے ریت کے ذرّے لپٹ گئے ہیں۔ میں ڈائری ان کی طرف بڑھاتی ہوں۔ اس لمحے ان کی آنکھوں میں جو ممنونیت ہے اس کا بیان شاید ممکن نہیں۔ وہ جوش میں میرا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور بار بار میرا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

میں اسی پتھر پر بیٹھ جاتی ہوں جس کی اوٹ سے میں نے وہ ڈائری اٹھائی تھی۔ وہ بھی میرے برابر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھ سے تھوڑی دور پر محراب خان کھڑا ہے اور قدرے بے یقینی سے ہم دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایک اجنبی کی اس اچانک بے تکلفی پر اسے پریشان ہونا چاہیے یا نہیں۔

''میرا نام دکتر حماد سلامہ ہے''۔ وہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''میں یونیسکو سے متعلق ہوں اور موہنجوڈرو کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ آج جب کسی نے اس جہاز کا ذکر کیا تو میں اسے دیکھنے چلا آیا، وطن سے دور ہو کر وہاں کی معمولی چیزیں بھی بہت اہم محسوس ہوتی ہیں۔'' وہ کہتے ہیں۔

''تو گویا آپ کا تعلق لبنان سے ہے؟''

''ہاں میں لبنان کا رہنے والا ہوں اور یہ محض اتفاق ہے کہ دو برس سے وہاں نہیں جا سکا ہوں جب کہ ساری دنیا میں گھومتا پھر رہا ہوں۔ میری تعلیم بیروت کی امریکن یونیورسٹی

میں ہوئی ہے۔ تم نے موہنجوڈرو تو دیکھا ہوگا؟ یہ ایک عظیم الشان تاریخی ورثہ ہے لیکن اسے سیم اور تھور سے شدید خطرہ ہے، مجھے یونیسکو نے اسی سلسلے میں رپورٹ مرتب کرنے کے لیے بھیجا ہے۔'' وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتے ہیں۔

''جہاں تک عظیم الشان تاریخی ورثے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں آپ بھی کم خوش نصیب نہیں۔'' میں انہیں ان کا تاریخی ورثہ یاد دلاتی ہوں۔

''تو گویا تمہیں شہروں کے تاریخی ورثے سے دلچسپی ہے۔'' وہ قدرے خوش ہو کر مجھے دیکھتے ہیں۔ ''دوسری قدیم بستیوں کی طرح بیروت کا بھی کئی مرتبہ نام بدلا ہے۔ میلاد مسیح کے قریب یہ شہر Berytus کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور جس طرح آج بیروت کی امریکن یونیورسٹی کا بہت شہرہ ہے، اسی طرح تیسری صدی عیسوی میں یہاں کی جامعہ قانون دنیا کے تمام علمی حلقوں میں مشہور تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہ شہر علمی لحاظ سے ایتھنز، اسکندریہ اور قیسار کا ہم پلہ تھا۔''

وہ باتیں کرتے کرتے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں بھی ان کا ساتھ دیتی ہوں، پھر وہ ٹہلنے لگتے ہیں۔ ٹہلتے ہوئے ان کی نظر ریت پر پڑے ہوئے کینو کے چھلکے پر پڑتی ہے، وہ اسے ٹھوکر مار کر ہنستے ہیں۔ ''یہ جو تم سنگترے کا چھلکا دیکھ رہی ہو، بیروت اس سے ہزار درجہ بہتر سنگتروں کے لیے گردونواح کے علاقے میں مشہور تھا۔ بیروت کی بندرگاہ سے سنگتروں کے ہزاروں ٹوکرے جنیوا، وینس اور دوسرے شہروں کو جاتے تھے۔''

میں جامعہ قانون اور سنگتروں کے درمیان موجود ربط کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہوں، شاید ڈاکٹر حماد سلامہ نوسٹلجیا کا شکار ہیں، اسی لیے ایک طرف وہ بیروت کے علمی پس منظر پر فخر کر رہے ہیں اور دوسری طرف سنگتروں کی برآمدات پر خوش ہیں۔ میں سوچتی ہوں اور دل ہی دل میں مسکراتی ہوں۔

''پھر جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا تو اس کی آبادی کا تناسب بدل دیا۔ ایران سے ہزاروں کی تعداد میں نومسلم یہاں لائے گئے اور انہیں بیریتوس اور اس کے گردونواح میں آباد کیا گیا۔'' ڈاکٹر حماد کہتے ہیں اور جیب سے سگرٹ نکالتے ہیں۔

ساڑھے تیرہ سو برس پرانے اس واقعے کا ذکر سن کر میرے اندر ایک ہیجان بپا ہے۔ ریت میں دھنسے ہوئے اس لبنانی جہاز کو دیکھ کر میرے اندر جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ شدید ہو گئی ہے۔ ''جناب مجھے اس جہاز سے اور بیروت سے اور لبنان سے جو خاص دلچسپی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے جدان نومسلموں میں سے ایک تھے جنہیں معاویہ کے حکم پر ایران سے بیریتوس لے جایا گیا تھا۔'' میں انہیں بتاتی ہوں۔

دکتر حماد سگرٹ سلگانا بھول گئے ہیں اور تیز ہوا نے شعلے کی لو کو کھا لیا ہے، وہ لائیٹر ہاتھ میں لیے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ''بہت خوب، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم ماضی بعید سے پوری طرح وابستہ و پیوستہ ہو، مجھے اس وقت واقعی بہت خوشی ہوئی، ورنہ اس زمانے میں نوجوان نسل تو اپنے دادا کا نام یاد رکھنے کی بھی روادار نہیں''۔ وہ کہتے ہیں۔

''بات دراصل یوں ہے کہ وہ خاندان جو کتابوں سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں، وہ اپنی اصل کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ آج اس جہاز کو دیکھ کر مجھے اپنے جدِّ اعلیٰ بہروز پور ہرمز کی یاد آ رہی ہے جو شیز میں شاہان ایران کے مخصوص آتش کدے 'آذرخش' کے ایک موبد تھے اور جنہوں نے شیز پر مسلمانوں کے قبضے کے وقت دیگر موبدوں کے ساتھ ہند کی جانب فرار ہونے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ ان کے ساتھی مارے گئے اور وہ غلام بنا لیے گئے۔ غلامی سے نجات کا واحد طریقہ مسلمان ہو جانا تھا، سو وہ اسلام لائے اور کچھ عرصے بعد انہیں تیسفون سے بیریتوس لے جایا گیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ایران کے عظیم ماضی کی یادوں سے کنارہ کشی ان کے لیے ممکن نہ تھی۔ وہ اپنے ساتھ نہ جانے کس طرح اپنی چند کتابیں بیریتوس لے جانے میں کامیاب ہو گئے، وہ ان کتابوں کو چھپ چھپ کر پڑھتے اور ایران کی عظمتِ رفتہ پر گریہ کرتے۔ دُرفش کاویانی، نوشیرواں کا شاہی لباس اور فرش بہارِستان کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور عرب فاتحین میں مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم ہوا۔ کسی مذہب کو قبول کر لینے سے چشم زدن میں آپ کا کلچر نہیں بدل جاتا اور کسی زمین کو اختیاری یا جبری طور پر ترک کر دینے سے اس زمین کے ساتھ جذباتی وابستگی کا رشتہ بھی منقطع نہیں ہوتا۔ وہ بہروز پور ہرمز سے فاتک ابن ہرمز ہو گئے تھے لیکن ایرانی کلچر سے اور

'آذرخش' کے عظیم پس منظر سے دستبرداری ان کے بس کی بات نہ تھی اس لیے انہوں نے اوران کے بیٹوں نے شیعیت، شعوبیت اور تصوف میں پناہ لی۔''

''تم نے کہاں پناہ ڈھونڈی ہے''؟ وہ اچانک پوچھتے ہیں۔

''مجھے آپ Agnostic جانیں۔ میرے خاندان نے کئی بار تقیہ کیا ہے۔ جب اموی خلفا کے جاسوس شیعوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اس وقت میرے اجداد میں سے کئی نے اپنے مسلک کو چھپایا، پھراس کے بعد جب بھی میرے بزرگوں پر کوئی برا وقت آیا انہوں نے تقیے میں پناہ لی۔ لیکن یوں بھی ہے کہ ہمارے خاندان کے کچھ لوگوں نے حنفی مسلک اختیار کیا۔ ویسے تصوف کا ہمارے ہاں بہ طور خاص غلبہ ہوا اور ہمارے خاندان میں قطار اندر قطار صوفی پیدا ہوئے۔''

''تمہارے خاندان نے بیروت سے کب ہجرت کی''؟ وہ پوچھتے ہیں۔

''ہم نے بیرتوس سے بغداد کی راہ لی تھی۔ آٹھویں صدی کا آغاز تھا جب بغداد میں بامیان کے آتش کدۂ نوبہار کے خاندانِ برمک پر قیامت ٹوٹی اور اس خاندان، کا حلقۂ خاص بے اساس ہوا، اس حلقے کے کئی لوگ جب فضل اور جعفر سے دوستی کی پاداش میں بریدہ سر ہوئے تو میرے جد یوسف نوبختی نے بغداد چھوڑا، بصرے کا رخ کیا اور پھر وہاں سے ایک ایسے سفر پر نکلا جس کا خاتمہ نہیں تھا۔ ہجرت اس کا اختیار نہیں جبر تھی لیکن اب ہجرت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سو اس کے سر میں سرزمین ہند کا سودا سمایا اور وہ احباب سے گلے مل کر اور عروس البلاد شہر بغداد کی جدائی کا غم لے کر ایک نئی سرزمین کی طرف روانہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ ہند ایک ایسی سرزمین تھی جو دور افتادہ تھی اور جہاں خلیفۂ وقت کے جاسوسوں کے پہنچنے کے امکانات بہت کم تھے۔

''وہ شخص صرف اس توقع میں وہاں سے روانہ ہوا تھا کہ ہند کے کسی گوشے میں بیٹھ کر کتابیں پڑھے گا اور کتابیں لکھے گا اور ایک دن چپکے سے مر جائے گا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک اجنبی سرزمین پر گمنام مرجانا آسان تھا اور ہارون الرشید کے پرچم تلے خاندانِ برمک کے جاں نثاروں کا جینا محال۔'' میں بولتے بولتے اچانک خاموش ہو جاتی ہوں

کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری بات ختم ہوگئی ہے یا اب شروع ہوئی ہے۔

"مجھے تمہارا نام نہیں معلوم، میں نے پوچھا نہیں اور تم نے بتایا نہیں، تم واقعی بہت عجیب ہو، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں بہت پیچھے لوٹ گیا ہوں، اس دور میں جس کا ذکر میں کتابوں میں پڑھتا رہا ہوں اور جن کتابوں میں تم جیسے نوجوان نسبی اور علمی بحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ میں تمہارا دکھ اور تمہارے اجداد کا دکھ زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ تم میرے نام سے مجھے مسلمان سمجھ رہی ہوگی لیکن میں مسیحی ہوں، رومن کیتھولک فرقے سے میرا تعلق ہے۔ میں جب لبنان میں تھا تو مجھے کبھی اپنے مسلمان ہم وطنوں سے زیادہ مختلف ہونے کا احساس نہیں ہوا لیکن اب جب کہ میں مختلف ملکوں کے مسلمانوں اور مسیحیوں کے ساتھ کام کرتا ہوں تو اکثر ایک بے آرامی سی محسوس ہوتی ہے۔ فلپینی مسلمان میرے عرب نژاد ہونے کے باوجود مجھے پسند نہیں کرتے کیونکہ میں مسیحی ہوں اور یورپی مسیحی مجھے اپنا نہیں جانتے کیونکہ میں عرب نژاد ہوں اور میرا کلچر عرب کی سرزمین سے وابستہ ہے۔ یہ ایک بہت عجیب چکر ہے جو میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا اور کبھی نہیں آئے گا۔" ڈکٹر حماد کے لہجے میں حزن ہے۔

ہر طرف اندھیرا پھیل گیا ہے، ان کے سگریٹ کی روشنی اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکتی ہے، بہت سے لوگ اب واپس جا رہے ہیں، ان کی گاڑیوں کی روشنیاں جب جلتی ہیں تو اندھیرے میں روشنی کی لکیریں کھنچ جاتی ہیں جو لمحوں بھر بعد معدوم ہو جاتی ہیں۔ ریت میں پھنسا ہوا جہاز اب سیاہ رنگ کا ایک بڑا دھبا بن گیا ہے۔

انیس شاہ اب تک نہیں آئے، میں سوچتی ہوں۔

ڈکٹر حماد اپنی روشن ڈائل والی گھڑی دیکھتے ہیں اور چونک جاتے ہیں۔ "مجھے بہت دیر ہوگئی، آٹھ بجے مجھے ایک سرکاری ڈنر میں شریک ہونا ہے۔ ورنہ ابھی میں تم سے اور بہت سی باتیں کرتا، میں کل شام تک انٹرکان میں ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر تم مجھ سے آ کر ملو، میرا کمرا نمبر 432 ہے۔ اور ہاں ڈائری ڈھونڈنے کے لیے میں تمہارا واقعی بہت ممنون ہوں۔" وہ میرا شانہ تھپتھپاتے ہیں۔

''آپ واپس کس طرح جائیں گے''؟ میں پوچھتی ہوں۔

''تم میری فکر نہ کرو، یونیسکو کی گاڑی میرے پاس ہے، ڈرائیور گاڑی میں میرا منتظر ہے'' پھر وہ بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہیں، اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس طرف روانہ ہو جاتے ہیں جس طرف ان کی گاڑی کھڑی ہے۔

میں انہیں جاتے ہوئے دیکھتی ہوں، چند قدموں تک مجھے ان کا وجود نظر آتا ہے، پھر وہ ہیولی بنتے ہیں اور اس کے بعد وہ سیاہی میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک گاڑی اسٹارٹ ہوتی ہے اور اسکی ہیڈ لائٹیں گھوم کر میری آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں، اس کی روشنی میں مجھے محراب خان کا چہرہ نظر آتا ہے، پھر دو متحرک روشن لکیریں شہر جانے والی سڑک کا رخ کرتی ہیں اور گم ہو جاتی ہیں۔

میں پلٹ کر دیکھتی ہوں، کچھ دور ایک ٹیلے پر بہت روشنی ہے۔ سرخ، سبز اور زرد بتیاں اندھیرے میں جگ مگ کرتی ہیں۔ کچھ جگ مگ جگ مگ ہووت ہے، کوئی اوڑھے چڑیا سووت ہے، یہ عبداللہ شاہ غازی کا مزار ہے۔ وہ سوتا ہے اور اس کے ماننے والے جاگتے ہیں۔ جاگنے والوں کا نصیبہ سوتا ہے اور سونے والا ایسا بخت آور ہے کہ اس کے آستانے کی مٹی بھی لوگوں کی آنکھوں کا سرمہ ہے۔ عقیدت کے، محبت کے، عشق کے اور سپردگی کے انداز نرالے ہیں۔

میرے سینے میں تشکیک کا جہنم بھڑکتا ہے، میں اس ٹیلے کو حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھتی ہوں، یقین اور ایمان کے تمام در میں نے اپنے آپ پر بند کر رکھے ہیں میرے سینے میں تاریخ کی مکڑی جالا بنتی ہے۔ اور میں اس تارِ عنکبوت میں گرفتار ہوں۔

دن، مہینے، سال، صدیاں۔

وہ بھی کوئی ایسی ہی اندھیری رات ہوگی جب ہارون الرشید نے ابو ہاشم مسرور الکبیر کو طلب کیا تھا اور اسے جعفر کا سر لانے کا حکم دیا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی اندھیری اور مہیب رات ہوگی جب عجم کا تابندہ ستارہ عرب کی سرزمین پر غروب ہوا اور وہ کیسا تیرہ و تار دن ہوگا جب آل برمک کے فرزند، جعفر کا سر بریدہ بدن ایک ایسے اونٹ پر بغداد روانہ کیا گیا جس پر

پالان تک نہ تھا، پھر اس بدن کے ٹکڑے بغداد کے شرقی اور غربی پلوں پر لٹکائے گئے اور اس عالی مرتبت کے سر نے جسرِ اوسط کو زینت بخشی۔

وقت نے آل برمک کو عرش سے فرش پر لا کھڑا کیا اور وقت نے تابندہ پیشانی والے برمکیوں کو ذلیل و رسوا کیا۔ جعفر کے ندیم خاص انس بن ابی شیخ کا سر قلم ہوا، اس کے مصاحبین خاص میں سے بیشتر قید ہوئے، جعفر کا مرثیہ لکھنے والے واجب القتل قرار پائے۔ واجعفراہ۔ واسیداہ، کا نعرہ بلند کرنے والے ابراہیم بن عثمان بن نہیک کے سر کا بوجھ خلیفۂ وقت کے حکمِ عالی سے ہلکا ہوا۔

اس عالم دارو گیر میں یوسف نوبختی نے جب ہجرت کا خیال باندھا تو اس کے ذہن میں پہلا نام ہند کا آیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہند ایک دور افتادہ سرزمین تھا اور دوسری یہ کہ یوسف نوبختی نے ہندیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے خاندان کے مردِ بزرگ نوبخت فارسی اور ابن نوبخت کے حلقۂ خاص میں کنکہ ایسا جوتشی، مانک ایسا وید، ابوضلع سندھی اور ابوعطا سندھی ایسے شاعر تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عباسی دربار میں برہم گپت کی کتاب برہم سدھانت کا ڈنکا بجتا تھا۔ پنچ تنتر کتھا کی کہانیاں عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں اور ان کہانیوں کے انداز پر عرب داستان گو حکایتیں مرتب کر رہے تھے۔ دربار میں بدھ مذہب کے اعتقادات کا چرچا تھا۔ کپل وستو کے شہزادے گوتم کے اساطیری حالاتِ زندگی اور سراندیپ کے بھکشو بلوہر کی نصیحت آموز کہانیوں کا ترجمہ بلوہر و بوذاسف کے نام سے ہو چکا تھا۔ شاید یوسف نوبختی کو بھی تناسخ کا نظریہ اپنی طرف کھینچتا ہو اور شاید پنچ تنتر کتھا کی بعض کہانیوں کا یہ مرکزی خیال اس کے دل کو لبھاتا ہو کہ انسان اس عالم فانی میں محض ایک مرتبہ نہیں آتا، اپنے اعمال کے مطابق وہ بار بار جنم لیتا ہے۔ یوسف نوبختی اس عہد کے دوسرے عجمی نوجوانوں کی طرح روشن خیال اور تصوریت پسند تھا۔ اس کی انہی صفات نے اسے جعفر برمک کے قرب سے سرفراز کیا تھا۔ جعفر کی محفلوں میں ہی اس کی ملاقات ابوضلع سندھی سے ہوئی تھی اور اس نے کئی بار ابوضلع سندھی سے وہ قصیدہ سنا تھا جس میں اس نے ہندوستان کی مدح کی تھی اور کہا

تھا میری جان کی قسم ! یہ وہ سرزمین ہے کہ جب اس میں پانی برستا ہے تو دودھ، موتی اور یاقوت اس سے اگتے ہیں۔

ہند سے آنے والے یہ شاعر، جوتشی اور جادوگر کیسے عجیب لوگ تھے۔ انہوں نے بغداد کی علمی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ یہ اپنے ساتھ ارقامِ ہندیہ لائے تھے اور ان کی ذہنی اپج نے عربوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ویدوں کی بغداد اور اس کے اطراف و اکناف میں دھوم تھی۔ خلیفۂ وقت اور شہزادے ان کے معترف اور ان کے مرید تھے۔

یوسف نوبختی ایران کے بعد ہند کی عظمت کا قائل تھا۔ پس جب اس نے بغداد سے ہجرت کی ٹھانی تو اپنے سندھی دوستوں سے ہند جانے کا مشورہ کیا، ابوضلع سندھی نے اسے یقین دلایا کہ اگر ایک مرتبہ وہ بعافیت دیبل پہنچ گیا تو پھر خلیفۂ وقت کے ہاتھ اس تک بمشکل ہی پہنچیں گے۔ دیبل ایک عظیم الشان برِّعظیم کا دروازہ تھا اور اس دروازے سے پھوٹنے والے تمام راستے پُرسکون بستیوں اور خوبصورت شہروں کو جاتے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی کوئی رات ہوگی جب یوسف نوبختی نے ہند کی سرزمین پر اندھیرے سے پہلی مرتبہ ملاقات کی ہوگی۔ گھاٹ پر اتر کر اس نے شہر پناہ کے دروازے کا رخ کیا ہوگا اور راستہ چلنے والوں سے پوچھتے پوچھتے وہ کسی قریبی سرائے میں پہنچا ہوگا، وہاں چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں یوسف نوبختی نے اپنی کمر کھولی ہوگی۔ پانی سے اپنا گرد آلود چہرہ دھویا ہوگا اور تب اونٹنی کے دودھ میں کسی نے اسے کھجوریں ڈال کر دی ہوں گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے بصرے کے بازار سے زادِراہ کے طور پر جو کھجوریں خریدی ہوں ان میں سے کچھ اس کی خرجین میں پڑی رہ گئی ہوں۔ اور تب اس نوجوان نے جسے جعفر برمک کا قرب حاصل تھا اور جس کی زندگی ایرانی قالینوں پر آرام کرتے، ریشم و کمخواب کا لباس پہنتے سونے اور چاندی کے ظروف میں کھاتے اور شب و روز علمی بحثیں کرتے گزری تھی' ہاں اسی یوسف نوبختی نے لکڑی کے پیالے میں ملنے والے اونٹنی کے دودھ اور خشک کھجوروں کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا ہوگا اور گھاس کے بستر کو نرم و گداز توشک کے برابر جانا ہوگا۔

امیر المومنین ہارون الرشید کے 'خزانۃ الحکمت' کے نگران ابو سہل فضل نوبختی کے عم زاد یوسف نوبختی کے لیے ہند کی سرزمین پر وہ پہلی رات کیسی عجیب اور کتنی مہیب رات ہوگی۔ وہ رات جو اس کے لیے امیر المومنین کے غیظ و غضب سے محفوظ و مامون رہنے کا پیغام لائی تھی اور اسی رات سے دیارِ غیر میں صعوبتوں اور کلفتوں کا نیا دور شروع ہوا تھا۔ نئے لوگ، نئی زبان، نئی رسمیں، نئے رواج۔

شیز کے آتش کدۂ آذر خش سے بیر یتوس اور بغداد اور پھر دیبل۔ اس کے جد نے اپنے ساتھی موبدوں کے ساتھ ہند کی سرزمین میں پناہ چاہی تھی پر پناہ نہیں ملی تھی اور اب ڈیڑھ سو برس بعد اس نے بھی سرزمینِ ہند کو اپنی پناہ گاہ جانا تھا۔ اور اس رات یوسف نوبختی نے اپنے آپ کو اور اپنی اولادوں اور ان کی اولادوں کو ہندوستان جنت نشان کی پناہ میں دے دیا لیکن اے وقت تجھ سے پناہ کہاں ہے؟ اے وقت ہماری ہجرتوں کا خاتمہ، کب، کہاں اور کس سرزمیں میں ہے؟

'تذکرۂ دودمان نوبخت' کے ورق میری نگاہوں کے سامنے پلٹتے چلے جاتے ہیں۔ دن کے بعد دن، مہینے کے بعد مہینے، سال کے بعد سال، اور صدی کے بعد صدی۔

دیبل، منصورہ، ملتان، دلی، سہسرام، رہتاس، پٹنہ اور مونگیر۔

وقت کی انگلیاں ورق الٹ رہی ہیں۔ ناموں پر نام گزرتے جارہے ہیں۔ یاد کے منڈپ میں ایک بار پھر سینے راما شروع ہو جاتا ہے اور ایک حسینہ کا چہرہ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ یہ لڑکی شاید ملک قاف سے تختِ سلیماں پر بیٹھ کر آئی ہے۔ ہرنی جیسی وحشی آنکھیں، ستواں ناک، بیضوی چہرہ، سنہرے رنگ کی تنگ مہریوں والی گھیر دار شلوار اور اس پر سفید اور مہین اونچی سی کُرتی جس میں سے بدن کا سارا حسن دمکتا نظر آرہا ہے۔ کُرتی پر سرخ اور سفید دھاریوں والی صدری، صدری کے حاشیوں پر سنہرے رنگ کی بیل ہے۔ سیاہ گھنے بال پشت پر بکھرے ہوئے ہیں۔ کمر میں موتیوں کا پٹکا، دائیں بازو پر بڑا سا زمردیں بازو بند، گلے میں سچے موتیوں کی مالا، پیشانی پر موتیوں کی لڑیاں سجی ہیں اور سر پر موتیوں سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹوپی ہے جو ترچھی رکھی ہے۔ شاید کجکلا ہی، کا لفظ اسی

صورت حال کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔ یہ حسن، یہ سراپا دیکھ کر مجھے بے ساختہ فخر الدین گرگانی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ نگارا، سروقدا، ماہ رویا، بتا، زنجیر مویا، مشک بویا۔

یاقوتیہ بلخی میرا نام ہے۔ میں بلخ کے شہزادے ابراہیم بن ادھم کی پر پوتی ہوں جس نے شہزادہ گوتم کی طرح تخت چھوڑا، بیوی اور بچے کی محبت سے منہ موڑا اور لباس صوف پہنا، بلخ کے شہزادے نے دنیا سے کنارہ کیا لیکن اس کے جواں مرگ بیٹے کی اولاد نے دنیا سے ناتا نہیں توڑا، اس کی اولادوں میں سے بیشتر مختلف سلاطین اور حکمرانوں کے درباروں میں باریابی کے لیے نکلے اور انہوں نے اپنے اپنے طور پر زندگی بسر کی۔ ہند ایک ایسی سرزمین تھا جہاں مغل ایک نئے اور طاقتور حکمراں خاندان کے طور پر ابھر رہے تھے۔ اس لیے میرے باپ نے اپنے بھائی بھتیجوں سمیت سرزمین ہند کا رخ کیا اور خلد آشیانی حضرت بابر گورگانی کی خدمت میں حاضری دی، اعلیٰ حضرت نے ہمارے خاندان کے حسب نسب، ہمارے خانوادے کی علمی فضیلت اور ہمارے سپاہیانہ جوہر کو نظر میں رکھتے ہوئے سب لوگوں کو عہدوں، جاگیروں اور خلعتوں سے نوازا، پھر اعلیٰ حضرت شہنشاہ بابر، راہیٔ ملک عدم ہوئے اور زمامِ سلطنت اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہمایوں کے ہاتھوں میں آئی۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد افاغنہ نے سر اٹھایا اور سہسرام کے جاگیردار حسن خان کے بیٹے فرید خان کو اپنی سلطنت قائم کرنے کا خیال آیا اور وہ ظل سبحانی شہنشاہ ہمایوں کے خلاف صف آرا ہوا۔

رہتاس کا قلعہ جب شیر خانی افواج نے فتح کیا تو میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے کوکہ احمد جلال خان کی حویلی میں مقیم تھی۔ کوکہ احمد جلال کے تعلقات وزیر چور امن سے بہت اچھے تھے اور چور امن کو شیر خان سے دلی تعلق تھا اس لیے کوکہ احمد جلال کی حویلی شیر خانی افواج کی دستبرد سے محفوظ رہی۔

تقدیر کبھی کبھی عجب کھیل کھیلتی ہے۔ کوکہ احمد جلال کی حویلی کے فوراً بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا اس لیے ہم اکثر سیر تفریح کے لیے یا پرندوں کے شکار کے لیے جنگل کا رخ کرتے۔ سننے والے اب دل تھام کر بیٹھیں کہ اصل قصہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

وہ موسم بہار کی ایک شام تھی، پھولوں کی خوشبو سے بوجھل اور آشیانوں کو لوٹتے ہوئے پرندوں کی چہکار سے گونجتی ہوئی۔ میں کوکہ احمد جلال کی بیگم اور چند کنیزوں کے ساتھ حسب معمول جنگل کی سیر کو نکلی تھی۔ ہوا ہمارے چہروں پر پڑے ہوئے نقاب اڑا رہی تھی اور ہماری گھوڑیاں سج سج گھنے جنگل کے تنگ اور کچے راستے پر قدم رکھ رہی تھیں۔ میں نے لگامیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں اور جنگل کی خوشبو اور اس کے جادو سے لطف اندوز ہوتی سب سے پیچھے چل رہی تھی کوکہ احمد جلال کی بیوی نے کئی مرتبہ مجھ سے رفتار بڑھانے کو کہا لیکن میں جنگل کے سحر میں اسیر تھی اس لیے میں نے کچھ نہ سنا، پھر جانے کس طرح میری گھوڑی سامنے کے بجائے پگڈنڈی سے پھوٹنے والی ایک دوسری پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ میں اپنے خیالوں میں گم چلتی رہی اور تب اچانک مجھے صبارفتار گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔لمحوں کا جادو ٹوٹ گیا۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔اگر یہ وحشی افاغنہ میں سے کوئی ہوا تو؟

اتنی دیر میں سوار میرے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اس نے تنگ راستے پر مجھے دیکھ کر اپنے رہوار کی باگیں کھینچیں اور کھینچتا ہی چلا گیا، اب ہم ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور عالم حیرت میں تھے۔اس لمحے میری عمر بائیس برس کے لگ بھگ تھی اور میں نے بہت سے مرد دیکھے تھے۔ اپنے سگے بھائی، اپنا کوکہ، اپنے عم زاد، اس کے علاوہ میں نے چلمنوں کے پیچھے سے اور نقاب کی اوٹ سے بہت سے مغل، ترک اور راجپوت سرداروں کو دیکھا تھا اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ میں نے اپنے شوہر خان ناصرالدین عالی کے ساتھ دو برس گزارے تھے، اور خان ناصرالدین نہ صرف یہ کہ ظل سبحانی کی افواج میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھا بلکہ اس جیسے خوش قامت جوانِ رعنا اور عاشق شوہر عورتوں کو ذرا کم نصیب ہوتے ہیں۔

لیکن اس لمحے میں جانے کیا بات تھی، شاید یہ تقدیر کا کھیل تھا کہ ہم اپنے اپنے رہواروں پر سوار، تصویر بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے اسے آگے جانے کا راستہ نہ دیا میں نے اپنا رہوار آگے نہ بڑھایا۔ ہوا میرا نقاب اڑاتی رہی اور جنگل پرندوں کی

آواز سے گونجتا رہا اور ہمارا وجود پھولوں کی خوشبو سے سرشار ہوتا رہا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا، کچھ نہ پوچھا، میں نے بھی اسے یہ نہ بتایا کہ احمد جلال خاں میرا کوکہ ہے اور میں نے اسے یہ بھی نہ بتایا کہ میرا نام یاقوتیہ بلخی ہے اور میں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں خان ناصرالدین عالی کے گھر کی عزت ہوں۔ ہم عورتیں اپنا دل ہارتی ہیں تو بولنا بھول جاتی ہیں چپ رہتی ہیں، سو میں بھی چپ رہی۔

پھر میں نے دوسری پگڈنڈی کی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپ سنی اور کوکہ احمد جلال کی ایک کنیز کی آواز سنی جو گھبرائی ہوئی مجھے پکار رہی تھی۔ میں نے متوحش ہو کر اسے دیکھا، اس نے اپنے گھوڑے کو چلنے کا اشارہ کیا اور میں نے اسے راستہ دیا، وہ راستہ ملتے ہی ہوا ہو گیا، میں پھر بھی وہیں کھڑی رہی اور اس کا قامت میری نگاہوں میں کھنچا رہا۔

اس کے بعد میں نے کئی بار اپنے حجرے کے دریچے سے اسے جنگل میں جانے والے راستے پر آتے جاتے دیکھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کی تلاش میں سرگرداں ہے، وہ اس کی راہ اپنے حجرے کے دریچے سے دیکھتی ہے۔ پھر یوں ہوا کہ ہم دوبارہ جنگل میں ملے۔ اس مرتبہ اس نے مجھ سے کلام کیا اور تب مجھے پہلی مرتبہ اس کا نام معلوم ہوا۔

سعد نوبختی شیر خانی افواج میں سردار تھا اور اسے شاعری سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی تھی، بلکہ مجھے تو وہ سپاہی کم اور شاعر زیادہ محسوس ہوا۔ یوں بھی شاہی درباروں سے منصب اور جاگیریں حاصل کرنے کے لیے صرف فن سپہ گری میں طاق ہونا کافی نہ تھا' شاعری، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، علمِ کلام اور دیگر علوم پر دسترس ضروری تھی۔ سعد محض اچھا شمشیر زن، شہسوار اور تیر انداز نہ تھا، وہ شاعری میں طاق، راگ راگنیوں سے واقف، فلسفیانہ موشگافیوں میں ماہر اور ستاروں کی چال کا شناسا تھا۔

وہ مجھ پر بری طرح عاشق ہوا تھا اور میں چاہتے ہوئے بھی اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ تقدیر نے ہماری راہ پہلے سے کھوٹی کر رکھی ہے۔ میں یہ جانتی تھی کہ اگر کوکہ احمد جلال کو اس بات کی ہوا بھی لگ گئی تو وہ مجھے بندی خانے میں ڈال دے گا اور سعد کو اپنے شکاری کتوں سے نچوا دے گا۔ پھر میں سوچتی کہ اگر خان ناصرالدین کو خبر ہو گئی تو؟ لیکن سچ

تو یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں سوچتی تھی، میں صرف اتنی سی بات جانتی تھی کہ اب خان ناصرالدین کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے موت بہتر ہے۔ کیسی دلچسپ بات تھی کہ ابراہیم بن ادھم جیسے عالی مرتبت صوفی کی پرپوتی ایک اجنبی کے عشق میں دیوانی تھی۔

میں اس سے سب کچھ چھپانا چاہتی تھی لیکن تا کجے، چوتھی ملاقات میں جب میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو اس کا رنگ موی کپڑے کی طرح زرد ہو گیا۔ وہ مجھے ایک ٹک دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سعد نے اس شام جنگل میں پہلی ملاقات سے لے کر چوتھی ملاقات تک نہ جانے کتنے خوبصورت خواب دیکھے ہوں گے لیکن میرے ایک جملے نے اس کے تمام خوابوں کو اندھا کر دیا تھا۔ اس دن جب وہ مجھ سے رخصت ہوا تو اس کے چہرے کی شادابی رخصت ہو چکی تھی۔

کئی مہینے گزر گئے، پھر خبر آئی کہ خان ناصرالدین عالی مجھے اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے رہتاس پہنچنے والا ہے۔ اگر یہ خبر مجھے پہلے ملی ہوتی تو میں خوشی سے رقص کرنے لگتی لیکن اب یہ خبر مجھے اپنی موت کا فرمان معلوم ہو رہی تھی۔ میں ان دنوں اور ان راتوں کے بارے میں کیا بتاؤں جو میں نے سعد کے ہجر میں اور خان ناصرالدین کے قرب کے خوف میں بسر کیں۔

پھر وہ رات بھی آئی جب خان ناصرالدین میری خواب گاہ میں تھا۔ وہ میرا عاشق تھا، میری ایک ایک ادا پر اس کی جان جاتی تھی، وہ طویل جدائی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی سرد مہری کو چھپانا چاہا اور اپنے ٹھٹھرے ہوئے جذبوں پر مصنوعی گرمجوشی کی نقاب ڈالنی چاہی لیکن عاشق کا دل ایسا آئینہ ہے جس پر گرد کا ایک ذرہ بھی چھپ نہیں سکتا، خان ناصرالدین نے میری بے التفاتی کو فوراً محسوس کر لیا۔ اس نے ہزار طرح سے میری سرد مہری کا سبب جاننا چاہا اور میں نے ایک ہزار ایک بہانے تراشے

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ پھر مجھے ایک کنیز کے ذریعے سعد کا پیغام ملا، یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی کنیز کو پیغامبر بنایا تھا۔ میں اس راز میں کسی تیسرے کی شرکت سے لرز گئی لیکن شاید وہ بھی مجبور تھا، اسے علم تھا کہ میری رخصت کے دن قریب ہیں اور وہ مجھ

سے آخری بار ملنے کے لیے بے تاب تھا۔

دوسرے دن میں نے کوکہ احمد جلال خان کی بیوی سے جنگل کی سیر کو چلنے کی فرمائش کی، اس دن اس کی طبیعت قدرے خراب تھی لیکن وہ یہ جانتی تھی کہ اب میں رہتاس میں چند ہی دن کی مہمان ہوں، اس لیے اس نے مجھ سے کہا کہ میں کنیزوں کو ہمراہ لے جاؤں میں تو دل سے یہی چاہتی تھی کہ وہ ساتھ نہ جائے۔

خان ناصرالدین اس دن صبح سے ہی کہیں گیا ہوا تھا اور رات سے پہلے اسے واپس نہیں آنا تھا، میں اس کی طرف سے مطمئن تھی، سو میں نے سنگھار کیا اور سعد سے رخصت ہونے چلی۔ کنیزوں کو چکما دینا کچھ بہت زیادہ مشکل نہ تھا۔ گھنے جنگل میں کھویا جانا کوئی ایسی خاص بات نہیں۔

سعد جنگل میں ایک چشمے کے کنارے میرا انتظار کر رہا تھا، اس نے مجھے دیکھا تو بے تاب ہو گیا، ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے، پھر کہاں شیر خان کا سردار سعد نوبختی اور کہاں ہمایونی افواج کے سردار خان ناصرالدین خان عالی کی بیوی یا قوتیہ بلخی ہم دریا کے دو کنارے تھے' ہم آسمان اور زمین تھے جو کبھی نہیں مل سکتے تھے۔

سننے والوں کو وقت کے جبر اور اس کے ظلم اور اس کی کینہ توزی سے ہمیشہ خوفزدہ رہنا چاہیے' وہ ہمیں چپکے سے اچانک کسی ایسی جگہ گھیر لیتا ہے جہاں فرار کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔

تو یوں ہوا کہ اس شام وقت نے مجھ پر اور سعد پر اپنا جال پھینکا اور ہم اس میں پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ دائمی جدائی کا الم اور زندگی بھر ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکنے کے عذاب سے ہمارے دل ٹکڑے ٹکڑے تھے۔ ہمارے چہرے آنسوؤں سے تر تھے اور ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک دوسرے میں اس طرح گم تھے کہ ہمیں کسی کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔

ہم تو اس وقت چونکے جب خان ناصرالدین ہمارے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے دہل کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور اس کا چہرہ طیش، نفرت اور غم سے بھیانک ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کے دو چشمے پھوٹ رہے تھے اور ان کا رخ میری طرف

تھا۔ میں سر سے پیر تک کانپ گئی۔ سعد نے آہستگی سے مجھے اپنے سے جدا کیا اور اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔ خان ناصرالدین منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر اپنے گھوڑے سے اترا اور اب میرے سامنے دو مرد تھے جو میری خاطر ایک دوسرے کا سر قلم کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ خان ناصرالدین جھپٹ کر سعد پر حملہ آور ہوا، سعد نے اس کے وار کو بڑے سلیقے سے اپنی تلوار پر روکا اور پھر دونوں کی تلواریں بجلی کی طرح کوندنے لگیں۔

میں ہار سنگھار کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، میری ٹانگوں کا دم نکل چکا تھا اور ذہن سو گیا تھا، پھر میں نے سعد کے شانے سے پھوٹتی ہوئی خون کی دھار دیکھی، خان ناصرالدین کی تلوار نے اس کا شانہ چاٹ لیا تھا۔ لمحے گزرتے رہے، جانے کتنی صدیاں، ان دونوں کی تلواریں ایک دوسرے کو چھوتی رہیں۔ خون ان دونوں کے بدن سے پھوٹتا رہا، بہتا رہا، پھر میں نے سعد کو زمین پر گرتے دیکھا، زخموں سے چور خان ناصرالدین نے اس کے سینے میں تلوار اتار دی اور لڑکھڑا کر خود بھی اس کے برابر گر گیا۔ سعد نے ان لمحوں میں اپنی بوند بوند کر کے بہتی ہوئی زندگی کو مجتمع کیا، پھر وہ اپنے ہاتھوں پر گھسٹتا ہوا ذرا آگے بڑھا، جانے کس طرح اس نے اپنی کمر میں لگا ہوا پیش قبض نکالا اور خان ناصرالدین کی گردن میں پیوست کر دیا۔ خان ناصرالدین کی گردن سے خون کا ایک فوارہ سا پھوٹا اور سعد کا چہرہ اس کے خون سے بھر گیا، سعد نے اپنے رقیب کا خون اپنے چہرے پر مل لیا تھا۔

میری سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ دم توڑتے ہوئے سعد میں اتنی بہت سی خواہش زیست کہاں سے آ گئی تھی کہ پھر اس نے پلٹ کر میری طرف بڑھنا چاہا اور تب جیسے مجھے ہوش آیا کہ میری آنکھوں کے سامنے کیا قیامت گزر گئی ہے۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں لینا چاہا تو اس نے کہا ''میرے قریب نہ آؤ یہاں سے چلی جاؤ۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم، جاؤ چلی جاؤ۔'' اس کی ڈوبتی ہوئی آواز میں، اس کی ماند پڑتی آنکھوں میں صرف ایک بات تھی، صرف ایک حکم تھا، صرف ایک التجا تھی۔ مرتے مرتے بھی اسے میری عزت عزیز تھی۔ میرا نام پیارا تھا۔

میں نے اسے دیکھا پھر میں نے خان ناصرالدین عالی کو دیکھا۔ میں نے ان

دو جوانمرگ مردوں کو دیکھا، میں نے سوچا کہ مجھے ان کے چہروں سے خون اور گرد صاف کرنی چاہیے، مجھے ان کے سروں کو اپنے زانو پر رکھنا چاہیے، مجھے ان دونوں کی لاشوں پر گریہ کرنا چاہیے۔ یہ دونوں میرا سہاگ تھے، یہ دونوں میری زندگی تھے۔ پھر میں کس طرح اپنے رہوار پر سوار ہوئی اور کس طرح کوکہ احمد جلال کی کنیزوں تک پہنچی مجھے کچھ یاد نہیں، شاید وہ میں نہیں میری پرچھائیں تھی جس نے اس شام کنیزوں کو تلاش کیا، راہ بھول جانے کا ناٹک رچایا اور ضبط کی آخری سرحدوں پر کھڑے ہو کر حویلی کا رخ کیا۔

میرے حویلی پہنچنے کے چند گھنٹوں کے بعد خان ناصرالدین کی خون گشتہ لاش حویلی پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ لاش سعد کی بھی مل گئی تھی اور شیر خانی افواج کے حوالے کر دی گئی تھی ہر شخص حیران تھا کہ سعد اور خان ناصرالدین کا جنگل کے اس حصے میں سامنا کس طرح ہوا اور ہوا تو وہ کیا بات تھی کہ جس کی خاطر دونوں اپنی جان سے گئے۔

میں اپنے سہاگ کے سوگ میں تھی اور وقت میری گھات میں تھا۔

مجھے سعد کا پہلا اور آخری پیغام پہنچانے والی کنیز کا ظرف بہت کم تھا وہ اس راز کو اپنے سینے میں دفن نہ کر سکی۔ ایک رات جب وہ کوکہ احمد جلال کی خواب گاہ میں تھی، شب بسری کے ساتھ ہی اس نے خان ناصرالدین عالی کی ہلاکت کا سبب کوکہ کے گوش گزار کیا۔

صبح ہوئی تو احمد جلال نے مجھے طلب کیا، میں اس کے سامنے گئی تو وہ اپنے نام کی تصویر بنا ہوا تھا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ غیظ و غضب سے سیاہ۔ اس نے نہایت درشت لہجے میں مجھ سے سعد کے بارے میں پوچھا، میں سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ یوں بھی میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی، سعد کا عشق میرے چہرے پر تحریر تھا۔ اور پھر یہ بات بھی تھی کہ میں ان چند مہینوں میں ہی زندگی سے عاجز آ چکی تھی۔ سعد نہیں رہا تھا اور زندگی کا اور کائنات کا تمام حسن اس کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا، خان ناصرالدین کی مجرم میں تھی، غلطی محض میری تھی، قصور سراسر میرا تھا، یا پھر یوں ہے کہ قصور میرا نہیں تھا ان لمحوں کا تھا جب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دیکھتے رہ گئے تھے، تقدیر سے اور وقت سے بھلا کیسے فرار ہے۔

کوکہ احمد جلال نے زہریلی اور نفرت بھری نگاہوں سے چند لمحوں تک مجھے دیکھا اور پھر واپس جانے کا اشارہ کیا، میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مجھے بندی خانے بھجوانے کے بجائے واپس مجھے میرے حجرے میں کیوں بھیج رہا ہے، وہ مجھے اتنے بڑے اور بھیانک جرم کی سزا کیوں نہیں دیتا۔

میں اپنے حجرے کے دریچے میں کھڑی جنگل کو دیکھتی تھی اور اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ ایک کنیز آئی، اس کے ہاتھوں میں چاندی کی کشتی تھی اور اس میں چاندی کا ایک خوبصورت جڑاؤ پیالہ تھا اور اور پیالے میں ارغوانی رنگ کا شربت تھا۔ یہ شربت میرے عزیز از جان کوکہ نے بہ طور خاص میرے لیے بھیجا تھا اور کنیز کے کہنے کے مطابق مفرح قلب تھا۔

عذاب ناک زندگی کا انجام اس قدر جلد اور اتنا دلکش، یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ میں نے اپنے عزیز از جان کوکہ کا بھیجا ہوا مفرح قلب شربت نوش کیا اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔

وہ آخری جملہ بڑے ڈرامائی انداز میں ادا کرتی ہے، اسٹیج پر کام کرنے والے منجھے ہوئے اداکاروں کی طرح اظہار ممنونیت کے لیے اپنا سر خم کرتی ہے اور کسی چھل پائی کی طرح اچانک غائب ہو جاتی ہے۔

روشنیاں بجھ گئی ہیں، پردے گرا دیے گئے ہیں، اداکار پسِ پردہ چلے گئے ہیں۔ وقت کی لہروں پر موجود سے معدوم کا رقص کرتے ہوئے۔ پیچھے اور پیچھے، پچاس برس، پانچ سو برس، پانچ ہزار برس Big Bang سے بھی پیچھے۔

یاقوتیہ بلخی، سعد نوبختی، بہروز پور ہرمز، یوسف نوبختی، سب چلے گئے ہیں۔ تمام سائے، سارے ہیولے معدوم ہو گئے ہیں۔ ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں۔ فراق، وصال، موت، زندگی، سب رائگانی ہے۔ تمام ہجرتیں رائگانی ہیں، عشق کے تمام مرحلے رائگانی ہیں۔ ہجرت اور عشق سے پھوٹنے والے تعصبات اور رقابتیں رائگانی ہیں، اول فنا، آخر فنا۔ ہاتھ سے بیٹھا گھڑے کھلونے، پاؤں سے توڑے جائے۔

اس ناٹک کے بارے میں اور دوسرے تمام ناٹکوں کے بارے میں سامعین اور

ناظرین کے تاثرات جانے کیا ہیں؟

لیکن یہ لوگ اپنے سامعین اور ناظرین تو اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ یہاں تو بس میں ہوں اور میری پرچھائیں ہے۔ ریت میں دھنسا ہوا جہاز ہے اور اس کی پرچھائیں ہے۔ ہم دونوں اور ہماری پرچھائیاں ایک دوسرے سے کیسی مماثلت رکھتی ہیں۔ میں بھی ایک بھٹکا ہوا جہاز ہوں جو اپنے گھر کا راستہ بھول کر اپنے وجود کی بے جہتی میں دھنس گیا ہے اور جس طرح لوگ اس جہاز کا تماشا دیکھنے آتے ہیں، اسی طرح میں اور مجھ جیسے دوسرے بھی، دوسروں کے لیے ایک تماشا، ایک عجوبہ ہیں۔

○○

آنکھوں کے دیدبان

رات کی آنکھیں نمناک ہیں اور ان آنکھوں کی نمی شبنم بن کر شیشے کی دیوار پر لکیریں کھینچ رہی ہے۔ یہ لکیریں آپس میں گڈمڈ ہوکر کہیں کشتیاں بن گئی ہیں اور کہیں آبی پرندے کشتیوں اور آبی پرندوں کے اس ہجوم میں کہیں کہیں سمندر جھلک رہا ہے۔ یہ سمندر شفاف دیوار کے اس پار دور تک سویا ہوا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سوتا ہوا سمندر کروٹ بدل کر اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کی رات بھی ایسی ہی رات ہے۔ آج شام ہی سے سمندر اپنی کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کررہا ہے لیکن نہ جانے کیا چیز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ میں بہت دیر سے یہاں بیٹھی سمندر کو دیکھ رہی ہوں اور آج پر ہی کیا موقوف ہے میں تو ہر شام یہاں آبیٹھتی ہوں اور اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا جب وہ تمام زنجیریں توڑ کر اٹھ بیٹھے گا اور میرے پاس چلا آئے گا۔ میں ایک ایسی ہی رات کا نہ جانے کتنی راتوں سے انتظار کررہی ہوں۔ یہ راتیں جو پھیل کر صدیاں بن گئی ہیں اور سمٹی ہیں تو عذاب کا ایک جہنمی لمحہ۔

سمندر میں دور بہت دور کھڑے ہوئے جہازوں پر جو روشنی ہے وہ میری آنکھوں کے الاؤ ہیں جن میں انتظار کے تناور درختوں کی بریدہ شاخیں جل رہی ہیں۔ میں یہ بات جان گئی ہوں کہ میری آنکھیں یہاں ہیں اور روشن الاؤ میں، سمندر کی لہروں میں اور ستاروں کے قلب میں اور میری یہ تمام آنکھیں جو ان گنت ہیں مجھے شیشے کی اس دیوار کے پیچھے بیٹھا دیکھ رہی ہیں۔

تم نے کبھی انتظار کو انتظار کے مقابل دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا تو مجھے دیکھو، میری آنکھوں کو دیکھو جن میں تمہیں اپنی آنکھیں نظر آئیں گی۔ لیکن اگر یہ تمہاری آنکھیں ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کہاں ہیں؟ یہ فیصلہ کون کرے گا؟ یہ فیصلہ میں کروں گی یا سمندر؟ میری آنکھوں کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ ریت کے ذرّے کریں گے یا ہوا کے جھونکے؟ یا پھر رات کے وہ آنسو جو کشتیوں اور آبی پرندوں کی شکل میں شیشے کی دیوار پر بہ رہے ہیں، یہ فیصلہ آخر کون کرے گا؟

میں تمہیں بتاتی ہوں یہ فیصلہ کوئی نہیں کرے گا اس لیے کہ یہاں کون ہے جو دوسروں کے لیے حکم بن سکے۔ یہاں کی ہر شے خود مدعی ہے، خود مدعا علیہ اور خود منصف۔ وجود کی عدالت تنہائی کی عدالت ہے۔

کوئی حتمی اور آخری فیصلہ سننے کے لیے میں حجرۂ ذات میں جھانکتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ سفید محرابوں اور گنبد نما چھت والے اس حجرے میں انسانوں کا ہجوم ہے اور اس ہجوم کے شانوں سے شانے ملائے خداوندوں اور دیوتاؤں کے پرے ہیں اور سب سے آگے اور سب سے الگ خداوند خدا ہے جو داناؤں کے کہنے کے مطابق محرکِ اوّل ہے اور انہی کے کہنے کے مطابق خود حرکت نہیں کرتا۔

میں جان لیتی ہوں کہ یہ تنہائی کی عدالت ہے۔ یہ جان کر مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے، میں اور مجھ جیسے دوسرے کتنے عیار ہیں کہ تنہائی کی عدالت میں بھی ہجوم میں اور حرکت میں ہیں، اور دوسری طرف خداوند خدا ہے، جسے فرض کیا گیا، پھر اپنے آپ پر فضیلت دی گئی اور محرکِ اول قرار دے کے حرکت سے محروم کیا گیا اور اس طرح اسے یکسر تنہا کر دیا گیا۔

حجرۂ ذات کے فرش پر لمحوں کا ایندھن دہک رہا ہے اور اس کا پرتو وجود کی دیواروں پر عجب سرّیت آمیز نقوش بناتا اور بگاڑتا ہے۔ دھوئیں کی چادر ہے اور اس پر مدھم سی روشنی کی تحریر ہے۔ روشنی کی یہ تحریر ان شکلوں کو واضح کرتی ہے جو اس گنبد نما چھت میں آویزاں ہیں ان شکلوں کو پہننے والوں میں سے کچھ الٹے لٹک رہے ہیں اور کچھ سیدھے، کچھ نے فرشتوں سے پرِ مستعار لیے ہیں اور طاقتِ پرواز کی تلاش میں ہیں اور ہاں وہاں بعض دراز

داڑھیوں والے بھی ہیں جو اپنے ہاتھوں میں دانائی کے موتی لیے بیٹھے ہیں اور انہیں لوح گل پر ٹانکتے چلے جاتے ہیں ہیں۔ لمحوں کے دہکتے ہوئے ایندھن کا پرتو ان شکلوں کو کبھی اجاگر کرتا ہے اور کبھی تمام مناظر دھندلا جاتے ہیں لیکن خداوند خدا کا وجود ان سب سے الگ ہے، ہر منظر سے جدا۔ اس لمحے مجھے یونانی یاد آتے ہیں کہ وہ مجھ سے اور میرے لوگوں سے زیادہ خدا دوست تھے۔ وہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اپنی ہی خامیوں اور اپنی ہی خوبیوں کے سانچے میں ڈھالتے تھے اور انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔

میں خداوند خدا کے چہرے پر تنہائی کی اذیت ناک تحریر دیکھتی ہوں اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے مہیب اور تنہا سناٹے کی گونج سنتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے ایک آئینہ رکھ دوں اور اس طرح وہ جس نے کبھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھے اور اپنی دوسراہت سے باتیں کرے، لیکن جب میں اس کے سامنے آئینہ رکھنا چاہتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ حجرۂ ذات سراب ہے اور اس کی گنبد نما چھت پر بنی ہوئی اشکال بھی محض خیال کا پھیلایا ہوا جال ہیں اور حقیقت تو کچھ یوں ہے کہ میرے سامنے شیشے کی دیوار ہے اور اس کے پار سمندر ہے اور تاروں بھرا آسمان ہے اور ریت کے ان گنت ذرّے ہیں اور میری پشت پر پتھر کی دیوار ہے جو ریت کے ان گنت ذروں کو سمندر کے پانی سے گوندھ کر بنائی گئی ہے اور اس پر ستاروں جیسی خنک روشنی دینے والا دودھیا بلب روشن ہے۔ پتھر کی اس دیوار میں ایک طاق ہے، اس طاق میں ایک گھڑی رکھی ہے جس کے ڈائل کا رنگ سیاہ ہے جس کے ہندسے سنہری رنگ کے ہیں اور ان ہندسوں کا بوسہ لینے والی سوئیاں بھی سنہری ہیں۔

میں یہاں بیٹھ کر سمندر کا انتظار کرتی ہوں تو حرکت کرتی ہوئی یہ سوئیاں سرگوشی کرتی ہیں۔ ان سرگوشیوں نے مجھے بتایا ہے کہ فراق، وصال کی دوسری جہت ہے اور کائنات میں انتظار کہیں نہیں ہے اور یہ بھی کہ وقت لامحدود ہے اور اس کے ساتھ ہی محدود بھی کیونکہ وہ کائنات کی مانند ایک دائرہ ہے جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا اور نہ کہیں ختم ہوتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وقت کو خطِ مستقیم میں سفر کرنے والی غیر محسوس اور نامعلوم شے سمجھتے ہیں

اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وقت گردش میں ہے اور اس گردش نے ایک دائرے کو جنم دیا ہے اور دائرہ جب مکمل ہو جاتا ہے تو پھر اس کے بارے میں کون بتا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز کہاں ہے اور نقطۂ انجام کہاں۔ وقت بھی کبھی نہیں گزرتا ہمیشہ لوٹ آتا ہے۔ کیونکہ گردش کرنے والی چیز اپنے آغاز کی طرف لوٹتی ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ آغاز ہی انجام بھی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وقت اپنے آغاز کی طرف لوٹتا ہے۔ بس یوں ہے کہ وقت گردش میں ہے اور ہم سب اس گردش کا ایک حصہ ہیں۔ وقت کائنات کے دائرے میں گردش کرنے والی دھول ہے جو ہمارے سروں پر جمتی ہے تو بڑھاپا بن جاتی ہے اور ہمارے بدن سے لپٹتی ہے تو ہم مٹی میں مل جاتے ہیں۔ وقت خاک ہے اور باد ہے، وقت خدا ہے اور کائنات ہے، وقت سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

میں وقت کو شکل دینا چاہتی ہوں، اس کی تجسیم چاہتی ہوں اور جب یہ خواہش مجھے ہلاک کرنے لگتی ہے تو میں کائنات کے تمام رنگ اپنی ہتھیلی پر سجا لیتی ہوں اور مشتری کی انگلی سے وقت کے خدوخال کھینچنا چاہتی ہوں لیکن وقت کی فراخی، وسعت اور اسکی ازلیت اور ابدیت میری آنکھوں کی پتلیوں پر اپنی کوئی شبیہ، اپنی کوئی تصور نہیں بننے دیتی۔ میں سوچتی ہوں کہ وقت کا تصور کس طرح قائم کروں کہ گویائی اس کے نقش و نگار بیان نہیں کرسکتی اور بینائی اس کے دیدار سے قاصر ہے۔

وقت نے کائنات میں عجب بساط بچھائی ہے، اس کے کھیل کا انداز نرالا ہے، اس کے مہروں کا کوئی رنگ نہیں، ان کی کوئی شکل نہیں اور اس کا کوئی حریف نہیں، وہ خود اپنا مقابل ہے اور اس کی غیر مرئی انگلیاں کائنات کی بساط کے مہروں کو گردش میں لاتی ہیں، کبھی وہ اپنے آپ سے جیت جاتا ہے اور کبھی خود کو آن کی آن میں شہ مات دے دیتا ہے۔ یہ بھی اس کے کھیل کا ایک حصہ ہے کہ میں اب اپنے سامنے یوں بیٹھی ہوں جیسے آئینہ آئینے کا سامنا کرے۔ میں سامنے والے اپنے وجود کو چھوتی ہوں لیکن وہاں کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ خواب درخواب ہے اور سراب اندر سراب، خلا ہے، کائنات بھی معدوم ہے اور سمندر کی لہریں جو مجھے نظر آرہی ہیں وہ بھی کہیں نہیں ہیں۔ میری آنکھیں جن

چیزوں کو دیکھ رہی ہیں میرے ہاتھ انہیں چھونے پر قادر نہیں۔ میں ہی کائنات ہوں اور میں ہی رنگ، میں ہی آگ ہوں اور میں ہی راکھ، میں کبھی اپنے آپ کو سمندر کہہ کر یاد کرتی ہوں اور کبھی اپنی ذات کو بادبان یا صحرا کے نام سے پکارتی ہوں۔ کائنات کے دائرے میں صرف میری ہی آواز گونجتی ہے لیکن پھر یوں بھی ہے کہ میری آواز جو کائنات کے دائرے میں محیط ہے سمٹ کر کبھی سانس کی سرسراہٹ بن جاتی ہے اور کبھی تیز ہوا کی سنسناہٹ۔

بادبانوں کے دامن میں تیز ہوا کی سنسناہٹ بھر جائے تو جہاز لنگر اٹھاتے ہیں اور ہزار ہا جہاز دس سالہ جنگ کی طرف سفر کرتے ہیں اور ہاں یہی بادبان جب سوگ کا لبادہ اتارنا بھول جائیں تو سمندر کا نام بدل جاتا ہے۔ مجھے ان بادبانوں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں ان کے رحم و کرم پر کہیں کا سفر کرنا نہیں چاہتی۔ ان بادبانوں نے انسانوں کو بہت دکھ دیئے ہیں، بہت رسوا کیا ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ان سے مفر نہیں۔

مفر تو اس بات سے بھی نہیں کہ میں جو اپنے روبرو تھی ایک بار پھر گم ہوگئی ہوں، اور حصارِ ذات میں آگئی ہوں۔ جانے والے اپنے اپنے تیر، تبر، تلواریں اور تیغے لے کر واپس جا چکے ہیں، شاید انہوں نے سپر ڈال دی لیکن اب جب کہ ان کے خیمے اور ان کے جہاز مجھے نظر نہیں آرہے، مجھے اس ٹروجن ہارس سے ڈر لگ رہا ہے جسے میں اپنے ہاتھوں حصار کے اندر لائی ہوں۔ وجود کی شہر پناہ پر آنکھوں کے دیدبان پہرا دیتے ہیں لیکن جب سحر ہوگی اور شہر پناہ کے بنے ہوئے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور قلعۂ ذات پر نگہبانی کے لیے معمورانا کا دیوتا اونگھ جائے گا تو وجود کہاں پناہ چاہے گا؟

مجھے کائنات کی قلمرو نہیں چاہیے۔ میں تو منتظر آنکھوں والی ہوں اور مجھے سمندر کا انتظار ہے لیکن وہ مجھ تک نہیں آتا۔ وہ اپنی کہنیوں کے بل اٹھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور پھر تھک کر لیٹ جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اٹھوں اور اس کی طرف سفر کروں لیکن جب میں اس کی طرف چلنا چاہتی ہوں تو میرے پیر نہیں اٹھتے اور تب مجھے یاد آتا ہے کہ میرا انچلا دھڑ تو گرد باد کا ہے اور مجھے شفاف دیواروں والے اس حصار میں قید کردیا گیا ہے۔ باہر دروازے پر میری سیاہ آنکھیں پہرا دیتی ہیں اور ان کی چمک میرے

اعصاب کو سلا دیتی ہے، تب میں سوچتی ہوں کہ مجھے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب سمندر کی تھکن اتر جائے اور وہ میرے پاس چلا آئے۔

تو میری روداد کچھ یوں ہے کہ میں ہر رات اپنے گرد باد کے قدموں سے اٹھ کر یہاں اس شفاف دیوار تک آتی ہوں اور سمندر کو دیکھتی ہوں۔ میں حصار ذات سے باہر کیسے آؤں کہ میری آنکھیں میرے دیدبان ہیں۔

OO

پانیوں میں سراب

لوحِ مزار پر ''عصمت پناہ'' پڑھ کر میں بے ساختہ ہنسی اور میں نے اظفر سے کہا۔
''میری قبر پر بھی ''عصمت پناہ'' کندہ کروا دینا۔''

اظفر بے معنی سے انداز میں مسکرایا اور ہم قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو احسن نے اچانک ''عصمت پناہ'' کی ترکیب کا ذکر چھیڑ دیا اور بات تاریخ کے مختلف ادوار میں عصمت کے معیار تک پہنچی۔ الف لیلہ کا شہر یار، بے وفا شہزادیاں اور ان کی خلوتوں میں بار پانے والے حبشی غلام، بغداد کے گلی کوچے، نیپلز اور فلورنس کی حویلیاں اور باغات، ''ڈی کیمرون'' کی پامپینا، نی نیتی اور میڈیلینی، دل ہتھیلی پر رکھ کر پھرنے والے عشاق اور شوہروں کے پیٹھ پھیرتے ہی خواب گاہوں کے در کھول دینے والی نازنینیں۔

میں نے موضوع بدلنا چاہا لیکن بات سے بات نکلتی چلی گئی اور پھر اس نکتے پر بحث ہونے لگی کہ عصمت و عفت کا تصور مطلق ہے یا اضافی؟ درمیان میں لطیفے اور چٹکلے بھی بیان ہو رہے تھے اور پھر Chastity Belt کا ذکر نکل آیا۔

احسن نے فوراً ہی صلیبی جنگ پر جانے والے ایک ایسے مسیحی سورما کا قصہ چھیڑ دیا جس نے جنگ پر روانگی سے پہلے اپنی بیوی کو Chastity Belt پہنوائی اور چابی اپنے عزیز ترین دوست کے حوالے کر گیا۔ اصولی طور پر چابی اسے اپنے ساتھ لے جانی چاہیے تھی لیکن وہ ایک منصف مزاج آدمی تھا اور اس لیے اس نے چابی دوست کے حوالے کر دی

تھی کہ اگر وہ جنگ میں مارا جائے تو چابی اس کی بیوی کے سپرد کردی جائے تا کہ وہ جس سے چاہے شادی کر سکے۔ ابھی وہ سورما کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس کا دوست گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور کہنے لگا ''تم مجھے غلطی سے کوئی دوسری چابی دے آئے ہو، یہ Chastity Belt کی چابی تو نہیں ہے۔''

ایک قصہ کسی شہزادی کا تھا جس نے اپنے محبوب شوہر کی جنگ پر روانگی سے پہلے Chastity Belt پہن کر چابی شوہر کے سامنے ہی ایک تالاب میں پھینک دی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب وہ کسی دوسرے مرد کے عشق میں گرفتار ہوئی تو اس نے اپنی ساری دولت ان غوطہ خوروں کو دے ڈالی جو تلاشِ بسیار کے باوجود چابی کی تلاش میں ناکام رہے تھے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے قصے اس وقت تک بیان ہوتے رہے جب تک کہ ہم کنجھر جھیل نہ پہنچ گئے۔

اور اب ہم پانیوں پر تھے۔ سوناٹاتی دھوپ جھیل کے پگھلے کانچ جیسے سبز پانی پر بچھی تھی۔ تہ میں آبی پودے لہروں کے ساتھ ہلکورے لے لیتے تھے۔ اور سبز کائی ان سے لپٹی ہوئی تھی۔ سفید جل کووں کی ایک ڈار پھڑ پھڑاتی اتری اور پانیوں پر سفر کرنے لگی۔ کشتی آگے بڑھ رہی تھی، زمینی منظر دور ہوتے جا رہے تھے۔ پیڑ، ان پیڑوں کے سائے میں بیٹھے انسان، بڑے بڑے ٹرک جو جھیل کے کنارے مستعدی سے دھوئے جا رہے تھے، اب دوری کے سبب ہیولے لگ رہے تھے۔

میرے عقب میں آواز ہوئی تو میں نے گردن گھما کر دیکھا کنارے کے قریب اظفر نے ایک مچھلی پکڑی تھی اور اب وہی کشتی کے فرش پر تڑپ رہی تھی۔ یہ اسی کے تڑپنے پھڑکنے کی آواز تھی۔

''اظفر پلیز، اسے پانی میں پھینک دو۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''بمشکل تمام ایک تو ہاتھ آئی ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ اسے واپس پھینک دوں، جواب نہیں ہے تمہارا بھی'' اظفر کی آنکھوں میں مچھلی کو تڑپتے دیکھ کر لذت کی ایک لکیر کھنچ گئی۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے یوسف کی طرف دیکھا اور اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

صفیہ احسن نے تھرماس کھول کر مگوں میں کافی انڈیلنی شروع کی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ سموسے ٹھنڈے ہو گئے تھے لیکن گرما گرم کافی کے ساتھ وہ بھی لطف دے رہے تھے۔

کافی گھونٹ گھونٹ پیے جانے کے لیے ہے۔ سموسے لقمہ لقمہ کر کے کھائے جانے کے لیے ہیں اور میں اس لیے ہوں کہ دن میں ہجر کا عذاب مجھے پانی کرے اور میں اس لیے ہوں کہ رات آئے تو میرے مجازی خدا کے بدن کی سرشاری کا گدھ میرے وجود کو نوچ کر کے کھائے۔ مجھ سے اچھی تو یہ کافی ٹھہری جو ایک لمحے میں پی لی جاتی ہے اور معدوم ہو جاتی ہے، مجھ سے بہتر سموسے کا یہ لقمہ ہے جسے صرف ایک مرتبہ چبایا جاتا ہے اور پھر نجات پالیتا ہے۔ ہر رات مجھے چباتی ہے اور میں ختم نہیں ہوتی۔ ہر دن مجھے پیتا ہے اور میں موجود رہتی ہوں۔

کافی پیتے ہوئے احسن نے گنگنانا شروع کر دیا ''اکیلے مت جیو رادھے جمنا کے تیر۔'' میں نے لرز کر اسے دیکھا۔ تم دلوں کے بھید کس طرح جانتے ہو، سنا ہے دلوں کا بھید تو بس خدا جانتا ہے اور کون جانے کہ جاننے یا نہ جاننے کے مرتبے پر فائز موجود ہے یا معدوم۔

احسن کی آواز پانیوں پر بگولے کی طرح چکراتی ہوئی اٹھی۔ ''اکیلے مت جیو رادھے، اکیلے مت جیو رادھے۔'' کنجھر جھیل کا پانی اترنے لگا۔ زمین کی گہرائیوں میں سمانے لگا اور آنکھ کی پتلی پر جمنا کا گہرا سبز پانی پھیل گیا، گہرائیوں میں اترتا ہوا، وسعتوں میں پھیلا ہوا۔

میں اکیلی تو نہ گئی تھی، میں تنہا تو نہ گئی تھی۔ مجھے تو خود اظفر تنہا چھوڑ گیا تھا۔

بمبئی میں کئی لوگوں سے ملاقاتیں ضروری تھیں ورنہ جس بزنس ٹور پر وہ گیا تھا، وہ ناکام ہو جاتا۔ وہ دو دن کے لیے گیا تھا، پھر اس کا فون آیا کہ اسے ابھی دو دن اور لگیں گے۔

میں اور یوسف دلّی میں گھومتے رہے، میں اس سے اظفر کی بے اعتنائیوں کا ذکر کرتی رہی اور وہ سنتا رہا۔ میں نے اس سے کہا صرف روپیا ہی تو کوئی چیز نہیں ہوتا، سب سے

بڑی چیز محبت ہے، دوسرا ہت ہے جس کے لیے اظفر کے پاس وقت نہیں۔ بیوی، بچے اور رشتے دار یہ سب ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل مسئلہ روپیا ہے اور مزید روپیا۔

میرا ذہنی سفر خوابوں سے شروع ہو کر کتابوں پر ختم ہوتا تھا۔ روپے سے کتابیں تو خریدی جا سکتی تھیں لیکن خواب کسی بازار میں نہیں بکتے تھے اور سکۂ رائج الوقت سے خریدے نہیں جا سکتے تھے۔ پھر میں اتنا بہت سارو پیا لے کر کیا کرتی؟ ہمارا مستقبل محفوظ سے محفوظ تر ہو رہا تھا لیکن میں کہاں تھی؟ میری گزرتی ہوئی زندگی کے رائیگاں لمحات کا حساب کہاں تھا؟

یوسف اور اظفر بچپن کے دوست تھے، یارِ غار، مزاجوں کے تفاوت کے باوجود جب بھی انہیں موقع ملتا وہ مل بیٹھتے۔ اظفر نے باپ کی طرح تجارت اختیار کی اور لاکھوں کمائے۔ یوسف شروع ہی سے خواب دیکھتا تھا محلوں کے، قلعوں کے، حویلیوں اور بھول بھلیوں کے، وہ آرکیٹکٹ بن بیٹھا۔ سیمنٹ، بجری، پتھر، چونے، لوہے اور المونیم کے ڈھیر کو خواب نما عمارتوں میں بدل دینے والا انسان۔ یوسف کی بنائی ہوئی خواب خواب عمارتیں امریکہ، کانٹی نینٹ اور مشرق بعید کے ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں، وہ انٹرنیشنل سیلے بریٹی تھا۔

لندن میں جب میرا وقت یوسف کے ساتھ گزرا تو اس کی ذات کی ایک نئی جہت مجھ پر کھلی۔ ریت پتھر اور چونے جیسی کھردری چیزوں سے مختلف عمارتوں کی تجسیم کرنے والا اندر سے پور پور شاعر تھا۔ وہ جب عالمِ سرشاری میں ہوتا تو فنِ تعمیر پر عجیب زاویوں سے گفتگو کرتا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ کسی عمارت کی تعمیر دراصل مادے کا قلبِ ماہیت ہے۔

وہ گوتھک طرزِ تعمیر کا اور گرجا گھروں کا عاشق تھا۔ ان کی قربان گاہیں، ان کی راہداریاں، ان کے حجرۂ اعتراف، یہ تمام مقامات اس کے خیال میں کنائے تھے، انسانی نفس کی گہرائیوں، پشیمانیوں اور عیسیٰ مسیح سے قربت کے کنائے۔

وہ کہتا کہ کوئی بھی عظیم عمارت اپنے عہد کا استعارہ ہوتی ہے اور جب تک اس استعارے کو اپنے اندر سمو نہ لیا جائے، عمارت کا حسن اور اس کی سریت دیکھنے والے پر کھل

نہیں سکتی۔

ایک رات وہ میرے فلیٹ پر پی رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ چار انگل شراب اس کے معدے میں پہنچ جاتی تو اس کے اندر کا شاعر جاگ جاتا اور اس کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے۔ اس رات وہ باتیں کر رہا تھا، بورومینی کی، برنینی کی، البرٹی اور مائیکل اینجلو کی۔ وہ ان قدیم معماروں کو اپنا روحانی استاد سمجھتا تھا اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کے ایک ایک طاقچے اور ستون پر اس کی جان جاتی تھی۔

اسی گفتگو کے دوران جانے کس طرح قدیم عمارتوں اور کھنڈروں کو چاندنی رات میں دیکھنے کی بات نکل آئی تو وہ بکھر گیا ''کیسی باتیں کرتی ہو یہ محض رومانیت زدہ عورتوں اور نالائق مردوں کے کرنے کی باتیں ہیں کہ روم کے فلاں کھنڈر کو چاندنی رات میں دیکھنا چاہیے اور پیرس کا فلاں کلیسا چاندنی میں کس قدر خوبصورت لگتا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں، شالیمار باغ اور تاج محل کے سوا معدودے چند عمارتیں ہی ایسی ہیں جو چاندنی میں دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ دنیا کی تمام عظیم عمارتیں دن کے اجالے میں دیکھنے کے لیے تعمیر ہوئی ہیں۔ چڑھتے ہوئے اور سہ پہر کے سورج کی ترچھی کرنیں ان عمارتوں کے شکوہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ ایک ایک دیوار کے حسن کو اجاگر کرتی ہیں اور ایک ایک گنبد کی گولائی پر اپنے ہونٹ رکھتی ہیں۔ قلعے، محل، حویلیاں دن میں دیکھنے اور برتنے کی چیزیں ہیں۔ رات بیشتر عمارتوں کا حسن چرا لیتی ہے ان کے خدوخال کا تیکھا پن چھپا لیتی ہے۔ اگر کوئی عمارت محض چاندنی رات ہی میں دلکش نظر آتی ہے تو سمجھ لو کہ اسے بڑی عمارتوں کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

وہ تعمیرات کی اقتصادیات اور سماجیات پر بحث کرتا۔ فلاں عمارت پر کتنا صرف ہوا؟ یہ رقم کہاں سے آئی تھی؟ لگان کس علاقے کے لوگوں سے وصول کیا گیا تھا اور ان پر کتنی سختی روا رکھی گئی تھی؟ ان عمارات کو تعمیر کرنے والے آزاد مزدور تھے یا مجبور اور بے بس غلام؟ ان کے معمار اختراع پسند لوگ تھے یا لکیر کے فقیر؟ ان کے مزدور کام کرتے ہوئے گیت گایا کرتے تھے یا فضا محض ان کی پشت پر پڑنے والے چابکوں کی آواز سے گونجتی تھی؟

تعمیرات کے حوالے سے سیاست کے بارے میں اس کے خیالات بہت الجھے ہوئے اور ناپسندیدہ تھے۔ اور یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر میری اس کی خوب خوب بحث ہوتی۔ اس کا کہنا تھا کہ دنیا کی بیشتر عظیم تعمیرات مطلق العنان فرمانرواؤں کے فیصلوں اور خواہشوں کی مرہون منت ہیں اور یہ کہ جمہوریت فنِ تعمیر کو راس نہیں آ سکتی۔

یوسف نے لندن کی ایک ایک تاریخی عمارت مجھے دکھائی۔ وہ جس کسی عمارت کے ستونوں، محرابوں، دروں، دروازوں، اور طاقچوں کے بارے میں بات کرتا، جب وہ روشنی اور سائے کے حساب بتاتا، جب موسموں کے اعتبار سے ہوا کے چلنے اور دھوپ کے اترنے کا فرق بیان کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے سونی عمارتیں آباد ہوگئی ہیں، پھر سے سانس لے رہی ہیں، جیسے ابھی دھوپ فصیلوں سے ہوتی ہوئی قلعے کے قلب میں اتری ہے اور ہنری ہشتم نے اپنی مسہری پر کروٹ بدل کر صبح کا پہلا جرعہ حلق سے نیچے اتارا ہے۔

یوسف کو دوست داری کا عجیب ہنر آتا تھا۔ وہ اظفر کا دوست تھا لیکن میں جب اس سے ملتی، باتیں کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ محض میرا دوست ہے، کھرا، سچا، میرے تمام دکھ سمجھنے والا۔ اس سے ملے ہوئے کچھ دن گزر جاتے تو دل میں خلش ہوتی، اس کا خط نہ آتا تو میں پریشان ہو کر اسے خط لکھتی۔ کیسے ہو؟ کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ اتنے دنوں سے خط کیوں نہیں لکھا؟ اور پھر اس کا جواب آتا، طول طویل، دنیا جہان کی باتوں سے بھرا ہوا، میں اور اظفر دونوں اس کا خط پڑھ کر خوش ہو جاتے۔

اظفر اور میں ہندوستان کے لیے روانہ ہونے والے تھے کہ اچانک ایک شام یوسف لندن سے آ پہنچا۔ وہ کچھ دنوں ہمارے ساتھ رہنے آیا تھا۔ آرام کرنے، اپنی تھکن اتارنے۔ یوسف کو معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان جا رہے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم تینوں دلّی پہنچے اور اظفر حسب معمول مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر بمبئی چلا گیا۔ وہ مایا موہ میں پھنسا تھا اور اس جال سے نکلنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

یوسف اور میں ہم دونوں دلّی کے گلی کوچوں میں گھومتے رہے۔ قلعے، مسجدیں، مزار، دروازے، باؤلیاں، کون سی جگہ تھی جو ہم نے چھوڑی۔ کون سا ویرانہ تھا جو ہم نے آباد نہ

کیا۔ ہم جمنا گئے، ہم گھاٹ کی سیڑھیاں اترے اور ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ دوپہر کا گرم سورج ہمارے سروں پر تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی' سناٹا تھا اور شاید یہ ویسا ہی کوئی لمحہ تھا جب خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔

میں نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا، پانی جو حیات کی اصل تھا او. یوسف سے مڑ کر کچھ کہا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور ان آنکھوں میں کیا نہیں تھا۔

ہم اپنے تمام باطنی عذابوں اور ثوابوں، نادانیوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے عریاں تھے۔ آدم وحوا کی طرح جب انہوں نے شجرِ ممنوع کا پھل کھایا تھا اور برہنہ تن ہو گئے تھے، ہم دو نہ تھے، ہم جدا نہ تھے، ہم بہت دنوں سے ایک دوسرے کو دوستی کے اور خلوص کے نام پر دھوکا دیتے رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ ہر بات بدل گیا، ہر شے منقلب ہوگئی۔ نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا۔ وہ عجب گھڑی تھی، میں جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا۔

اچانک کشتی ڈگمگائی، آنکھ کی پتلی پر جو راس لیلا رچی تھی وہ معدوم ہوگئی، جمنا کا پانی چشم زدن میں غائب ہوگیا۔ ہم کنجھر جھیل کے آبِ رواں پر تھے۔ یوسف اپنا زرد سوئمنگ کاسٹیوم پہنے کشتی کے اگلے حصے میں کھڑا تھا۔ بدن کو تولتا ہوا، پھر چھپاکا ہوا اور اس کا سنہرا بدن سبز پانیوں میں اتر گیا۔ وہ ہماری کشتی کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ ہم پر پانی کے چھینٹے اڑاتا ہوا، پانی میں ڈبکی لگا کر پھر ابھرتا ہوا۔ اس کے ننگے بدن کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اس کی پسلی سے جنم لیا ہو، جیسے ہم ایک تن ہوں، زمین کا پہلا جوڑا۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں، میں ان لمحوں سے ڈرتی تھی جب اظفر میرے دل کی تحریر میرے چہرے پر پڑھ لے۔

دور زمین و آسمان ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، محض فریبِ نظر۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم دونوں بھی افق کا وہ کنارہ تھے جسے دور سے دیکھو تو محسوس ہوتا ہے کہ زمین و آسمان شیر و شکر ہو رہے ہیں اور جب نظر کا فریب درمیان سے ہٹ جاتا تو ہم زمین و آسمان تھے جو کبھی نہیں مل سکتے۔

میں زمین تھی، ٹھوس، پتھریلی، اپنی جگہ اٹل۔ اور وہ آسمان تھا، محض خلا، آنکھ کا دھوکا۔ میں عورت تھی، کمزور، بے بضاعت، میں اس کے لیے کسی بھی انتہا تک جا سکتی تھی لیکن یوسف مرد تھا، بہادر، جی دار اس لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے، بچوں کا کیا ہوگا، اظفر پر کیا گزرے گی، وہ دنیا کے تمام براعظم گھوم آیا۔ دنیا بھر کی دولت اس نے اکٹھی کر لی۔ انٹرنیشنل سیلے بریٹی بن بیٹھا لیکن متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار اس کے اندر اپنے پنجے گاڑے بیٹھی تھیں۔ وہ دوست کی لاعلمی میں اس کی بیوی میں ساجھے داری تو کر سکتا ہے لیکن اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اظفر کا سامنا کرے اور اسے ایمانداری کے ساتھ اپنے اور میرے نفس کی حالت سے آگاہ کرے اور پھر فیصلہ اس پر چھوڑ دے، مجھے معلوم تھا کہ اظفر کا فیصلہ کیا ہوگا اور یوسف بھی جانتا تھا لیکن یوسف کی اخلاقی اقدار بھی خوب تھیں، محض منافقت، محض ریاکاری۔

اور اب میں دو مردوں کے درمیان زندگی گزارتی ہوں۔ اظفر، جس کی زمین اپنی نہیں، جس کے گھر میں سیندھ لگ چکی ہے اور یوسف جو اپنی زمین کو دوسرے کے تسلط سے آزاد کراتے ہوئے ڈرتا ہے جس کی زمین کا خراج کسی دوسرے کے خزانے میں جمع ہوتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان میں ہوں۔ تلپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

''بیگم اظفر، کیا آپ جانتی ہیں کہ اس وقت آپ کہاں ہیں؟'' احسن نے اچانک ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟'' میں نے قدرے حیران ہو کر احسن کو دیکھا، وہ اظفر کے لندن آفس کا منیجر تھا اور ان دنوں اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آیا ہوا تھا۔ ''آپ اس وقت نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہی ہیں!'' اس نے مجھے مطلع کیا۔

''کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو احسن؟'' اظفر بھی اب اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''اظفر صاحب، ہم واقعی نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہے ہیں۔ یہ دراصل مون سون کا موسم ہے۔ پانی چھلک رہا ہے اس لیے دونوں کے مزار زیر آب ہیں ورنہ عام دنوں میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر ان دونوں کے شکستہ مزار نظر آتے ہیں، آس پاس کے

لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں نوری انہیں جھیل کی سیر کرتی نظر آتی ہے۔''
احسن نے کہا۔

''بھئی تم لوگ آخر کس چکر میں پڑ گئے ہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہماری بیگم صاحبہ مکلی کے مزارات سے لو لگا رہی تھی، بڑی مشکل سے انہیں وہاں سے گھسیٹ کر لائے ہیں۔ اب تم پھر مزاروں کا ذکر لے بیٹھے ہو۔'' اظفر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''ادھر یوسف ہے تو وہ اتنی سنجیدگی سے پانی میں ڈبکیاں لگا رہا ہے جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔'' پھر اس نے بہ آواز بلند یوسف کو مخاطب کیا۔ ''یار پلٹ آؤ کسی شہزادی نے اپنی Chastity Belt کی چابی یہاں نہیں پھینکی ہے جو تم ڈبکیاں لگا رہے ہو۔''

یوسف نے اس کا جملہ سنا تو مسکرایا اور کشتی کی طرف پلٹا احسن بھی ہنسنے لگا۔ ''یوسف صاحب نے تو بہت سی چابیاں اکٹھی کی ہوں گی۔''

''یہ میرا یار جو ہے بہت گھنا ہے، ایسی باتوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔'' اظفر نے کہا۔ اب یوسف کشتی میں پہنچ چکا تھا اور اس کے بدن سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطرے کشتی کے فرش پر جمع ہو رہے تھے' وہاں پڑی مچھلی اب ختم ہو چکی تھی۔ صوفیہ احسن نے نگاہیں اٹھا کر بے اعتنائی سے ہم سب کو دیکھا اور پھر اپنی اسکیچ بک پر جھک گئی۔ اس میں سب سے بڑی خرابی کم گوئی اور سب سے بڑی خوبی مصوری تھی' چند ہفتوں بعد سڈنی میں اس کی تصویروں کی نمائش ہونے والی تھی۔

میں نے جھک کر پانی کو دیکھا، پانی جو بہتی ہوئی سریت ہے۔ پھیلی ہوئی ہیبت ہے، حیات کی اصل ہے، رگ وید میں کہا گیا ہے:

''اس وقت نہ عدم تھا نہ وجود، نہ ہوا اور نہ آسمان، جو اس سے پرے ہے۔ کیا چیز سب کو محیط تھی اور وہ سب کچھ کہاں قائم تھا؟ کیا وہ پانی اور عمقِ بے پایاں تھا؟''

یہ پانی جس کے سینے پر ہم اس وقت رواں تھے، عمق بے پایاں نہ تھا لیکن پانی تھا۔
پانی جس میں سب سے پہلے ''کام'' (خواہش) نمودار ہوئی اور یہ خواہش عقل یا روح کا ابتدائی تخم تھی۔

خواہش، عقل، روح، عشق۔ میں ان چاروں کے دام میں تھی۔ بادل کا ایک ٹکڑا ہماری کشتی کے اوپر سایہ کئے ہوئے تھا اور ساتھ ساتھ چل رہا تھا، شاید ہم واقعی نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہے ہیں۔ صدیوں پہلے کا وہ زمانہ کیسا رہا ہوگا جب کنجھر کے کنارے مچھیروں کی ایک بستی تھی اور سمہ خاندان کا سردار جام تماچی اس بستی کی ایک مچھیرن نوری کو اپنا دل ہار گیا تھا۔

یہ جو ساتھ جاگتے تھے، اب صدیوں سے ساتھ سو رہے تھے اور ان کے ساتھ نہ جانے کتنے مکمل اور نامکمل بو سے سو رہے تھے، کتنی آسودہ اور ناآسودہ ہم آغوشیاں سو رہی تھیں۔ مجھے شاہ کا ''سُر کاموڈ'' یاد آیا۔ یہ راگنی جس کا تعلق دیپک راگ سے بتایا جاتا ہے، شروع سے آخر تک نوری جام تماچی کے عشقِ بلاخیز کا قصہ سناتی ہے۔ شاہ کی آواز آئی:

''دھن دولت جنتا میں بانٹے، مایا جال کو توڑا، کنجھر کی گندری کے کارن راج پاٹ کو چھوڑا۔''

راج پاٹ کو چھوڑنے والا اور کنجھر کی گندری تہ آب سوتے تھے۔ لیکن غرقِ دریا ہونے کی تمنا تو غالب نے کی تھی۔ ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا، نہ کہیں مزار ہوتا۔

مکلی کے مزار میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ چودھویں صدی کی قبروں پر سایہ کئے چھتریاں، فیروزی اور گہرے نیلے رنگ کی شیشے کی طرح چمکتی اینٹیں، کائی نے دیواروں کو سیاہ کر دیا تھا۔ یہ مرزا خان بابا بن میرزا خان عیسیٰ خان ترخان (اول) کا مزار ہے یہاں ملک راجپال اور اہنسا بائی سوتے ہیں۔ میرزا باقی بیگ ازبک، میرزا طغرل بیگ، یہ سونے والے جانے کہاں کہاں سے آئے تھے؟ کس کس علاقے کی مٹی کا خمیر یہاں قطار اندر قطار سوتا تھا۔ ترک، راجپوت، مغل، ازبک، ارغون، دوست، دشمن، باپ، بیٹے، محرم، نامحرم سب خاک میں مل کر خاک ہو گئے تھے۔ مٹی نے تمام راز اپنے اندر چھپا لیے تھے جیسے ماں اپنے سینے میں بچوں کے عیب چھپا لیتی ہے۔

اور جب چلتے چلتے رک کر میں نے ایک قبر کا کتبہ پڑھا تو ٹھٹھک گئی تھی، لوحِ مزار پر لکھا تھا:

''بہ تاریخ بیست ششم ذی الحجہ 1082 ھ عصمت پناہ جہاں بیگم فوت شد۔'' اس لمحے مجھے خیال آیا کہ میری لوح مزار پر ''عصمت پناہ'' کا لفظ کس قدر سجے گا؟ اور اسی لیے میں نے ہنس کر اظفر سے کہا تھا ''میری لوحِ مزار پر بھی ''عصمت پناہ'' کندہ کرا دینا۔''

ہم گنجھر کے وسط میں تھے جب اظفر نے کشتی والے سے واپسی کے لیے کہا' جس پانی میں ہم نے آگے کا سفر کیا تھا اسی پانی میں اب واپس جا رہے تھے۔

اکثر میرا جی چاہتا ہے کہ وقت میں پیچھے چلی جاؤں لیکن واپسی کا سفر ممکن نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے یوسف سے پوچھوں کہ تم یہ کب تک چھپاؤ گے کہ Chastity Belt کی چابی تمہارے پاس ہے؟ میں کسی ایک مرد کی عورت ہو کر رہنا چاہتی ہوں۔

کشتی کنارے کی طرف جا رہی ہے لیکن میں کنارے کی طرف نہیں جا سکتی۔ مجھے پانی کے بیچوں بیچ کھڑے رہنا ہے اور اس دن کا انتظار کرنا ہے جب چابی یوسف سے بھی گم ہو جائے۔ اظفر تو اسے گم کر ہی چکا ہے۔

OO

شیریں چشموں کی تلاش

کہکشاں کے جنگل میں عرفان کی آگ ہیکل سلیمانی کے بلند و بالا ستونوں کی شکل میں بھڑکتی ہے اور اس کی روشنی میں کائنات کے اس سرے سے اس سرے تک کھنچا ہوا حیات کا محراب نما پل نظر آتا ہے۔

ہم عدم سے وجود میں آتے ہیں تو اس پل پر پہلا قدم رکھتے ہیں اور آگے کی طرف بڑھتے ہیں، جب فنا کا جھونکا ہمیں چھوتا ہے، ہم سوکھے پتوں کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر اڑتے ہیں اور پل کے نیچے سے بہنے والے بے نیاز سمندر کے فراغ سینے پر گر جاتے ہیں اور اس کے تموج میں گم ہو جاتے ہیں۔

تیز ہوا اچانک چلی ہے اور نیالی رنگت کا پیوند لگا بادبان ہوا کے ساتھ چل نکلنے کو بے تاب ہو گیا ہے۔ سبزے سے ڈھکے ہوئے کنارے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اور کشتی کا رخ اب دوسری جانب ہے جہاں بہت دور سرخ رنگت کے کھپریلوں والے مکان اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے ہیں۔ سورج کی روشنی ان مکانوں کی چھتوں اور تاڑ کے درختوں سے گلے مل کر رخصت ہو رہی ہے۔ ایک اور دن اختتام کو پہنچا، ایک اور رات اس لیے سر پر آئی کہ اسے برتا جائے اور پھر اسے بھی وقت کی اکائیوں میں گزار کر نہ ہونے کا اعزاز بخشا جائے۔

میں اپنی نشست پر بیٹھے ہی بیٹھے آگے کی طرف جھکتی ہوں اور میرا دایاں ہاتھ سمندر

کومحسوس کرتا ہے۔ سمندر کی نرم اور خنک لہریں میری انگلیوں کا بوسہ لے رہی ہیں۔ سمندر بہتی ہوئی پیاس ہے اور میں کٹتی ہوئی پیاس، میرے وجود کا ایک ایک ذرہ جو اپنی ذات میں صحرا ہے ازل سے تشنگی کے ریگزار میں بھٹک رہا ہے۔ پیاس میرے اندر ہے اور پیاس میرے باہر۔

شیریں چشموں کی تلاش مجھے وجود کے نشیب میں لے جاتی ہے لیکن اندھے نشیب کی پیاس جہنم کی آگ کی طرح بھڑکتی ہے۔ اس نشیب میں ایک بھول بھلیاں ہے اور میں اس میں گم ہوں۔ میں اپنا پیچھا کر رہی ہوں پر ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ مجھے اپنے قدموں کی چاپ کبھی پیچھے سے آتی سنائی دیتی ہے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب سے۔ ہر مرتبہ جب مجھے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اگلا موڑ مڑتے ہی میں اپنے آپ کو گرفتار کرلوں گی، عین اسی وقت مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری ہنسی کی آواز اگلے موڑ سے نہیں کسی دوسری جانب سے آتی ہے۔ بھول بھلیوں میں جب تم خود ہی چھپ رہے ہو، خود ہی پیچھا کر رہے ہو اور بھٹک رہے ہو تو یہ سب کچھ ذات کی نفی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

میں بھاگتے بھاگتے تھک جاتی ہوں اور میرا دو نیم وجود تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور یہ تیسرا وجود مینوطور کا ہے۔ اور مینوطور خود بھی دو نیم ہے۔ اس نصف انسان اور نصف حیوان کا وجود بھی بھول بھلیوں میں آباد ہے اور وہ اس سے باہر آنے کے لیے ڈکراتا ہوا بے تاب پھرتا ہے۔ اور جب اسے کوئی راستہ نہیں ملتا تو وہ جس کے پیروں میں طوفان کی لپک اور آنکھوں میں عقابی چمک ہے، ہاں وہی اپنی پیشانی پر اُگے ہوئے سینگوں سے میری ذات کو لہولہان کر دیتا ہے۔ اس کے خیال میں میری آنکھیں ان بھول بھلیوں کے دو راستے ہیں جن میں وہ اسیر ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ میں تو اپنی قیدی آپ ہوں، وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ عنکبوت نے میری آنکھوں میں اپنا گھر بنایا ہے۔ اور مجھے اپنے وجود کے نشیب سے باہر آنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اب معاملہ کچھ یوں ہے کہ میرا پارہ پارہ وجود اپنے آپ سے پناہ چاہے یا اپنے وجود کی دوسری، تیسری چوتھی اور مہا سنکھویں تقسیم سے۔ وجود کی یہ تقسیم بھی تفریق کی دوسری شکل ہے، اس لیے جب میں تقسیم ہوتی ہوں تو دراصل اپنے آپ کو،

اپنے آپ میں سے تفریق کرتی ہوں۔
ضرب، تقسیم اور جمع، تفریق، اعداد کائنات کے دائرے میں نیبولوں کی طرح پھٹتے ہیں۔ وہ کبھی شہابیوں کی طرح روشن لکیریں کھینچتے ہوئے فنا کے اندھے کنویں میں اتر جاتے ہیں اور کبھی نامعلوم کہکشانوں میں بکھرے ہوئے ان گنت سورجوں کی مانند جگمگاتے ہیں۔ کائنات نے اپنے آپ کو اعداد کی صورت میں تحریر کیا ہے اور میں اس تحریر کو پڑھنا چاہتی ہوں، پر یوں ہے کہ میں اعداد کی عظمت سے ہیبت زدہ ہوں اور چشم حیرت وا کیے ان سایوں کو دیکھتی ہوں جو حقیقت کا پرتو ہیں۔ لیکن حقیقت کہاں ہے؟ وہ شاید اعداد میں مستور ہے یا پھر وہ ہماری روح میں وجدان بن کر پھیلی ہوئی ہے۔
ہم جو اپنی روحوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں اس وجدان کا ادراک نہیں رکھتے۔ ہم اس نابینا کی طرح ہیں جو فاقوں سے قریب المرگ ہے کیونکہ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ اس کے پاس روٹی خریدنے کے لیے درہم و دینار نہیں، وہ یہ نہیں جانتا کہ جس کھردری زمین پر وہ لیٹا ہے اور پشت میں چبھنے والے کنکروں اور پتھروں کو برا بھلا کہہ رہا ہے، وہ دراصل ناتراشیدہ ہیرے اور جواہرات ہیں۔ تو یوں ہے کہ حقیقت کے ہیرے جواہر میری روح کی گہرائیوں میں پڑے سوتے ہیں اور میں حقیقت کو سمجھنے اور جاننے کے تمام امکانات سے بے خبر اپنے آپ میں گم ہوں۔
سو جب میں تقسیم ہوتی ہوں تو دراصل اپنے آپ کو، اپنے آپ میں سے تفریق کرتی ہوں، اس مسلسل تفریق کا خاتمہ نہیں ہے اور پھر اس کی انتہا صفر ہے۔ اور صفر ہی وہ نقطہ ہے جو کائنات اور ماورائے کائنات میں ازل سے بھی پہلے موجود تھا اور ابد کے بعد بھی وہی پایا جائے گا۔ نقطہ عرفانِ ذات کی ابتدا ہے اور انتہا۔ اس کی ازل سے پہلے کی ازلیت اور ابد کے بعد کی ابدیت مجھے دہلا دیتی ہے۔
میری سربسجدہ بینائی شہرِ برباد کے اس نقطے کا نظارہ کرتی ہے جس نے کہا تھا۔ ''نقطہ اصل ہے جو نہ بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے''۔ میری بینائی شہر برباد کے اس چوک کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے جہاں نقطے کے بارے میں گفتگو کرنے والے نقطے کو

اس کے جاننے کی سزا دی گئی۔ پر جاننے کی یہ سزا بہت کم تھی کہ اس کی مدت زمین کی محض تین گردشوں پر محیط تھی۔ اور جب اسے سولی دی گئی تو پہلے اس کی انگلیاں کتری گئیں، پھر اس کے بازو تراشے گئے، پھر اس کے پیروں نے اس سے منہ پھیرا اور اس کی آنکھوں نے اس سے کنارہ کیا، میخوں نے اس کے وجود کو چھلنی کیا اور پتھروں نے اس کے بدن کو پارہ پارہ کیا۔

وائے ہو ان آنکھوں پر جنہوں نے یہ دیکھا اور وائے ہو ان کانوں پر جنہوں نے یہ سنا اور وائے ہو ان لوگوں پر جو اس کے بعد بھی نقطے کے انکاری رہے۔ اور ہاں، وائے ہو مجھ پر کہ اس کے بدن کو تقسیم کیا گیا اور اس نے اپنا راستہ پالیا۔ پر میری ذات بھول بھلیوں میں تقسیم ہوتی ہے اور تفریق ہوتی ہے، میں گھٹتی ہوں اور گھٹائی جاتی ہوں اور پھر معدوم ہو جاتی ہوں۔ ایک وہ تھا جو ازل سے پہلے بھی نقطہ تھا اور ابد کے بعد بھی نقطہ ہی رہے گا اور ایک کہنے والا ہے جو معدوم ہو جائے گا۔ میں تقسیم و تفریق کی اور ضرب اور جمع کی اور اعداد کی اصل جاننا چاہتی ہوں کہ اپنی اکائی کو پہچانوں اور اس کائنات کے بارے میں کچھ سمجھوں جو محض اعداد کی بساط ہے اور آخر کار مجھے نگل جائے گی۔

اور یوں ہے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتی اور سمندر کا سفر کرتی ہوں۔ ہر طرف ببول کے کانٹے ہیں جن سے میرا وجود لہولہان ہے۔ اور پیاس ہے جو اندرونِ ذات منزلیں طے کرتی ہے۔ سمندر مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے لیکن وہ سرتا پا کڑواہٹ ہے اسی لیے میں شیریں چشموں کی تلاش میں نکلتی ہوں اور بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہوں۔

آسمان کا رنگ ابھی کچھ دیر پہلے کہیں گلابی تھا اور کہیں سبزی مائل نیلا، پھر یوں ہوا کہ تاریکی نے ان رنگوں کو نگل لیا، تمام رنگ معدوم ہو گئے اور تمام چہرے گم ہو گئے، لیکن میں سمندر کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں، پُر جلال اور پُر شکوہ چہرہ' ہمیشگی کا چہرہ، میں اس کی شکن شکن پیشانی کی لکیریں گننا چاہتی ہوں۔ معدوم کر دینے والی لکیریں۔

میں کاغذ کی بہت سی قندیلیں روشن کرتی ہوں پھر انہیں لہروں کی منڈیر پر احتیاط سے رکھ دیتی ہوں۔ یہ روشن قندیلیں چند لمحوں کے لیے مجھے سمندر کا پُر شکوہ چہرہ اور اس کی شکن

شکن پیشانی دکھاتی ہیں پھر قندیلیں پیچھے رہ جاتی ہیں اور سمندر کا روشن چہرہ بھی پیچھے رہ جاتا ہے۔

میں سفر میں ہوں اور کشتی سمندر پر آگے بڑھتے ہوئے استخوانی ڈھانچوں کے جنگل سے گزر رہی ہے۔ ہزاروں، لاکھوں سال پرانے ان ڈھانچوں سے ان گنت آنکھیں لٹک رہی ہیں۔ کسی کی آنکھ کان میں جھول رہی ہے۔ اور کسی کی آنکھوں نے سینے میں اپنا گھر بنایا ہے ڈھانچے تو ایسے بھی ہیں جن کی آنکھیں ان کی انگلیوں سے لٹک رہی ہیں۔ یہ تمام آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں، میری ہر جنبش ان کی نظر میں ہے۔ نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی یہ تمام آنکھیں میری طرف لپکتی ہیں۔ میرے وجود کو ہزار ہا پہلو سے ڈسنے کے لیے بے تاب اور مجھے بھی اپنے گروہ میں شامل کرنے پر مُصر، میں ہانپنے لگتی ہوں، یہ استخوانی جنگل میرے وجود کے نشیب میں بنی ہوئی بھول بھلیوں کی طرح پیچیدہ اور پُر اسرار ہے اور اسی کی طرح نامعلوم موجودات سے بھرا ہوا۔

یہ آنکھیں مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ میں بھی اس جنگل کا ایک استخوانی شجر بن جاؤں اور میری آنکھیں بھی اپنے حلقوں سے نکل کر میری ہتھیلیوں پر چپک جائیں یا پھر میری گردن میں جھولنے لگیں۔ میرے لیے آنکھوں کے اس جنگل کے پاس بہت سے خوبصورت وعدے ہیں۔ ابدی زندگی کا وعدہ اور دیوتاؤں کے بسائے ہوئے شہرِ آسائش میں زندہ رہنے کا وعدہ۔ وہ تمام دلربا وعدے جو گزرے ہوئے تمام لوگوں سے کیے گئے اور آنے والے تمام لوگوں سے کیے جائیں گے۔

میں ناتواں ہوں پر میرا ارادہ قوی ہے۔ میری کشتی اس مہیب جنگل سے نکل کر اس چٹان تک پہنچتی ہے جس پر کائی کی نہ جانے کتنی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ اس چٹان پر ایک سایہ ایستادہ ہے اور اس کے دو چہرے ہیں۔ یہ چہرے دیکھنے والے کے سوا کسی اور کے چہرے نہیں۔ دہرائے ہوئے یہ چہرے جانتے ہیں کہ کسی بھی لمحے بپھرا ہوا سمندر ان پر غالب آجائے گا اور پھر یہ کائی لگی چٹان ان کے قدموں کی استقامت کو ترستی رہے گی۔ پر اس وقت وہ چہرے نہ ہوں گے، ان کا سایہ نہ ہوگا اور ان کی آواز نہ ہوگی، صرف پتھر کا پچھتاوا

ہوگا، پھر کائی پتھر کو کھائے گی کہ اسے پچھتاوے سے نجات دلا سکے' پچھتاوا پچھتاوے کو کھائے گا۔

پچھتاوا تو ہمیشہ سے پچھتاوے کو کھاتا آیا ہے پھر تمام پچھتاووں نے سمندر میں اپنا گھر بنایا ہے۔ ایک ایسے ہی پچھتاوے کے جزیرے سے گزرتے ہوئے میں نے اسے دیکھا۔ وہ شہزادیوں کے سے طمطراق اور وقار کے ساتھ لہروں پر قدم رکھتی تھی اور شعلے اس کے نقش قدم چاٹتے تھے، پر جب میں نے اس کی راہ جانا چاہا تو زمین و آسمان ایک آواز سے بھر گئے اور سنا گیا: تو کہ فلس ماہئی حیرتی چہ زنی ز بحرِ وجود دم، بنشیں چو طوطیٔ دم بہ شنو خروشِ نہنگِ لا۔

زمینوں اور آسمانوں میں گونجتی ہوئی اس آواز کو سن کر میں نے اسے جانا کہ وہ حضرتِ حی ہے، جنابِ نقطہ ہے۔

وہ آگے کی طرف جاتی تھی اور دراز داڑھیوں، خشونت زدہ چہروں اور ڈھیلی ڈھالی عباؤں والے سنگ زنی کرتے اور آوازے کستے ہوئے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

یہ وہ تھے جنہوں نے اپنی تختیوں کو اپنے گھٹنوں سے توڑ دیا تھا، اپنے قلم دریا برد کر دیئے تھے اور اپنی دواتوں میں بھری ہوئی روشنائی جوہڑوں میں انڈیل دی تھی۔ یہ وہ تھے جو مدینتہ العلم کے شہری کہلانے کے مدعی تھے، باب العلم کو سجدے گزارتے تھے' پر نقطے کے انکاری تھے۔

میں نے جنابِ نقطۂ عالیہ کی بے توقیری دیکھی اور گریہ کیا، میں نے ان خشونت زدہ چہروں کو پہچانا اور ہیہات کہا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے اور ان ہی جیسے دوسرے انکاریوں کے ستائے ہوئے ان گنت روشن حروف سمندر پر تیرتے ہوئے میری جانب آتے ہیں اور پھر کسی اور طرف نکل جاتے ہیں۔ میں جھک کر ان روشن حروف کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہوں لیکن وہ مسکراتے ہوئے میری انگلیوں سے پھسل جاتے ہیں، ان کی مسکراہٹ میں عجب استہزا ہے۔

''تم ہمیں اپنی گرفت میں نہیں لے سکتیں، تم نہ جانے کب سے ان اوراق کو جلاتی

چلی آئی ہو جن پر ہمیں لکھا جاتا تھا جب ہم جلتے تھے اور کراہتے تھے تو تم نے ہمیں اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روندا پھر ہمیں راکھ بنا کر ہوا کے ہمراہ کیا، ہماری ہڈیوں سے حمام روشن کیے گئے اور ہمارے سینوں میں سلگتے ہوئے بیج سے بھٹیوں کو بھڑکایا گیا۔ سو اب ہم تمہاری گرفت میں کبھی نہیں آئیں گے۔ ہم تمہارا ماضی ہیں اور ماضی اعمال کا وہ منجمد سمندر ہے جس پر گزرے ہوئے واقعات اپنے نقش و نگار چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ نقش و نگار کبھی تحلیل نہیں ہوتے۔ کائنات میں وہ آگ ابھی فروزاں نہیں ہوئی جو ماضی کے منجمد سمندر کو پگھلا سکے۔ اور اگر وہ کبھی ناموجود آگ تمہارے ہاتھ آ جائے تو اسے لے کر ہمارے پاس آنا، پھر ہم بھی تمہاری گرفت میں آ جائیں گے۔"

مجھ سے اور میرے ناموں سے شکوہ کناں روشن حروف تیرتے ہوئے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور تب میں ہر یقین اور ہر گمان کو جھٹلاتی ہوں۔ اے سمندر تو گواہ رہیو کہ میں ہر یقین اور گمان کو جھٹلاتی ہوں۔ انکار کا علم میرے وجود کی انتہائی بلندیوں پر نصب ہے، اس علم کے وسط میں نقطہ ہے اور نقطے کے سینے میں عرفان کی آگ روشن ہے اور زمین و آسمان اسی کی روشنی سے بھرے ہوئے ہیں اور میں کہ وجود کے نشیب میں شیریں چشمے تلاش کرتی رہی اور بھول بھلیوں میں اپنا پیچھا کرتی رہی اور مینو طور کے سائے سے بھڑکتی رہی، ہاں وہی میں جب ایڑیاں اٹھا کر انکار کے اس علم پر ابھرے ہوئے نقطے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوں تو عرفان کی آگ میری انگشتِ شہادت کو خشک ٹہنی کی طرح جلانے لگتی ہے۔ یہ آگ میری تشنگی بجھاتی ہے اور میں جان لیتی ہوں کہ انکار میں نجات ہے اور انکار ہی میری آخری پناہ ہے اور یہ بھی کہ سمندر بہت وسیع ہے، بہتی ہوئی پیاس ہے اور محض سراب ہے اور ہاں یہ بھی کہ سراب کے سفر میں اختتامِ سفر کا دکھ نہیں سہنا پڑتا۔

○○

جل ہے سارا جال

شیشے کی دیواروں میں سبز پانی قید کاٹتا ہے، قیدی کے قدموں میں بجری بچھی ہے بجری میں سمندری پودے لگائے گئے ہیں، سبز رنگ کے چھوٹے اور بڑے کائی لگے اسفنجی پتھر ہیں، گھونگھے ہیں، قیدی سانس لیتا ہے، اس کے وجود سے بلبلے اٹھتے ہیں اور سطح پر آ کر دم توڑ دیتے ہیں۔

ان بلبلوں کے درمیان ایک مچھلی آہستہ آہستہ تیر رہی ہے، تقریباً ایک فٹ لمبی اور چپٹی، کاہی رنگ کی اس مچھلی کی دم پر ایک گہرا سرخ دھبا ہے، سر پر سفید دھاریوں والی کاہی جھالر ہے اور آنکھوں میں گہرے پانیوں سے ہجر کا ملال ہے۔ مجھے یہ مچھلی جانی پہچانی لگتی ہے۔ میں ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگتی ہوں، یوں جیسے کوئی شناسا چہرے کو پہچاننے کی سعی کرے، Puzzle Jigsaw میں اس چہرے کے چوکھٹے کو بٹھانے کی کوشش کرے۔

میری بیٹی اٹک اٹک کر تختی پر لکھا ہوا نام پڑھنے لگتی ہے۔ وہ جو نام لیتی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا' میں مچھلی کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر اس کا ڈومیسائل سرٹیفکیٹ پڑھنے لگتی ہوں جو ایکوریم کے سربراہ کی طرف سے جاری ہوا ہے۔ مچھلیوں کے نام ہیں، عرفیتیں ہیں، حسب نسب ہے' قومیتیں ہیں گہرے سمندر سے بند پانیوں تک ان کی ہجرتیں ہیں اور ہجرتوں کے بعد کے Adjustments ہیں۔

اس کے نام Achilles Tang پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آ جاتا ہے کہ میں نے اس

مچھلی کو کب اور کہاں دیکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے تمکنت یاد آ جاتی ہے۔ لوگ اسے تمکنت اسد کے نام سے جانتے تھے۔ اس کے بارے میں شہر میں کیسی کیسی باتیں نہ ہوتی تھیں، کیسے کیسے اسکینڈل اس کے نام سے منسوب تھے۔ لطف کی بات تو یہ تھی کہ اپنے بارے میں تمام اسکینڈل اس کے علم میں تھے، وہ ان میں نمک مرچ لگا کر مجھے سناتی اور ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔ وہ ریگستان میں سراب کی طرح تھی کہ نظر آتی تو پیاسے بھاگتے بھاگتے تھک جاتے، ہانپنے لگتے، وہ سیتا نہ تھی، ساوتری نہ تھی، کچھ زیادہ ہی عورت تھی۔ اس کا بدن پُر گوشت تھا، اس کی شریانوں میں گرم اور جیتا جاگتا خون بھنور ڈالتا تھا۔ اس بھنور میں ذائقوں اور لذتوں کی رو پہلی اور سنہری مچھلیاں تیرتی تھیں۔ وہ جب پیسٹر ساری باندھتی تو دیکھنے والوں کو صاف نظر آتا کہ اس پیالۂ ناف میں تولہ بھر مکھن بڑی صفائی سے آ سکتا ہے۔

میں اس کی حرکتوں پر جھنجھلاتی، اسے سمجھاتی، وہ ہنس دیتی، ٹال جاتی، لوگوں کے خیال میں وہ ایک ایسی عورت تھی جس کی ذہنی سطح نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اس کے بارے میں یہ رائے رکھنے والے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اس کا اور میرا برسوں کا ساتھ تھا۔ میں جانتی تھی کہ اسے سوانگ رچانے کا شوق ہے۔ جہل کا سوانگ، آوارگی کا سوانگ۔

Achilles Tang سے میری پہلی ملاقات تمکنت کی خواب گاہ میں ہوئی تھی اس کے گھر کا ایک کمرا اچھا خاصا ایکوریم تھا۔ ہزاروں روپے اس نے اپنے اس شوق پر برباد کئے تھے لیکن Achilles Tang اس کے جی کو شاید کچھ زیادہ ہی بھا گئی تھی تب ہی تو اسے ایکوریم میں رکھنے کے بجائے اس نے اپنی خواب گاہ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ انڈو پیسفک کی باسی تھی اور تمکنت اسے سنگاپور سے خرید کر نہایت اہتمام کے ساتھ لائی تھی۔

اس وقت بھی Achilles Tang کو ایکوریم میں تیرتے ہوئے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ بارہ انچ لمبی اسی مچھلی نے تمکنت اور ایر کموڈور اسد میں جدائی ڈلوائی تھی۔ تمکنت اسے ہر لمحہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ اور اسد کو مچھلیوں سے نفرت تھی۔ وہ گھر کے ایک کمرے کو ایکوریم کے طور پر برداشت کر سکتا تھا لیکن اپنے کمرے میں 24 گھنٹے ایک

مچھلی کی موجودگی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ کئی جھڑپوں کے بعد یہ طے پایا کہ دونوں الگ الگ کمروں میں زندگی گزاریں اور جب ایک دوسرے کی یاد ستائے تو کسی تیسرے کمرے میں مل لیا کریں۔

تمکنت کو اپنی بیٹی ارم سب سے زیادہ پیاری تھی۔ وہ اکثر کہتی کہ پہلے کی کہانیوں میں شہزادی کی جان کسی طوطے کی بائیں آنکھ کی پتلی میں ہوتی تھی یا دیو کے بالے میں پروئے ہوئے موتی میں۔ لیکن میری جان ارم میں ہے۔ اسی لیے وہ اسے ''زندگی'' کہتی تھی۔

اسد اور تمکنت دونوں Jet Set کے لوگ تھے اور اسی ڈھب کی زندگی گزارتے تھے۔ ڈرنکس، ڈسکو، کارڈز، کلب، سوئمنگ، رائڈنگ، لیکن ارم تک خواہشوں کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کی آنچ نہیں پہنچتی تھی۔ یہ نہ تھا کہ اسد اور تمکنت نے ارم کو زندگی کے اصل دھارے سے کاٹ رکھا ہو۔ وہ کانونٹ میں پڑھتی تھی، وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھتی تھی، انگریزی ناول پڑھتی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے طبقے کی دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی۔ تمکنت نے اسے جانے کس بھنورے میں پالا تھا کہ اس کی معصومیت برقرار رہی تھی۔ ارم کو دیکھ کر کبھی کبھی مجھے رشک آتا۔ اس کے وجود میں مشرقی رہن سہن اور مغربی ذہن کا نہایت حسین سنگم ہوا تھا۔

تمکنت کو مچھلیوں کا شوق اچانک ہوا۔ اس شوق کی کہانی بھی عجیب ہے۔ وہ بنکاک گئی ہوئی تھی اور وہیں اس کی ملاقات ایک مہاپرش پنڈت سے ہوئی جو بڑے پہنچے ہوئے جوگی تھے اور ساتھ ہی جنم کنڈلیاں بڑے اہتمام سے کھینچتے تھے۔ تمکنت نے ان سے اپنی جنم کنڈلی بنوائی اور یوگا کے آسن سیکھے۔

بات یہیں پر ختم ہو جاتی اگر تمکنت کے اندر ایک رگ زیادہ نہ ہوتی۔ مہاپرش پنڈت سے ملنے کے بعد تمکنت کی تمام دلچسپیاں جوتش ودیا پر مرتکز ہوگئیں۔ جوتش ودیا پر کتابیں خرید خرید کر اس نے ڈھیر کرلیں۔ میں اس سے ملتی تو وہ ستاروں کی چال، بروج اور ان کے خواص، جنم کنڈلی، جنم راس، پنچھتر، پد، دشا، ساڑھ ستی کی باتیں کرتی۔

انہی دنوں تمکنت سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ گلے میں ایک سنہری زنجیر ہے اور

زنجیر کے وسط میں دو مچھلیاں ہیں جو ہنسلی کی ہڈی کو چومتی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔؟ تو کہنے لگی ''میرا Sun Sign'' ہے۔

چند ہفتوں بعد ملاقات ہوئی تو سونے کی دو مچھلیاں گلے کا ہار تھیں اور ان گنت مچھلیاں اردگرد تھیں۔گھر اچھا خاصا ایکوریم بن چکا تھا۔اسد نے فریاد کی، وہ تمکنت کی انتہا پسندی سے عاجز تھا۔مچھلیاں اس کا من بھاتا کھاجا تھیں اور تمکنت کو مچھلی سے اب وہی پرہیز تھا جو کسی جینی کو ماس سے ہوتا ہے۔

انہی دنوں عید آئی اور میں عید ملنے اس کے گھر گئی تو وہ گلے ملی پھر اس نے چاندی کا خاصدان میری طرف بڑھایا جس میں چاندی ہی کی ایک نہایت حسین اور سبک مچھلی رکھی تھی۔میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس مچھلی کا کیا کروں۔ وہ میری الجھن سمجھ گئی، اس نے مچھلی اٹھا کر کوئی کھٹکا دبایا اور مچھلی کا منہ کھل گیا۔ یہ چاندی کا مچھلی نما عطردان تھا۔اتنا حسین اور منفرد عطردان میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مجھے عطر لگا کر اس نے مچھلی کا منہ بند کیا تو میں نے اسے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔اس میں آنکھوں کی جگہ دو ننھے ننھے یاقوت جڑے تھے اور بدن میں وہی لچک، وہی لوچ تھا جو زندہ مچھلی میں ہوتا ہے۔میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ چاندی کی یہ مچھلیاں کھڑک پور میں بنتی ہیں اور اس نے مونگیر سے منگائی ہیں۔

کوئی اس سے اس کے اس عجیب شوق کے بارے میں پوچھتا تو عجیب دلیلیں نکال کر لاتی، کبھی قصص الانبیاء سے اس مچھلی کا حوالہ دیتی جس کے بڑہ پشت پر وہ گائے کھڑی ہے جس نے سات طبق زمین کو اپنے دو سینگوں پر اٹھا رکھا ہے۔ اور جن دو سینگوں کے درمیان چار ہزار سینگ اور ہیں اور جس کے ایک سینگ سے دوسرے سینگ تک کا فاصلہ پانچ سو برس کا ہے۔اور کبھی اپنی بات کو وزن دینے کے لیے وہ اس مچھلی کا ذکر کرتی جس کے پیٹ میں یونس نبی نے 40 دن اور 40 راتیں گزاری تھیں۔اسی کی زبانی مجھے اس مچھلی کا قصہ معلوم ہوا جو دراصل وشنو کا ایک روپ تھی اور جس روپ میں وشنو نے منو کا امتحان لیا تھا۔

راس مین سیارہ نیپچون کے زیر اثر ہے اور نیپچون سمندر کے دیوتا پوسیڈون کا نسبتاً نیا

نام ہے۔ وہ اپنے راس کی تمام بنیادی خصوصیات رکھتی تھی۔ مچھلی کی طرح پھسلتی ہوئی، پانی کی طرح مضطرب۔

محفلوں اور مجلسوں میں اپنے برج کے زیر اثر پیدا ہونے والوں کو وہ جانے کس طور پہچان لیتی اور پھر ان سے فوراً اس کی شناسائی ہو جاتی۔ اسد کبھی کبھی چڑ کر کہتا۔ ''میرا گھر تو Pisces Club ہے۔'' تمکنت نے جانے کہاں کہاں سے اپنے برج کے زیر اثر پیدا ہونے والوں کے نام اور ان کے انجام معلوم کر رکھے تھے۔ کوئین میری آف اسکاٹ اسے اس لیے محبوب تھی کہ اس کا راشی پھل بھی مین تھا۔ لوگ نہروں کے شہر وینس اس لیے جاتے تھے کہ وہ دنیا کی حسین ترین اور منفرد بستیوں میں سے ایک ہے لیکن تمکنت وہاں اس لیے گئی کہ وہ شہر راس مین کے زیر اثر ہے۔

اسے زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا تھا، وہ بڑی شاندار دعوتیں دیتی اور بڑی کمال کی باتیں کرتی۔ پھر ایک دن اس کا فون آیا۔ اسد کو Deputation پر شرق اوسط کے ایک ملک بھیجا جا رہا تھا۔ مجھے سن کر اداسی ہوئی۔ یوں تو میرے اور اس کے درمیان کوئی قدر مشترک نہ تھی پھر بھی ہم دونوں کی دوستی بہت گہری تھی۔ وہ ''الوداعیے'' کا دعوت نامہ لے کر آئی۔ یہ آخری دعوت تھی جو اس نے جاتے جاتے اپنے دوستوں اور اپنے دشمنوں کو دی۔ میں اس الوداعی دعوت میں نہ جا سکی، میری اور اس کی آخری ملاقات ایئرپورٹ پر ہوئی۔

وہ چلی گئی اور مجھے اداس کر گئی۔ اس سے میرا ملنا کم کم ہوتا تھا اس کے باوجود دل کو ایک تسلی سی رہتی تھی کہ وہ شہر میں موجود ہے اور جب جی چاہے گا ملاقات ہو جائے گی۔ وقتاً فوقتاً ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے۔ دو سال گزر گئے اور پھر ایک دن اچانک کسی اطلاع کے بغیر تمکنت مجھ سے ملنے چلی آئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی کیوں کہ چند ہی دنوں پہلے اس کا خط مجھے ملا تھا اور اس میں تمکنت نے اپنے آنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مضطرب اور الجھی ہوئی ہے۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر اچانک کھل گئی۔

اس نے بتایا کہ جس ملک میں وہ مقیم ہے اس کے ولی عہد نے کسی ضیافت میں ارم کو دیکھا اور پسند کر لیا۔ چند ہفتے بعد شاہی خاندان کی طرف سے باقاعدہ خواستگاری کی گئی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ اقرار بھی مشکل تھا اور انکار بھی۔

تمکنت اس شادی کے حق میں ہرگز نہ تھی لیکن مسئلہ ارم کا تھا۔ اس کے لیے پریوں کی کہانیاں سچ ثابت ہو رہی تھی۔

''تم خود سوچو کہ اگر ہم ارم کی عمر کے ہوتے اور ہمارے لیے کسی شہزادے یا کسی راجکمار کا راشتہ آتا تو ہمارا کیا حال ہوتا۔ بس وہی حال ارم کا ہے لیکن میں ان شہزادوں کو خوب جانتی ہوں، جس دن تیل ختم ہو جائے گا ان کی شہزادگی اور ریاستیں سب دھری رہ جائیں گی۔ میں دو سال سے ان کے درمیان ہوں اور ان کے لچھن دیکھ رہی ہوں۔'' وہ اسی طرح کی باتیں کرتی رہی پھر چلی گئی۔

دو دن بعد اس کا فون آیا۔ ''میں واپس جا رہی ہوں، تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اسد کا فون آیا تھا کہ ان لوگوں نے یاددہانی کی ہے اور اب بات ٹالی نہیں جا سکتی۔ میں اس مسئلے پر سوچنے کے لیے آئی تھی لیکن کچھ زیادہ ہی الجھ کر جا رہی ہوں۔''

وہ چلی گئی اور میرے دل میں ایک خلش سی رہی۔ چند ہفتے بعد اس کا چار سطری خط آیا۔ ''میں نے ہاں کر دی ہے۔ شادی تین مہینے بعد ہے۔ یہ چند سطریں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ دو چار دن میں اخباروں کے ذریعے یہ خبر تم تک پہنچنے سے پہلے میرا خط پہنچ جائے۔ تم یہ نہ کہو کہ عجب بے مروت تھی۔''

خط پڑھ کر میرا جی کچھ بہت خوش نہ ہوا لیکن پھر بھی میں نے مبارک باد کا ایک تار اسے اور اسد کو اور دوسرا ارم کو بھیجا۔

اس کے بعد اخباروں میں سنسنی خیز خبریں آنے لگیں۔ ارم کی اور ولی عہد کی تصویریں، تمکنت اور اسد کی تصویریں۔ کراچی کے اس گھر کی تصویر جس میں یہ مختصر سا خاندان رہتا تھا غرض یہ کہ اس رشتے کے سرکاری اعلان کے ساتھ ہی ارم اور اس کے ماں باپ انٹرنیشنل سیلے بریٹی بن گئے اور اب ہر شخص یہ بات کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اس خاندان

کا قریب ترین دوست بس وہی ہے۔

شادی موسم بہار میں ہوئی۔ تمکنت نے از راہِ محبت شادی کا دعوت نامہ مجھے بھیجا اور خط بھی۔ لیکن میری یہ حیثیت نہ تھی کہ ہزاروں روپے خرچ کر کے اس شاہی تقریب میں شریک ہو سکتی۔ میں نے ارم کو اپنی دعائیں بھیجیں اور اپنی حیثیت کے مطابق دلہن اور دولہا کو ایک چھوٹا سا تحفہ بھیجا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس تحفے کی قدر و قیمت بس تمکنت کے دل میں ہوگی، ورنہ تو یہ تحفہ، تحائف کی صف میں سب سے آخر میں جگہ پائے گا۔

اخباروں، رسالوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے وسیلے سے پورا ملک اس شادی میں شریک تھا، سو میں بھی تھی۔

شادی ہوئی پھر شاہی جوڑا ہنی مون کے لیے یورپ اور امریکہ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

چار دن، چھ دن، ہفتہ، دو ہفتے، وقت گزرتا گیا، لوگ اس شادی کو بھولنے لگے۔ میں بھی اپنے معاملات میں الجھی رہی، یوں بھی مجھے شہزادے اور شہزادیاں ''باغ و بہار'' اور ''آرائش محفل'' کے صفحوں پر تو اچھے لگتے ہیں کہ ان کی سجا بجی رہے اور ان کی دھومیں مچی رہیں لیکن حقیقی زندگی میں یہ لوگ مجھے گھناؤنے اور غلط نظر آتے ہیں دوسروں کا حق مارتے ہوئے، دوسروں کی آرزوؤں کے خون سے اپنے خوابوں کے محل کا گارا گوندھتے ہوئے۔

ڈیڑھ دو مہینے گزرے تھے کہ اچانک ایک رات خبر آئی کہ پاکستانی شہزادی ارم کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ مجھ پر بجلی سی گر پڑی، تمکنت کی حالت کے بارے میں سوچ سوچ کر دل کٹتا رہا۔

دوسرے روز خبر آئی کہ میت سوئٹزرلینڈ سے ریاست لائی جا رہی ہے۔ ٹی وی پر ایک بار پھر میں نے ارم کا سفر دیکھا۔ وہ مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز تھی۔ میں نے اس کی شادی کی فلم دیکھی تھی۔ ہنستی ہوئی۔ چہرے پر گلال بکھرا ہوا۔ اسد، فخر سے تنی ہوئی گردن، تمکنت، مسرت اور اندیشوں کا مرقع۔

پھر میں نے ٹی وی کیمرے کی آنکھ سے دیکھا، کسی قیمتی لکڑی کے تابوت میں لگا ہوا

شیشہ، اس میں سے جھانکتا ہوا، سویا ہوا چہرہ، کفن میں لپٹا ہوا بدن، پس منظر سے تلاوت کی آواز آ رہی تھی۔ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی سیاہ پوش تمکنت، سر جھکائے ہوئے اسد جو اپنے یونیفارم میں تھا، اپنے سفید لبادے کو سنبھالتا ہوا شہزادہ۔

میرا جی چاہا کہ تمکنت میرے سامنے ہو اور میں اسے سینے سے لگا کر دھاڑیں مار کر روؤں۔ لیکن تمکنت وہاں نہیں تھی، وہاں تو بس کروڑوں نقطے تھے، پیچیدہ مشینیں اور نازک آلات جن کی ترسیل کر رہے تھے۔ میرے اور میری طرح دوسرے لاکھوں افراد کے گھروں میں رکھے ہوئے ٹی وی سیٹ پر یہ تصویریں آ رہی تھیں' میں انہیں کیا پرسہ دیتی، انہیں کیا گلے لگاتی۔

میں تمکنت کو پرسے کا خط بھی نہ لکھ سکی۔ مجھے لکھے ہوئے بے جان، بے روح اور سرد الفاظ سے نفرت ہے، میں انہیں لکھ کر کیا کرتی۔

کئی مہینے گزر گئے، پھر میں نے ایک دن کسی سے سنا کہ تمکنت لوٹ آئی ہے، اس کا شدید نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور ڈاکٹروں نے وطن کی آب و ہوا نسخے میں لکھی تھی۔

اس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ کس طرح اس کے سامنے جاؤں گی، اس سے کیا کہوں گی۔ میں نے کئی دن اسی شش و پنج میں گزارے لیکن اس سے ملاقات کو آخر میں کب تک ٹال سکتی تھی۔

وہ گھر جو کبھی خوشیوں سے چھلکتا ہوا' قہقہوں سے مہکتا ہوا ہوتا تھا، اب سروسامان سے بھرا ہوا محض ایک مکان رہ گیا تھا۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ اسے گلے لگاؤں، اس سے کچھ کہوں، اس سے کچھ پوچھوں۔

وہ مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں وہ ٹھہراؤ تھا جو طوفان زدہ سمندروں کے سینے میں ہوتا ہے۔ پھر وہ باتیں کرنے لگی، کچھ بامعنی، کچھ بے ربط باتیں، ہم دونوں نے ارم کا نام تک نہ لیا۔ ہم شاید اس کے نام سے، اس کے ذکر سے ڈرتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں ملازم نے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ تمکنت اور میں دونوں اٹھ

کر ڈائننگ روم چلے گئے۔ اسد کہیں گیا ہوا تھا اور گھر ہر چیز کے ہوتے ہوئے بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

میز پر کئی چیزیں تھیں اور ایک قاب میں تلی ہوئی مچھلی کے ٹکڑے تھے۔ میں حیرت سے اس قاب کو اور تلی ہوئی مچھلی کے ٹکڑوں کو دیکھتی رہی۔ مہارِشی جوگی سے ملنے کے بعد تمکنت کو مچھلی سے آخری درجے کا پرہیز ہو گیا تھا۔ پھر یہ کایا پلٹ میری سمجھ میں نہ آئی۔ میری آنکھوں میں یقیناً بہت سے سوال رہے ہوں گے، تب ہی تمکنت نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ قبروں کی تعظیم تو کرتے ہو نا؟ پھر اگر میں اپنی تیرتی ہوئی ممکنہ قبروں سے ڈرتی تھی، ان کا احترام کرتی تھی تو کیا غلط تھا؟ رشی جی نے مجھ سے کہا تھا کہ بڑی مچھلی تمہیں کھا لے گی، تب میں سمجھی تھی کہ میری موت شاید سمندر میں ڈوب کر ہوگی، میں مچھلیوں سے ڈرنے لگی تھی، مجھ سے چُوک تو بس یہ ہوئی کہ رشی جی کی بات سمجھ نہ پائی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ انہوں نے جس بڑی مچھلی کا ذکر کیا ہے وہ ریگ زارِ عرب میں پل رہی ہے۔''

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں۔ اس کے اندر بڑے خوفناک زلزلے آئے تھے اور ان زلزلوں نے اس کے وجود کی پرتیں الٹ پلٹ کر رکھ دی تھیں۔

''عجیب خوف تھا تمہارا کہ جس کے سبب تم نے ہزاروں روپے برباد کئے اور خوب تھے تمہارے رشی جی بھی۔'' میں نے چاہا کہ وہ کوئی اور بات کرے۔ قبروں کے اور موت کے ذکر سے میں گریز ہی چاہتی تھی۔

''میری جان، بربادی اور آبادی بڑی اضافی باتیں ہیں۔ ایک کی آبادی دوسرے کی بربادی ٹھہرتی ہے۔ ایک کی جان جاتی ہے تو دوسرے کی بھوک مٹتی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ زندگی سے بہتر ایکوریم ہیں۔ ان میں پلنے والی مچھلیاں ٹکڑوں میں بانٹ دی جاتی ہیں۔ چھوٹی اور بڑی مچھلیاں الگ الگ رکھی جاتی ہیں۔ صرف ایکوریم ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی بڑی مچھلی، کسی چھوٹی مچھلی کو نگل نہیں سکتی۔'' اس کی گفتگو سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن میں سب سے اہم مسئلہ بس یہی ہے کہ سمندر میں اور دریا میں

خانے کیسے بنائے جائیں، چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلی سے الگ کیسے رکھا جائے۔

میں اس کا دھیان بٹانے کے لیے اس سے اپنی بے خوابی کا ذکر کرنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کچھ دواؤں کے نام بتائے گی۔ ان Tranqulisers یا Sedatives کا تذکرہ کرے گی جو خود اس کے زیرِ استعمال تھیں۔ لیکن کوئی دوا تجویز کرنے کے بجائے اس نے اچانک ایک نہایت غیر متعلق سوال کیا۔ کہنے لگی۔ ''تمہیں وہ گنڈولا یاد ہے جو میں تمہارے لیے وینس سے لائی تھی؟''

''وہ میرے ڈرائنگ روم میں آج بھی رکھا ہوا ہے۔ کبھی اس کا رنگ کجلانے لگتا ہے تو میں Silvo سے اسے گھنٹوں اجالتی ہوں۔'' یہ بڑی غنیمت بات تھی کہ اس نے خود ہی دوسرا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ Tranqullisers کا ذکر نہ سہی، گنڈولے کی باتیں سہی۔

''جب میں تمہارے گھر آؤں گی تو تمہیں اس گنڈولے میں بیٹھنے والے کو دکھاؤں گی۔'' اس نے نیپکن تہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن گنڈولا تو خالی ہے، تم مجھے اسمیں بیٹھنے والا کہاں سے دکھاؤ گی۔'' میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''تم نے اسے غور سے نہیں دیکھا، اس میں تمہیں وقت بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ میرے کمرے میں جو گنڈولا ہے، وہ اس میں بھی بیٹھا رہتا ہے۔ راتوں کو جب مجھے نیند نہیں آتی تو میں اٹھ کر اسے دیکھتی ہوں۔ وہ گزران کی ڈور لیے بیٹھا رہتا ہے۔ اور پیہم شکار کرتا ہے۔ بڑا شکار، چھوٹا شکار، اس نے اپنی ڈور میں ہونے کا چارا لگا دیا ہے اور جب تم یا میں، یا ہم سب، اس چارے کو نگل لیتے ہیں تو اسی لمحے سے ہمارے نہ ہونے کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ کسی مشاعرے میں ایک دوہا سنا تھا، پہلا مصرعہ یاد نہیں، دوسرا مصرعہ کچھ یوں تھا کہ ''مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہے سارا جال۔'' اس وقت یہ مصرعہ سمجھ میں نہ آیا تھا، پھر جب میں نے اپنے گنڈولے میں بیٹھے ہوئے وقت کو دیکھا تب یہ بات سمجھ میں آئی۔ معاملہ کچھ یوں ہے کہ بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے، وقت اعداد میں بٹی ہوئی اپنی شباہتوں کو کھاتا ہے۔ میں وقت کا کھاجا ہوں۔ کاش میری ماں اور میرے باپ نے مجھے

ہونے کا چارا نگلنے پر مجبور نہ کیا ہوتا۔ کاش اس رات وہ ایک دوسرے کی طرف سے منہ موڑ کر سوتے جب میرے نہ ہونے کے سفر کا آغاز ہوا تھا۔''

وہ کسی زومبی کی طرح بول رہی تھی۔ لفظ اس کے ہونٹوں سے یوں گر رہے تھے جیسے پت جھڑ میں پتے پیڑ سے گرتے ہیں میرا دل بھر آیا، میں کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھانا ہم دونوں میں سے کسی نے نہیں کھایا تھا، بس ایک رسم تھی سو پوری ہوگئی تھی۔ زندگی بھر ہنسانے والی اب اپنی بہکی بہکی باتوں سے رلا رہی تھی۔

میں اسے پرسہ دینے آئی تھی لیکن میرے منہ سے لفظ نہ نکلا تھا۔ اس نے شاید میری لبریز آنکھیں دیکھ لیں، تب وہ میرے قریب آئی اور پرانے دنوں کی طرح اس نے میرے دونوں شانے تھام لیے۔ انگلیوں کی گرفت میں شدت تھی، لہجے میں تپش تھی۔

''تم نے ارم کے بارے میں کچھ نہ پوچھا مجھ سے۔'' اس کے لہجے میں شکایت نہ تھی، بس ایک کھوکھلا بیان تھا۔

میں ضبط نہ کر سکی، میں نے اسے دیکھا اور گردن جھکالی، آنسو آنکھوں کی قید سے آزاد ہو گئے۔

اس نے مشتری کی انگلی سے میرے ایک آنسو کو چھوا۔ ''سب مجھ سے اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کچھ تم بھی تو پوچھو۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''کیا پوچھوں۔ اب پوچھنے کو بھلا کیا رہا ہے؟'' میری آواز میں گہری نمی تھی۔

''ابھی تو سب کچھ پوچھنے سے رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر تم یہی نہیں جانتیں کہ میں Achilles تھی اور وہ Achiles Heel نا قابلِ تسخیر بدن میں قابلِ تسخیر حصۂ بدن' جانتی ہیں کہ اس مچھلی کا دوسرا نام کیا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''Achilles Heel کا دوسرا نام چھوٹی مچھلی ہے۔''

میرا جی چاہا کہ چیخیں ماروں' اُسے کیا ہو گیا تھا' یہ سب کیا ہو رہا تھا۔

''تم نے کام شاستر پڑھی ہے؟''

''تم شاید ہوش میں نہیں ہو۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ اس نے میری جھنجھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

''ہاں۔''

''اورانگ رنگ؟''

''ہاں، وہ بھی۔''

''اوپارشتکا جانتی ہو؟''

تمکنت کا ذہنی توازن واقعی ختم ہو چکا تھا۔ یہ دیوانوں کی باتیں تھیں جو وہ کررہی تھی۔ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر پوچھا۔ ''اوپارشتکا جانتی ہو؟''

اور میں اقرار کرتے ہوئے جھینپ سی گئی۔

''راجپوت مہاراجوں نے کھجراہو میں شیو اور وشنو کی نذر کے طور جو مٹھن مجسمے بنوائے تھے وہ دیکھے ہیں؟''

''وہ مندر نہیں دیکھے، ان کی تصویریں اور ان کی Tablets دیکھی ہیں لیکن خدا کے لیے کچھ اور باتیں کرو، تمہیں آخر کیا ہو گیا ہے۔'' میرے لہجے میں اب تلخی جھلکنے لگی تھی۔

''مندروں اور مجسموں کی باتیں نہیں کرتیں، نہ کرو۔ اپنی اور میری بات کرو کھیت اور کھلیان کی بات کرو۔'' وہ یوں ہنسی جیسے اندھے کنوئیں میں ابابیلیں چکرا رہی ہوں۔

''اب تم کھیت کھلیان کے چکر میں پڑ گئیں۔ کوئی بات تو ٹھکانے کی کرو۔'' میں نے الجھ کر کہا۔

''میں بے ٹھکانہ بات تو نہیں کر رہی۔ تم پڑھی لکھی ہو تمہیں تو نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم عورتیں مردوں کی کھیتیاں ہیں اور میری جان کھیتیاں تو بس اپنے مالک کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں۔ مالک جس طرح چاہے ان میں جا سکتا ہے۔''

''مجھے کھیتیوں سے دلچسپی ہے، نہ ان کے مالکوں سے۔ خاک ڈالو ان سب پر مجھے ارم کے بارے میں بتاؤ، اخباروں میں تو حادثے کی کوئی تفصیل نہیں آئی تھی۔''

''کھیتیاں جب مرتی ہیں تو ان کی موت کی تفصیل اخباروں میں نہیں آتی، میری ارم

بھی تو محض کھیتی تھی۔'' اس کی آواز سسکی سے مشابہ تھی۔

میرا سر چکرانے لگا تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ ارم کی موت سے سوا بھی کوئی بات ہے۔کوئی ایسی بات جس نے تمکنت کے اندر کا توازن ختم کر دیا ہے۔''تمکنت کچھ تو بتاؤ، کچھ تو کہو۔'' میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔

''میری جان تمہارے خیال میں کیا وہ کہانیوں کی شہزادی تھی کہ اس کی کہانی کا اختتام And They Lived Happily Ever After پر ہوتا؟ میں نے تو اسے زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سینڈرلا اور زندگی کو شیشے کی جادوئی گرگابی سمجھ بیٹھی تھی۔''

وہ الجھی الجھی بہکی بہکی باتیں کرتی رہی اور جب اس کی الجھی الجھی باتوں کی ڈور سلجھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ سمجھ دار وہ ہے اور نا سمجھ میں ہوں۔ اس کے ٹوٹے ٹوٹے جملے، اس کی بے ربط باتیں، میں ان کو جوڑتی گئی، سمجھتی گئی اور خود اپنے اندر مرتی گئی کہ بس یہی میرے بس میں تھا۔

ارم کو شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ کسی عرب شہزادے کی بیوی بننا کوئی ہنسی ٹھٹھول نہیں۔ وہ اس کی منکوحہ تھی اور عرب شہزادے کے بقول وہ اس کی کھیتی تھی اور کھیتی اس بات کی مجاز نہیں کہ وہ ہل چلانے والے کو اس بات پر ٹوکے کے ہل کھیتی کے آغاز سے چلایا جائے یا اختتام سے۔شارلٹ برونٹی، مارگریٹ مچل اور کارٹ لینڈ باربرا کے ناول پڑھنے والی ارم کا ذہن رومان کے دھندلکوں اور سرّیت کی تہ داریوں میں چھپی ہوئی جنس کے خواب دیکھتا تھا۔ یہ اس کی ماں کی غلطی تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کو کام شاستر اور اننگ رنگ نہیں پڑھوائی تھیں، کھجراہو اور بھوانیشور کے مجسمے نہیں دکھلائے تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ آل سدوم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ جو اپنی محبوباؤں اور اپنے محبوبوں کو یکساں برتتے تھے۔

جب ارم مشق ستم بنتی رہی تب اس نے ایک خط ماں کو لکھ کر روانہ کیا اور جان کے عوض آزادی خرید لی کہ بہر حال مرجانا آسان تھا اور زندگی کرنا مشکل۔ اس کا تابوت پہلے

آیا، خط بعد میں پہنچا وہ منو تو نہ تھی کہ کوئی وشنو مچھلی کے روپ میں آتا اور اسے بچا لیتا۔

میری بیٹی مجھے دور سے آواز دے رہی ہے۔ وہ خاصا آگے نکل گئی ہے اور میں ابھی تک Achilles Tang کے سامنے کھڑی ہوں۔ سمندری پانی ہلکورے لے رہا ہے انڈو پیسفک کی باسی رسان رسان تیر رہی ہے۔ یہاں یہ چھوٹی مچھلیوں کو نہیں کھا سکتی، یہاں یہ بڑی مچھلیوں کا نوالہ نہیں بن سکتی میں دہل کر اپنی بیٹی کو دیکھتی ہوں اور ایک ایسے ایکوریم کی خواہش کرتی ہوں جہاں وہ نہ چھوٹی مچھلی کو نگل سکے اور نہ بڑی مچھلیوں کا نوالہ بن سکے۔

○○

ساتویں رات

رات آسمانوں سے اترتی ہے۔ انجیر کے درختوں، انگور کی بیلوں اور بید مجنوں کی شاخوں پر آرام کرتی ہے۔ میرے چاروں طرف روشنی کا سراب ہے۔، بہت سی خوشبو ہے، سرسراتے ہوئے لمس ہیں۔ ان دیکھی راحتیں اور بن چکھے عذاب ہیں۔

یروشلم کی بیٹیو! میں سوچتی ہوں کہ کسی شام، رات کی طرح آسمانوں سے اتروں اور بنفشہ کے پھولوں پر، گیہوں کی بالیوں پر، بپھرے ہوئے سمندر پر آرام کروں۔ پھر وہ لمحہ آئے کہ آرام کا جھاگ روئیں روئیں میں اتر جائے۔ بپھری ہوئی موجوں کا عذاب رگ رگ میں پھیل جائے اور میں شانت ہو کر سو جاؤں مگر یروشلم کی بیٹیو مجھے نیند نہیں آتی اور نیند آئے بھی تو کیسے؟

یہاں اتنی بہت سی روشنی ہے، خواہش کی منڈیر پر نخوت اور انا کے چراغ جھلملاتے ہیں۔ ان چراغوں کی لو دھیمی ہو، ان کی روشنی ماند پڑے تو شاید میری آنکھیں نیند کی شبنم سے بھیگ جائیں۔ لیکن وہ لمحہ آج تک نہیں آیا جب ان چراغوں کی لو مدھم ہو، ہر طرف لمس کا ریشم بچھے، لمحے اندھے کنویں میں اتریں اور رات کو چین آئے۔

میں اس لمحے بھی جاگ رہی ہوں اور رات میرے پہلو میں ہے۔ یروشلم کی بیٹیو! کاش تم جان سکتیں کہ رات کا گرم، نرم اور سنولائی ہوئی خوشبو سے مہکتا ہوا بدن کس قدر دل آویز اور جان لیوا ہے۔ یہ کیسے متضاد دعوے ہیں، لیکن ایک دوسرے سے کس طرح

پیوستہ ہیں۔ انہی دو متضاد حالتوں نے مجھے اور رات کو یکجا کیا ہے۔

بے شمار لمحوں نے پہلو بدلا ہے۔ اور ہوا میں لپٹے ہوئے پتوں کی طرح شمال سے جنوب کی طرف اڑتے چلے گئے ہیں۔ ان کی اڑان کی سنسناہٹ کے ساتھ دو بول گونجتے ہیں۔کوئل کوکت ڈار ڈار اور گوری کرت سنگھار۔ بسنت کی خوشبو سے مہکتے ہوئے یہ بول نحن والقمر جہران کی نیم مشرقی اور نیم مغربی دھن میں گھل گئے ہیں۔ موسیقی تالاب کے چھلکتے ہوئے کناروں سے بہنے لگی ہے۔ میرے ہاتھ میں خفی سی لرزش ہے۔ سنہرے رنگ کے مشروب سے لبریز اور برف کی شفاف ڈلیوں سے کھنکتا ہوا گلاس اپنے کناروں سے چھلک گیا ہے۔ میرے پیروں کے نیچے شبنم ہے اور شبنم گھاس پر بچھی ہے۔ تالاب میں پانی ہلکورے لے رہا ہے۔ نحن والقمر جہران کی سحر آگیں لہریں کبھی اوپر اٹھتی ہیں، کبھی تھک کر سمندر سے لپٹ جاتی ہیں اور کبھی پلٹ کر ساحل کی طرف آتی ہیں۔

چاند، رات کے شامیانے میں ویزلی ہے اور تنہا ہے۔ میں عشق کی منزل میں ہوں اور تنہا ہوں، عشق کا شعلہ بھڑکتا ہے اور مشک کی خوشبو مجھے اپنے حصار میں لیتی ہے۔ روشنی ہے، خوشبو ہے، تنہائی ہے اور میں ہوں، میری ہتھیلیاں روشن ہیں، مشتری کی انگلی کے ابھار پر موجود حلقۂ سلیمان نے میرے وجود کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے۔ در عشق سلیمانم من ہمدم مرغانم۔ درویش حلقہ باندھتے ہیں اور سینے پر ھُو کی ضرب لگتی ہے۔ میری نگاہیں حلقۂ سلیمان پر قائم ہیں اور میں عالم رویا میں ہوں۔ درویشوں کی آواز منارے کی طرح بلند ہوتی ہے۔ فارغ از کار جہانم تنہا ھایاھُو...... حاصل سود و زیانم تنہا ھایاھُو۔ آوازوں کا اور نعرۂ ھُو کا ہجوم ہے۔ میں لخفہ، رمقہ، ہوا، ود، خلت اور حب کی منزلیں طے کرتی ہوئی ساتویں منزل تک پہنچتی ہوں اور عشق جہنم کے در کھول دیتا ہے۔

جہنم کا در کھلتا ہے اور شعلے میری طرف لپکتے ہیں۔ یہ شعلے نظر نہیں آتے لیکن روح کو چاٹ جاتے ہیں۔ یہ ایسی تپش ہے کہ انسان کا وجود جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ کوئی دھیمے دھیمے بولتا ہے۔ کسی کی آواز تالاب میں کنکر پھینکتی ہے۔ لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھئی راکھ، میں برہن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ۔

نہ کوئلہ ہے نہ راکھ ہے اور نہ میں ہوں۔ بس ایک عالم ہو ہے۔ تنہا ہو یا ہو۔ لفظ اور لفظوں کی ادائیگی، چہرے اور چہروں کے خدوخال۔ یہ سب کچھ سماعت اور بصارت کا سراب ہے۔ یہاں کوئی نہیں بولتا، سب خاموش رہتے ہیں۔ یہاں بولنے والے ڈھول بن کر اڑ جاتے ہیں۔ اور سننے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ یہاں کچھ نہ کہو کہ کچھ کہنا اپنے سینے سے دشمنی ہے اور یہاں کچھ نہ سنو کہ سننے کی سزا پتھر کی قید ہے۔

ہر سزا میرے علم میں ہے اور ہر عذاب میرے نصیب میں ہے۔ لیکن یروشلم کی بیٹیو! سزا کو پہنچنے سے پہلے میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے پہلے بھی تم سے بہت کچھ کہا تھا اور اب بھی میں تم ہی سے کہتی ہوں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ میں کب نہیں تھی اور کہاں نہیں تھی اور اے یروشلم کی بیٹیو تم کب نہ تھیں اور کہاں نہ تھیں۔ صیون کی پہاڑیوں سے مو آب کی وادیوں تک، کنعان سے سامرہ کی بستیوں تک، اور پھر اس کے بعد بھی ہم کہاں کہاں نہ رہے۔ دشت وصحرا میں، شہر وقریہ میں۔

یروشلم کی بیٹیوں کا اور شولمیت کا ساتھ قدیمی ہے۔ تمہارا اور میرا ساتھ پرانا ہے۔ میں کہتی رہی ہوں۔ تم سنتی رہی ہو۔ تمہیں سلیمان نے پکارا ہے۔ تمہیں شولمیت نے آوازیں دی ہیں۔ تم شولمیت اور سلیمان کے نامکمل مثلث کی تکمیل ہو۔ اور تم کہ اس تکون کی تکمیل ہو، اس کی آخری لکیر ہو، دیکھو کہ دو مثلث باہم پیوستہ ہیں، ایک وصل کا اور ایک فراق کا مثلث ہے۔ ہزاروں برس پہلے میں آگ تھی اور وصل کے راستے پر گئی تھی۔ آج میں آب ہوں اور ہجر کا راستہ اختیار کرتی ہوں۔

یروشلم کی بیٹیو! تم وصل میں میرے ساتھ تھیں اور ہجر میں بھی میں تم ہی کو پکارتی ہوں۔ دیکھو کہ جب وصل کے مثلث سے فراق کا مثلث ملتا ہے۔ تو خاتمِ سلیمان وجود میں آتی ہے۔ یہ خاتم مجھے اپنا چہرہ دکھاتی ہے تو میرے وجود میں شعور اور غیر شعور کا قران ہوتا اور میں درویشوں کے اس حلقے میں شامل ہو جاتی ہوں جو دنیا کی لذتوں سے رشتہ توڑتا ہے اور لحظہ، رمقہ، ہوا، ود، خلت اور حب کی منزلوں سے گزر کر عشق کی منزل تک پہنچتا ہے لیکن وصل کی راہ سے منہ موڑ لیتا ہے۔

میں درویشوں کے حلقے میں شامل ہوئی۔ میں وصل کی شبنم سے بھیگی ہوئی ردا اتار چکی ہوں، میرے بدن پر نخوت کا لبادہ ہے۔ میں اپنا پُرغرور سر اٹھاتی ہوں اور افق کی طرف نگاہ کرتی ہوں۔ یروشلم کی بیٹیو! تم شولمیت اور سلیمان کے نامکمل مثلث کی تکمیل ہو، تم بھی افق کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ سلیمان کا رتھ چلا آتا ہے۔ وہ بیابان سے دھوئیں کے ستون کی مانند چلا آتا ہے۔ وہ شہسواروں کی سی شان سے آتا ہے، مسافروں کی سی تیزی سے آتا ہے اور محبوبوں کی سی عشق انگیزی سے آتا ہے۔ درعشقِ سلیمانم' من ہدم مرغانم ......

میں اس کا سورج کی طرح روشن چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں لیکن میں اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہوں۔ میں اس کے عشق کی بیمار ہوں پر میرا عشق مغرور ہے۔ اس شوربخت نے انکسار نہیں سیکھا، اسے نیازمندی کے اور سپردگی کے آداب نہیں آتے۔ میں اس شخص سے منہ پھیر لیتی ہوں۔ میں اس کے وجود کو اپنی حساس انگلیوں سے چھونا چاہتی ہوں، مگر نہیں چھوتی۔ میں سربلند ہوں، میں پُراز غرور ہوں۔ میں اس شخص کی ہنسی نہیں سنتی جو میرے سامنے کھڑا ہے اور مجھ سے مخاطب ہے۔ اس شخص کا پتا میں نے شہر پناہ کے محافظوں سے پوچھا تھا لیکن اب جب کہ وہ میرے سامنے ہے تو میں اس سے نگاہیں نہیں ملاتی، میں اس کے شیر کی ایال جیسے بالوں پر بھی نظر نہیں کرتی۔ میں اپنے آپ سے ڈرتی ہوں' عشق نے میرے باطن میں نقب لگایا ہے۔ اور میرے وجود کی بنیادوں میں بارود بچھا دی ہے۔ میں بہت کمزور ہوں، اسی لیے پُرازغرور ہوں۔

یہ شخص مسافر ہے اور نادان ہے۔ اسے کچھ نہیں معلوم، وہ میرے غرور کو میری کمزوری نہیں سمجھتا اور میری بے نیازی پر غور نہیں کرتا۔ یہ اس بات سے ناواقف ہے کہ بعض روحیں استعارے اور کنائے برتنے کی عادی ہوتی ہیں۔

میں عشق کی بیمار تھی اور میرا دل پُرآزار تھا۔ وہ شخص کہ جس کا چہرہ میں نے جاگتے میں نہ دیکھا تھا، اسی روشن چہرے کو محوِ خواب دیکھنے کی خواہش نے مجھے تباہ کر دیا۔ وہ اس کے قیام کی پہلی رات تھی اس رات میں نے اپنے حجرے کی دیوار کو ناخنوں سے کھرچ کر

پیازی کاغذ کی طرح کر دیا۔ اور دیوار اتنی شفاف ہوگئی کہ میں دوسری طرف سوئے ہوئے اس روشن چہرے والے کو دیکھ سکتی تھی جس کے شیر کی ایال جیسے بال شیرازی کبوتروں جیسے سفید تکئے پر بکھرے ہوئے تھے۔ جس کے چہرے پر خوابوں کی تھکن کا پسینا تھا اور جس کے سینے پر سیاہ انگوروں کے گچھے پھیلے ہوئے تھے۔ تو یوں ہوا کہ میں سیاہ انگوروں کی فصل کو دیکھ کر خواہش کے بوجھ سے نڈھال ہوگئی لیکن یروشلم کی بیٹیو! میں نخوت کا لبادہ پہن چکی تھی۔ اور تم نے بھی مجھے سپراندازی کے نکات تعلیم نہیں کئے تھے، اس لیے میں اپنے بستر پر گر پڑی اور میں نے گریہ کیا۔

میں نے گریہ کیا، میں نے تمھیں یاد کیا اور گزرے زمانوں کو اپنے اندر دہرایا میں نے سوچا کہ ابھی تو چھ راتیں باقی ہیں۔ اب جب رات آئے گی تو میں اس پیازی کاغذ کو نوچ کر پھینک دوں گی، پھر نخوت کا لبادہ اتاروں گی اور رات کے دامن میں اپنی عرق آلود پیشانی کو خشک کر کے اس جہان سے اُس جہان تک سفر کروں گی اور اس سفر کے دوران تتلیوں کے رنگ، جگنوؤں کی دمک اور بیر بہوٹیوں کی سرخی دوسرے جہان میں پھیل جائے گی۔

لیکن یروشلم کی بیٹیو! ہوا کچھ یوں کہ جب دوسری رات آئی تو میں نے دیکھا کہ میرے اور اس کے حجرے کی درمیانی دیوار پہلے کی طرح سنگلاخ ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے تہیہ کیا کہ آج کی رات اس دیوار کو اپنے ناخنوں سے چھیل کر ہی اٹھوں گی۔ وقت کے سمندر پر میرے وجود کی ناؤ آگے کی طرف سفر کرتی رہی، پھر جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو دریچے کے باہر صبح کسمسا رہی تھی اور وہ بستر پر پہلو بدل رہا تھا۔ کاغذ کی اس دیوار کو ناخنوں سے نوچ کر پھینک دینے کا وقت اب نہیں رہا تھا۔

اسی طرح چھ راتیں گزر گئیں، فراق کی چھ صدیاں، خواہش کے چھ قرن، پہلی رات میں لحظہ پہنچی۔ دوسری رات رمقہ سے گزری، تیسری رات ہوا کے ساتھ گزاری۔ چوتھی رات ود میں بسر ہوئی پانچویں رات خلت میں ٹھہری اور چھٹی رات میں نے حب میں قیام کیا۔

دن کاغذ کی دیوار کو سنگلاخ سے بدل دیتا اور رات بھر انگلیاں لہولہان کرنے کے بعد

جب وہ سامنے ہوتا اور میرا وجود خواہش کے عذاب سے ہلکان ہو جاتا تو وشت و بیاباں سے تنہا ہو یا ہو کی آواز آتی اور میرا دامن تھام لیتی اسی طرح یہ چھ راتیں گزر گئیں۔ دن میں نے بے نیازی کے عالم میں بسر کئے اور راتوں کو جب میں نے اس کی طرف سفر کرنا چاہا تو وہ مجھ پہ بے خبر اپنے بستر پر سوتا رہا اور اس کے چہرے پر خوابوں کی دھند پھیلتی رہی۔

رات اندھے کنویں کی سیڑھیاں اتر رہی ہے اور آج میرے جاگنے کی ساتویں رات ہے۔ آج کے بعد نہ رات آئے گی اور نہ دن گزرے گا۔ میرے دامن میں قوسِ قزح کے رنگ کی تتلیاں، یاقوت کی طرح دمکتی بیر بہوٹیاں اور ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے جگنو ہیں۔ لیکن میرے ہاتھ پتھر کے ہیں، میرے لباس کی سلوٹیں پتھر کی ہیں اور میرے پیروں کی جنبش بھی پتھرا گئی ہے۔ یروشلم کی بیٹیو! میں جانتی ہوں کہ آج کی رات کے بعد کوئی رات ایسی نہیں آئے گی جب وہ اس شہر میں ٹھہرے۔ میری انگلیوں سے خون ٹپکتا ہے اور میرا بدن سورج کی تمازت سے دہکتے ہوئے صحرا کی طرح تپتا ہے۔ کاغذی دیوار کے اس طرف وہ سو رہا ہے۔ رات ابھی باقی ہے، میں نخوت کا لبادہ اتار کر اور رات کے دامن سے اپنی عرق آلود پیشانی خشک کر کے اس کی طرف سفر کر سکتی ہوں۔ میں چاہوں تو لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ دیوار کہیں نہ رہے، پھر خیال آتا ہے کہ دیوار کے دوسری طرف قدم رکھتے ہی فراق کی یہ گھڑیاں جو بہت جان لیوا اور خوبصورت تھیں گزر جائیں گی۔ یہ ساتویں منزل جو عشق کے نام سے موسوم ہے، بگولہ بن کر اُڑ جائے گی اور اس کے ساتھ ہی میرا وجود بھی گرد ہو جائے گا۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اس شخص کا فراق مجھے کس قدر عزیز رہا ہے جبکہ وصال تو ایک ایسی شفاف ندی ہے جسے دیکھو تو اس کی تہ میں بچھے ہوئے سنگریزے بھی صاف نظر آتے ہیں۔ یہ ندی اپنے اندر کوئی رمز نہیں رکھتی۔ اور فراق کائنات کے عمیق ترین سمندر کی مانند ہے جس کی گہرائی تک کوئی نہیں پہنچا، میں بھی نہیں پہنچوں گی۔ اس سمندر میں ستاروں کی مانند ان گنت اسرار اور رمز ہیں۔ اس کی تہ سے بیشمار چھوٹے اور بڑے دریا ابلتے ہیں۔ احساس کے ہزاروں رنگ پھیلتے ہیں اور خیال کی بے حساب خوشبو پھوٹتی ہے۔

میں سوچتی ہوں یروشلم کی بیٹیو کہ ندی میں جھانک کر چند سنگریزوں کو بھلا کیا دیکھوں، یہ تو ان پرندوں کو بھی نظر آ جاتے ہیں جو صرف ایک قطرے کے لیے اس ندی میں اپنی چونچ ڈبوتے ہیں۔ مجھے سمندر میں اترنا چاہیے جس کا سینہ فراخ ہے، جس کے ان گنت روپ ہیں اور کتنے ہی بہروپ۔ میں لہولہان انگلیوں کو دیکھتی ہوں اور کاغذ جیسی دیوار کو اور اس بستر کو جس پر ایک نادان آرام کر رہا ہے۔ پھر ساتویں رات کی موت سے پہلے سمندر میں اتر جاتی ہوں۔

یروشلم کی بیٹیو! تم گواہ رہنا کہ تمہاری شولمیت نے عشق کی شراب اپنے سینے میں انڈیلی اور وصل کی مے کو اپنے ہاتھوں سے وقت کی ریت پر بہا دیا۔ میں جانتی تھی کہ:

"عشق موت کی مانند مضبوط ہے
اور غیرت عالم اسفل کی طرح سنگ دل
اس کا بھڑکنا آگ کا بھڑکنا ہے
اس کے شعلے خداوند کے شعلے ہیں
سیلاب عشق کو بجھا نہیں سکتا
طغیانی اس کو ڈبو نہیں سکتی۔"

یروشلم کی بیٹیو! شولمیت تم سے بڑی گواہی بھلا اور کس کی لائے گی۔ گواہ رہنا کہ میں عشق کی منزل میں ٹھہری۔ پھر ہجر کی راہ اختیار کی اور اب کبھی ختم نہ ہونے والے سفر میں ہوں۔

○○

زرد ہوائیں، زرد آوازیں

خوش نما اور مزین گھڑی ہوا سے جھول رہی ہے۔ اس کے وسط میں بیٹھی کوئل اپنی چونچ کھولتی ہے اور کوکنے لگتی ہے، ایک دو تین۔ وہ گیارہ مرتبہ کوکتی ہے پھر خاموش ہو جاتی ہے۔ میں اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر اسے دیکھتی ہوں۔ یہ جو ابھی لمحہ بھر پہلے زندہ ہوئی تھی اب پھر خاموش ہوگئی ہے۔ ساکت وصامت، منجمد۔

رات کے گیارہ بج گئے حالانکہ یوں محسوس ہورہا ہے جیسے شام نے ابھی چند ساعت پہلے آنکھ کھولی ہو۔ دور سے پٹاخوں کی آواز آرہی ہے۔ لڑکے شب برات منانے میں مصروف ہیں۔ چند گھنٹے پہلے جب میں یہاں آرہی تھی تو شہر میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی، پھلجھڑیاں، پٹاخے، انار، آگ کے پھول بنتے ہوئے بلند ہورہے تھے پھر بجھ کر زمین پر گر رہے تھے۔

انسانوں کا، آوازوں کا، قہقہوں کا اور مداراتوں کا ہجوم ہے پھر بھی کیسی تنہائی ہے۔ جیسے ہُو کا عالم ہو، جیسے یہاں کوئی سانس بھی نہ لیتا ہو، ہجوم تو محض دل بہلاوا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

کھانا ختم ہوئے دیر ہو چکی اب کو نیک کا دور چل رہا ہے۔ بلوریں پیانوں میں ارغوانی شراب چھلک رہی ہے۔ سر شام سے ہی دوستی کے نام پر، محبت کے نام پر اور زندگی کے نام پر پیانے خالی ہورہے ہیں۔ کچھ دیر پہلے دھیمی آواز میں روی شنکر کی انگلیوں کا جادو

جاگ رہا تھا اور ستار کی جان لیوا آواز سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ قہقہوں، باتوں اور پیالوں کی کھنک پر اب کسی اور کی آواز کا سایہ ہے۔ طبلے کی آواز سے دل پر چوٹ لگتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اب کسی اور کی وحشی رہوار جو دل کو اپنی ٹاپوں سے روند رہا ہے۔

رات کے سناٹے میں ریل کی سیٹی کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہے اور میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ ریل کی آواز مجھے ہمیشہ بہت اداس کرتی ہے۔ دور جاتی ہوئی، معدوم ہوتی ہوئی آواز۔ بچپن کی عجب سرّیت آمیز اور دل گرفتہ یادیں ہیں جو اس آواز کے ساتھ لپٹی چلی آتی ہیں۔

ریل قبرستان کے پہلو سے گزرتی ہے اور میں ان شکستہ اور پختہ قبروں کو دیکھ رہی ہوں جو ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دھنسی ہوئی بے چراغ قبریں۔ شام ان قبروں کے کتبوں پر بسیرا کر رہی ہے۔ جابجا اُگے ہوئے بیری کے پیڑوں پر بیٹھی چڑیاں ریل کی آواز سے دہشت زدہ ہو کر اڑ رہی ہیں۔

''اماں ریل کی آواز سے ان لوگوں کو کتنا ڈر لگتا ہوگا؟ قبر میں تو یوں بھی ڈر لگتا ہے نا؟'' میں اماں سے کہتی ہوں۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جانے کہاں کہاں کی واہیات باتیں دماغ میں بھر گئی ہیں۔'' اماں مجھے جھڑک دیتی ہیں اور میں کھڑکی سے سر باہر نکال کر پیچھے رہ جانے والی قبروں کو دیکھتی ہوں، یہ لوگ قبریں اتنی تنگ کیوں بناتے ہیں کہ آدمی کروٹ بھی نہ لے سکے، میں سوچتی رہتی ہوں اور پھر ریل کی مسلسل حرکت سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔

ریل گڑھ مکتیشر کے پل سے گزرنے والی ہے۔ لوگ اٹھنیاں، چونیاں اور دونیاں ہاتھوں میں دبائے بیٹھے ہیں۔ ابھی ریل شور مچاتی ہوئی گڑھ مکتیشر کے پل پر چڑھے گی تب بہت سے ہاتھ کھڑکیوں سے باہر نکلیں گے اور اپنی آرزوؤں اور مرادوں کو ان سکوں سے متعلق کر کے گنگا میا میں پھینک دیں گے۔ گنگا جی ہماری نذر لو اور ہمیں بامراد کرو۔

گزھ مکٹیشر کا پل ریل کے نیچے سے گزرا جارہا ہے۔ سکے اچھل رہے ہیں۔ سکے لوہے کے شہتیروں سے ٹکرا کر پل پر گرر ہے ہیں۔ سکے گنگا کے چوڑے سینے میں اتر رہے ہیں۔ لوگوں کو سکے پھینکتے دیکھتی ہوں تو بے تاب ہو جاتی ہوں۔ ''اماں میں بھی پیسا پھینکوں گی، مجھے ایک گڑیا چاہیے۔ اماں صرف ایک دُونیٔ۔'' بہت دنوں سے میں ایک سوتی جاگتی گڑیا کے خواب دیکھ رہی ہوں اور اس لمحے مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے گنگا میا میں ایک دُونیٔ بھی پھینک دی تو مجھے سوتی جاگتی گڑیا مل جائے گی۔ میں اماں کے سامنے مچلنے لگتی ہوں۔ اور اماں مجھے جھڑک دیتی ہیں۔ ''بے کار باتیں مت کرو، یہ سب ہندوؤں کی خرافات ہیں۔'' وہ بہت حقارت سے اس ہندو لڑکی کو دیکھتی ہیں جس نے چند لمحے پہلے سکہ پھینکا ہے اور بہت خوش نظر آرہی ہے۔

''اماں میں مسلمان گڑیا کے لیے پیسا پھینکوں گی'' میں انہیں یقین دلاتی ہوں لیکن وہ میری بات کا یقین نہیں کرتیں، مجھے ایک بار پھر جھڑک دیتی ہیں۔

گزھ مکٹیشر کا پل پیچھے رہا جاتا ہے، گنگا پیچھے رہ جاتی ہے اور میں ریل کی کھڑکی سے سر ٹکا کر رونے لگتی ہوں۔ آنسو میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں اور زنگ آلود کھڑکی کی درز میں گم ہو رہے ہیں۔

ڈرائنگ روم قہقہوں کی آواز سے گونجنے لگتا ہے، میں پلٹ کر دیکھتی ہوں کاظم کی ہتھیلی پر ایک سکہ چمک رہا ہے اس کے چہرے پر شراب اور سرخوشی کی دمک ہے سب لوگ اس کے قریب کھڑے ہنس رہے ہیں۔

''کاظم نے کون سا معرکہ سر کرلیا ہے؟'' میں پوچھتی ہوں۔

''رحمٰن اور کاظم دونوں ہی سلمیٰ کو اس کے گھر چھوڑنا چاہتے تھے۔ فیصلے کے لیے ٹاس ہوا تو کاظم جیت گیا۔'' مسز مائیکل ہنس کر بتاتی ہیں۔ سلمیٰ کے چہرے پر فتح مندی کا غرور ہے۔ اسکا وجود دو مردوں کے درمیان کشمکش کا سبب ہے۔ اس سے خوبصورت بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ ہنستی ہے اور ہاتھ ہلاتی ہوئی کاظم کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے۔

رحمٰن کے چہرے پر شکست کی دھند ہے لیکن اس دھند کی خبر اس سکے کو نہیں جس سے

دو انسانوں کی مراد متعلق تھی، جس نے ایک کو بامراد کیا اور دوسرے کو نامراد لیکن بامرادیوں اور نامرادیوں کا قصہ بہت طویل ہے۔ ہم کسی ایک سکّے کو بھلا کیا دوش دیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سکّہ موجود ہوتا ہے لیکن وہ سکہ رائج الوقت نہیں ہوتا، بازار میں نہیں چلتا۔ وہ جو صدیوں سوتے رہے تھے اور اٹھے تھے تو یہ سمجھ کر کہ شاید ایک دن اور ایک رات سوتے رہے ہیں جیب میں کھنکتے ہوئے سکّے لے کر بازار چلے گئے تھے جن پر شہنشاہ دقیانوس کی ضرب تھی لیکن شہنشاہ دقیانوس کا ذکر تو بس کتابوں میں رہ گیا تھا اور اس کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکوں سے اب کچھ بھی نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ اس لمحے ان سونے والوں نے اپنے آپ کو کتنا نادار محسوس کیا ہوگا، تہی دامن، تہی دست اور مفلس۔

لیکن میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں۔ میرے پاس تو وہ سکّہ ہی نہیں جس سے اپنی ایک آرزو متعلق کر سکوں۔

کچھ لوگ چلے گئے ہیں، پھر بھی ڈرائنگ روم میں ابھی خاصے لوگ موجود ہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس پینٹنگ کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہوں جس نے اس کشادہ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار کو زیب و زینت بخشی ہے۔ یہ لورنیز ولوٹو Lornzo Loto کا ری پرنٹ ہے۔ ساڑھے چار سو برس پرانی اس پینٹنگ میں ایک عجیب سرّیت ہے۔ پس منظر میں توانا مردوں کے بدن ہیں، سنگ مرمر میں ڈھلے ہوئے' کسی کا دھڑ نہیں ہے اور کسی کا سر غائب ہے۔ دعوت نظارہ دیتے ہوئے اپنی طرف بلاتے ہوئے، پیش منظر میں اوڈونی ہے۔ اوڈونی کا ہاتھ جس میں کسی دیوی کی شبیہ کا طلائی عطردان ہے آگے بڑھ رہا ہے، یوں جیسے وہ اس طلائی عطردان کو دینے کا خواہاں ہے اور آنکھوں میں سوال ہے، بولو، بتاؤ، اس عطردان کے عوض کیا دو گے؟ کتنے لیرا؟ کتنے پیستا؟ کتنے درہم و دینار؟ کتنے روپے؟ اوڈونی کا دوسرا ہاتھ میز پر ٹکا ہوا ہے، میز پر سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہے۔ اس کپڑے پر طلائی سکّے بچھے ہیں۔ یہ سکّے جو کینوس کی بنت میں اور رنگوں کی آمیزش میں مقید ہیں، یہ جب موجود ہوں گے تو جانے کن کن ہاتھوں سے گزرے ہوں گے ان سے کیا کیا خریدا گیا ہوگا؟ آرزوئیں، مرادیں، خواہشیں، وہ خوشبو کی شکل میں ہوں' رس بھرے پھلوں یا حسین

اور نو جوان کنواریوں کی شکل میں، آرزو، تمنا، مراد۔

یہ کتنے سادہ اور چند حرفی لفظ ہیں لیکن ان سے زیادہ کثیر المعنی لفظ بھلا اور کیا ہوں گے۔ سوتی جاگتی گڑیا، شراب کا جرعہ، خوشبو، مرد، عورت، ریشم، کتابیں، زیور، رنگین پردے، مجسمے، موسیقی کے مجموعے، وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارتیں، یہ سب اور دوسری ہزاروں، لاکھوں چیزیں جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی آرزو، تمنا اور مراد ہیں۔ یہ سب چیزیں جو سکوں سے خریدی جاتی ہیں۔ سکے جو کبھی بامراد کرتے ہیں اور کبھی نامراد۔ لیکن کبھی کوئی ایسی آرزو بھی ہوتی ہے جو خریدی نہیں جا سکتی، اس مراد کے لیے گنگا میا میں سکہ پھینکنے کی ہمت بھی نہیں کی جا سکتی۔

میں پلٹ کر کافی ٹیبل تک جاتی ہوں اور اپنا گلاس اٹھا کر کونیک کا ایک گھونٹ بھرتی ہوں اور مجھے اماں کا خیال آتا ہے۔ اس لمحے اماں مجھے دیکھ لیں تو شاید اماں کا کلیجا پھٹ جائے۔ وہ مر جائیں۔ وہ جنہیں اپنے خون کی نجابت اور شرافت پر اندھا یقین ہے، وہ جنہوں نے گڑھ مکتیشر کے پل سے گزرتے ہوئے مجھے ایک دونیّ تک نہ دی تھی۔ آخر سوتی جاگتی گڑیا کی آرزو کیوں کی جائے؟ دھنک رنگ خواب کیوں دیکھے جائیں؟ وہ اماں جو مجھے ہر بات پر جھڑک دیتی تھیں، ان کا خیال تھا کہ بیٹیوں کا دل مار کر رکھنا چاہیے، ان کی کوئی خواہش پوری نہیں کرنی چاہیے، جانے کس گھر جائیں، جانے کس کے پلّے بندھیں۔ اماں کا فلسفہ بھی کیسا نرالا تھا لیکن اس فلسفے کے سہارے انہوں نے اپنی زندگی کس قدر سکون اور دھیرج کے ساتھ گزار دی۔

اماں کے اور میرے درمیان جو پل تھا اس پل کے نیچے سے بہت سا وقت لمحہ لمحہ کر کے بہہ گیا ہے اور اب میں چاہوں بھی تو اس پل کو عبور کر کے اماں تک نہیں پہنچ سکتی۔ مجھے جب اسکالرشپ ملی اور اماں نے مجھے اپنے سے جدا کیا، اس وقت انہیں معلوم نہ تھا اور میں بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ دائمی جدائی ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں کئی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے لیکن ہمارے درمیان جدائی بڑھتی رہی، ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے رہے۔ اماں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

ٹورنٹو، مانٹریال، لندن، روم، میڈرڈ۔ یونیورسٹیاں، میوزیم، لائبریریاں، آئل فائننگ، مجسمے، رقص، زندگی، رعنائیاں، میں نے دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا، میں نے کتابوں کو اپنے نقطۂ نظر سے پڑھا، میں نے زندگی گزارنے کے لیے اپنے اصول بنائے اور شاید مجھ میں اماں کی نجابت، اماں کے خون کا بس اتنا ہی اثر رہ گیا تھا کہ میں نے پھر وہ اصول نہ توڑے۔

کیسی وحشت ہے. کتنی رونق ہے، کیسی تنہائی ہے، کتنا ہجوم ہے، یادیں حلقہ باندھتی ہیں، ہم تمہیں یوں نہیں جانے دیں گے، ہماری زنجیرزنی دیکھو، ہمارے وجود سے رستا ہوا لہو دیکھو۔

میری آنکھوں میں سرخ رنگ پھیلنے لگتا ہے۔، سرخ رنگ، وصال کا رنگ، سرخ رنگ، ہلاکت کا رنگ، میں بے تاب ہو کر اٹھتی ہوں اور کئی جاننے والوں کے جملوں کو مسکراہٹ سے ٹالتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل آتی ہوں۔ برابر مسٹر مارسل کی اسٹڈی ہے۔ دن کی روشنی میں کئی مرتبہ اسٹڈی میں آئی ہوں، بیٹھی ہوں، باتیں کی ہیں، کتابیں دیکھی ہیں لیکن رات میں اس کمرے کی عجیب ادا ہے، کتابوں، صوفوں، پردوں، قالین اور تازہ پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہے۔

میں اسٹڈی کا دوسرا دروازہ کھولتی ہوں اور ٹیرس پر نکل آتی ہوں۔ ٹیرس پر بڑے بڑے گملوں میں پودوں کی نہ جانے کتنی قسمیں ہیں، کیکٹس، کروٹن، ربر پلانٹ، چاندنی پتوں پر بچھی ہے، فرش پر سوئی ہوئی ہے۔ کچھ دور پر بحیرۂ عرب کا جھاگ اڑاتا سر پٹکتا پانی ہے، چاندنی لہروں میں گھل گئی ہے اور سیال ہو کر بہہ رہی ہے۔ سمندر کی خوشبو بڑھی چلی آتی ہے، یوں جیسے امیت بڑھا چلا آتا ہو۔ میں سمندر کی خوشبو سے امیت کے خیال کو کبھی جدا نہ کر سکی شاید اس لیے کہ ہم دونوں پہلی مرتبہ سمندر کے کنارے ملے تھے۔

میں اپنے گروپ کے ساتھ چھٹیاں گزارنے روڈز Rhodes گئی ہوئی تھی، ہم اسی صبح وہاں پہنچے تھے اور پلیس سوفو کلیز پر پنشن شیو طیس میں ٹھہرے تھے۔ وہ جولائی کی ایک گرم دوپہر تھی اور میرے تمام ساتھی Rodini Wine Festival میں شرکت کے لیے

بے تاب تھے۔ میری طبیعت روڈز پہنچتے ہی خراب ہوگئی تھی اور سفر کی تھکن بھی بہت تھی اس لیے میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ سب لوگ چلے گئے۔ وہ پہلے شہر میں گھومنے کا ارادہ رکھتے تھے پھر فیسٹیول میں شریک ہونے کا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں پڑی سوتی رہی۔ جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ میں نہا کر نکلی تو طبیعت بہت بہتر تھی۔ میں نے اپنا پرس اٹھایا اور تنہا نکل کھڑی ہوئی۔

شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے Palace of The Knights کی فصیلوں اور اور برجیوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پریوں کی کہانی سے کوئی قلعہ نکل کر سامنے آ گیا ہو۔ میں اپنے خیالوں میں مگن چلتی رہی۔ اجنبی لوگ سائے کی طرح میرے برابر سے گزر رہے تھے، اجنبی زبانوں میں گفتگو کرتے ہوئے۔ ایک لڑکی پیڑ سے ٹکی کھڑی تھی اور لڑکا اس پر جھکا ہوا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا اور گرم بوسہ نمو پذیر تھا۔ ایک میدان میں کچھ ٹورسٹوں نے چھوٹے چھوٹے دو خیمے لگا رکھے تھے، ان کی وین بھی برابر میں کھڑی تھی، اب وہ لوگ خیموں سے ذرا فصل پر آگ جلا کر کھانے پکانے میں مصروف تھے۔ حسین لڑکیاں، خوش قامت لڑکے، مچھلی کی طرح تڑپتی پنڈلیاں، سونے کے بالوں کی طرح چمکتے بال، گاتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے مست الست۔

چلتے چلتے میں سمندر کے کنارے پہنچ گئی، وہاں قدرے سناٹا تھا اور لوگ بھی کم کم تھے، سمندر کی خوشبو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بحیرۂ قلزم کے نیلگوں پانی پر رات کا اندھیرا اتر آیا تھا اور تاروں کی جھلمل لہروں پر چاندی کی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس لمحے میرے کانوں میں ایک آشنا آواز آئی۔ جل تھل ناچے، جنگل ناچے، ناچے من کا میور، جیون کا سکھ آج پربھو، موہے جیون کا سکھ آج

میں نے اس آواز کو سنا اور ٹھٹھک کر رہ گئی، ہم زبانی کی خوشبو سمندر کی خوشبو میں گھل گئی، میری مٹی کی خوشبو آواز میں ڈھل کر فضا میں پھیل رہی تھی۔ میں آواز کی سمت بڑھی۔

وہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے دلی سینٹر میں لائبریرین تھا' لائبریری سائنس کے ایک مختصر کورس کے سلسلے میں انگلینڈ آیا ہوا تھا اور اب چھٹیاں گزارنے روڈز چلا آیا

تھا۔ ہم زبانی اور ہم وطنی کے احساس نے ہم دونوں کو خوشی سے معمور کر دیا۔ ہم دونوں ریت پر بیٹھے اپنے اپنے شہروں کی باتیں کرتے رہے۔ سمندر کی جھاگ اڑاتی موجیں ہم دونوں کو شرابور کرتی گزرتی رہیں، سمندر ہمارے سامنے تھا اور ہم اس سے بے نیاز رہے۔ کتابیں، موسم، گیت، شاعر، ایتھنز، ایمفی تھیٹر، سوفو کلیز، ایکروپولس، پارتھینان، دیویاں، دیوتا، تہوار۔ یونانی تہواروں کے ذکر پر ہم دونوں کو بیک وقت یاد آیا کہ اس وقت Rodini Wine Festival اپنے عروج پر ہوگا۔ ہم جب وہاں پہنچے تو رات نے اور موسم نے ہر شخص کو اپنے سحر میں اسیر کر رکھا تھا۔ وہ رات جو چھلکتے ہوئے پیمانوں، کوئلے کی آنچ پر سنکتے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو، قہقہوں، تیز موسیقی، بے تکان رقص اور مستی سے عبارت تھی۔

وہ ہماری دوستی کا آغاز تھا، ایسا آغاز جس نے ہم دونوں کو برباد کیا۔ امیت کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے دو بچے تھے اور مجھ سے ملاقات کے لمحے تک اسے اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ محسوس ہوئی تھی۔ لیکن اماں کے بقول میں تو پیدائشی سبز قدم تھی۔ پیدا ہوئی تو باپ کو کھا گئی۔ بڑی ہوئی اور پڑھنے الٰہ آباد گئی' دیالو اور دیوتا ماموں کے ہاں ٹھہری تو وہ دنوں چٹ پٹ ہوئے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میرے سبز قدم امیت کی پُر سکون زندگی کو تہ و بالا نہ کرتے۔

ہم دونوں دنیا کی اونچ نیچ سے آگاہ تھے۔ اس سے پہلے دو تین مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں محبت کے مرحلے سے گزر رہی ہوں لیکن ہر مرتبہ یہ احساس چند مہینوں ہی میں زائل ہو گیا تھا۔ دوسری طرف امیت تھا جس کی زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی تھیں، حسین بدن، سرشار ہوتے اور سرشار کرتے بدن، لیکن یہ جو دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی کیفیت تھی، یہ نہ کبھی اس نے محسوس کی تھی، نہ میں نے۔ ہم جب سرشاری کی انتہا پر ہوتے اس لمحے بھی دل مزید قرب کے لیے تڑپتا۔ ہمارے دل جانے کس ملن کے طلب گار تھے۔ ہم نے سنا تھا اور دیکھا تھا کہ بدن کی پیاس بجھ جائے تو دل بھر جاتا ہے اور پھر بھلانے کا عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن ہم دونوں کے اندر جانے کون سی پیاس بھڑکتی تھی کہ وصال سے

بھی نہیں بجھتی تھی۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ عشق کسے کہتے ہیں اور یہ بھی کہ عشق میں ہجر اور وصال کتنے بے معنی لفظ ہیں۔ کیسی دوری، کیسی حضوری، کیسا وصال اور کیسی مجبوری، ہر ساعت کی اپنی لذت تھی۔ ہر لمحے کا اپنا کرب تھا۔

امیت کا کورس چند مہینوں میں ختم ہو گیا اور وہ ہندوستان لوٹ گیا، میرا ایم ایس مکمل ہونے میں ابھی ایک برس باقی تھا۔ اس ایک برس میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو جتنے خط لکھے وہ شاید ہی کبھی دو افراد نے ایک دوسرے کو لکھے ہوں۔ میں نے ایم ایس مکمل کیا تو سیدھی دلی پہنچی۔ امیت دلی میں تھا۔ ہم دونوں کا ملنا ایسا ہی تھا جیسے دو پاگل سمندروں کا ملنا لیکن اپنی تمام دیوانگی کے باوجود مجھے اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ مجھ سے کسی دوسری عورت کو اتنا بڑا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے کہ پھر اس کی تلافی ممکن نہ ہو۔ امیت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی، وہ مجھے ہر لمحہ اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ اتنی خوبصورت بات تھی کہ اس خوبصورتی سے مستقبل جنگ کرتے رہنا اور امیت کی خواہش کو رد کرتے رہنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں برسرِ پیکار تھی۔ اپنی خواہشوں سے' امیت کی آرزوؤں سے' میں بہت کمزور تھی میں خواہشوں کے سمندر میں کائی لگے پتھر پر کھڑی تھی اور جانتی تھی کہ کسی بھی لمحے کوئی تند لہر آئے گی اور مجھے بہا کر ساتھ لے جائے گی۔

امیت کی بیوی پدمنی بہت اچھی لڑکی تھی۔ اپنے بچوں، وجے اور پردیپ میں مگن، امیت اس کا پتی تھا اور پدمنی کو اس سے اسی نوعیت کی محبت تھی جیسی بیویوں کو شوہروں سے ہوتی ہے۔ وہ اس کے سر پر شجر سایہ دار کی طرح قائم تھا۔ اس گھنے سائے میں وجے اور پردیپ تھے، وہ خود تھی۔ کیا میں یہ سایہ ان تینوں سے چھین لوں؟ یہ سوال میرے اعصاب کو شکستہ کیے دے رہا تھا۔ میں پدمنی سے ملی اور دل ہی دل میں اپنے آپ پر نفرین کرتی رہی۔

کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے امیت سے دوری ضروری تھی، میں نے اپنا سامان اٹھایا اور اماں سے ملنے گھر چلی گئی۔ اماں بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں کہ ان کی بٹیا ولایت سے پڑھ کر ڈگری لے کر آئی ہے لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ اپنی بیٹی کو ہار چکی

ہیں۔ گھر میں میرا جی نہ لگا، گھر کے ماحول اور میری اپنی زندگی میں اب زمین آسمان کا فرق تھا۔ امیت کے خط روزانہ آتے تھے لیکن میں نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ میں سوچتی رہی۔ میں اماں کو دیکھتی رہی۔ اماں نے اپنی ذات سے کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا تھا، میں بھی انہی کی بیٹی تھی۔

پدمنی بھرے پرے پریوار میں پلی بڑھی تھی۔ اس کے ہر طرف شجر سایہ دار ہی رہے تھے، ان کے خنک سائے میں پروان چڑھنے والی لڑکی تو امیت کے بغیر بہت بے آسرا ہو جائے گی، لیکن میرے لیے تو کوئی بھی مرد شجر سایہ دار نہیں رہا تھا۔ نہ باپ، نہ بھائی، نہ ماموں، نہ چچا، مجھے زندگی کی دھوپ میں تنہا چلنے اور جلنے کی عادت تھی۔ اتنی زندگی گزر گئی تھی جو رہ گئی تھی وہ بھی گزر ہی جائے گی، بھلا کیا فرق پڑتا ہے، ہاں واقعی بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک صبح ناشتے پر میں نے اماں کو بتایا کہ میں پاکستان جارہی ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ اماں کے ہاتھ سے نوالا گر گیا ''بٹیا، وہاں تو ہمارا کوئی بھی نہیں۔'' انہوں نے دہل کر کہا۔
''اماں سنا ہے جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا خدا ہوتا ہے۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور اٹھ گئی۔

ہفتے بھر بعد اماں نے مجھے پاکستان کے لیے رخصت کیا تو آنگن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ آنسو، سسکیاں، ہچکیاں، یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے گھر سے جنازہ جا رہا ہو۔ اماں ڈیوڑھی تک آئیں، پھوپھی اماں نے ماش ٹکے سے صدقہ اتارا، اماں نے میرے بازو پر جھملاتا امام ضامن باندھا۔ میں نے دروازے سے باہر پہلا قدم رکھا تو ممانی جان نے بہ آواز بلند مولا مدد کہا اور دھاڑیں مارنے لگیں۔ میرا رکشا گلی سے نکلا تو رونے کی آواز دور تک مجھے رخصت کرنے آئی۔ ان آوازوں نے مجھے ایک ایسے سفر کے لیے رخصت کیا جس کا کوئی انت نہ تھا۔ یہ وہ لوگ بھی جانتے تھے جو مجھے رخصت کر رہے تھے اور یہ میں بھی جانتی تھی، میں کہ رخصت ہو رہی تھی۔ انگنا تو پربت بھیا اور دہلی بھئی بدیس۔
اس آخری سفر میں جب ریل گڑھ مکتیشر کے پل کے قریب پہنچی تو میں نے اپنے

پرس میں ہاتھ ڈالا لیکن ریزگاری کے نام پر میرے پاس ایک پیسا بھی نہ تھا۔ مجھے یاد آیا کہ دو اسٹیشن پہلے ساری ریزگاری میں نے ایک نابینا فقیر کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔ اس لمحے میری انگلیوں نے اماں والے امام ضامن کو چھوا جسے میں نے دوسرے امام ضامنوں کی طرح بازو سے کھول کر پرس میں رکھ لیا تھا۔ چاندی کا روپیا ریشم کے اندر جگر جگر کر رہا ہوگا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے خیال آیا کہ اس روپے کو نکال لوں، تب گزرے ہوئے لمحے برق رفتاری سے میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔

''اماں میں بھی پیسا پھینکوں گی، مجھے ایک گڑیا چاہیے، اماں صرف ایک دُونی'' نو برس کی بچی نے لہک کر کہا۔

''بے کار باتیں نہ کرو، یہ سب ہندوؤں کی خرافات ہے۔'' ماں نے بچی کو جھڑکا۔

''اماں میں مسلمان گڑیا کے لیے پیسا پھینکوں گی۔'' بچی نے بلک کر یقین دلایا۔

لمحے دور ہو گئے، برسوں پیچھے چلے گئے اور میرے ہاتھ کی گرفت سے ریشمی امام ضامن چھوٹ گیا۔ میں نے کھڑکی پر سر رکھا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اماں نے تو مجھے مسلمان گڑیا کی آرزو کے لیے پیسے نہ دیئے تھے پھر امیت کی آرزو کے لیے اماں کے پیسے؟

میں نے کھڑکی پر سر رکھ دیا گڑھ مکتیشر کا پل آیا اور گزر گیا۔ میرے ہاتھوں نے گنگا میا کو کوئی سکّہ نذر نہیں کیا۔ وقت جتنے خوبصورت لمحوں کی خیرات مجھے دے، لے لوں گی، لیکن خود وقت سے کچھ نہیں مانگوں گی، کبھی نہیں مانگوں گی۔

میرا گلاس خالی ہو گیا ہے، میں ٹیرس کی ریلنگ سے ٹک کر کھڑی ہو جاتی ہوں۔ سمندر کی خوشبو ہر طرف سے امڈ رہی ہے۔ یہ خوشبو مجھے اپنی طرف بلاتی ہے۔ آؤ اور مجھے دیکھو، آؤ اور مجھے برتو، میں ازل ہوں، میں ابد ہوں، میں زندگی ہوں، لیکن زندگی کہاں ہے؟ زندگی تو بہت دور رہ گئی ہے۔ اسے ہاتھ بڑھا کر کس طرح چھوا جائے۔

دلی میں امیت نے مجھے اپنے فیصلے سے پھرانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سب بیکار تھا، میں جانتی تھی کہ دنیا میں کہیں بھی جاؤں، امیت میرے تعاقب میں چلا آئے گا لیکن

پاکستان وہ جگہ تھی جہاں شدید خواہش کے باوجود اس کا پہنچنا ہفت خواں طے کرنے کے برابر تھا۔ اس کے گھر کو بربادی سے محفوظ رکھنے کے لیے میرے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا سو وہ میں نے اختیار کیا۔

امیت سے آخری ملاقات آج بھی اپنی تمام جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے کھنچی ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑی پینٹنگ ہو اور اسے میں محدب شیشے سے دیکھ رہی ہوں؛ جیسے کوئی فریم شدہ Tapestry ہو جس کے ریشم کا ہر شیڈ اپنی جگہ واضح ہو۔ کہیں ہلکا سبز، کہیں گہرا کہیں کاہی اور کہیں سیاہ، بھورا، عنابی، گلابی، لیکن کیا وہ آخری ملاقات تھی؟

ہم دونوں قطب کے سائے میں ڈھلتی ہوئی زرد دھوپ کی چادر تانے، زرد گھاس پر بیٹھے تھے۔ ہونٹ گنگ، آنکھیں بولتی ہوئی، موتی رولتی ہوئی، انگلیاں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئیں، بدن کا ختم نہ ہونے والا عذاب، اعصاب کا تشنج، ہر شے جیسے ٹھہری ہوئی، ہوا جیسے تھمی ہوئی۔ لوگ گزر رہے تھے۔ قہقہے، کیمرے، ٹورسٹ اور ان کے گائیڈ۔ اشوک کی لاٹ کی طرف جاتے ہوئے، قطب کی سیڑھیاں چھڑتے ہوئے سب کچھ تھا اور کچھ بھی نہیں تھا، امیت نہ تھا، میں نہ تھی، ہر طرف آگ تھی، ماضی تھا جو راکھ کے سوا کچھ نہ تھا، مستقبل تھا جس پر اس راکھ کے بکھرنے کی دھند تھی۔

''اس طرح مت جاؤ۔ اپنے آپ کو اور مجھے یوں نہ برباد کرو۔'' امیت نے جانے سویں مرتبہ کہا یا ہزارویں مرتبہ میں گنتی بھول گئی تھی۔ دن مہینے اور سال بھول گئی تھی۔ وہ شخص جس کا نام میرے بدن کی پور پور پر لکھا تھا۔ جس کی خواہش لہو میں تحلیل ہو کر بدن میں گردش کرتی تھی۔ وہی شخص شاید آخری مرتبہ میرے سامنے تھا۔ وقت نے جھک کر ہم دونوں سے کہا۔ یہ لمحے پھر نہ لوٹیں گے، یہ ساعت پھر نہ آئے گی۔

آخری ملاقات وہ تھی؟ یا میں اسے آخری ملاقات کہوں جو پالم ایئرپورٹ پر ہوئی۔ ہاتھوں کا لمس گم ہوتا ہوا، چہرے آنسوؤں کی دھند میں لپٹے ہوئے، ہونٹوں کی کپکپاہٹ رائیگاں جاتی ہوئی، سب کچھ بکھر رہا تھا، وقت کا آبدار خنجر Tapestry کا ایک ایک ٹانکا ادھیڑ رہا تھا' ریشم کٹ کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا۔ زندگی گرم موم کی طرح پگھل

رہی تھی، ڈھیر ہو رہی تھی۔ خاک' باد' آب' آتش' بدن جوان چار چیزوں کا مجموعہ تھا' کیا وہ مجموعہ رہ گیا تھا؟ کیا واقعی وہ باقی تھا؟ میں کہاں رہی تھی؟ وہ کہاں رہا تھا؟ ہر طرف ہجر کی آگ کا سمندر تھا۔

میں لاؤنج سے نکل کر رن وے پر آئی، سامنے ہی انڈین ایئر لائنز کا طیارہ گرج رہا تھا۔ دلی پر سورج غروب ہو رہا تھا میں سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی طیارے تک پہنچی، میں نے سیڑھی پر پہلا قدم رکھا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ طیارے نے چنگھاڑتے ہوئے دوڑنا شروع کیا۔ زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی جا رہی تھی، تیز اور تیز پھر ایک جھٹکے سے زمین سے ناتا ٹوٹ گیا۔ وقت کے آبدار خنجر نے Tapestry کا آخری ٹانکا بھی ادھیڑ دیا۔ نیچے دلی کی روشنیاں جاگ رہی تھیں، اوپر دلِ وحشی کا نصیبہ سو رہا تھا۔

سر میں اس وقت بھی جیسے کوئی چیز گرج رہی ہے۔ ایک بھاری پن ہے، آنکھوں میں جلن ہے۔ ہونٹوں پر شراب کے ذائقے کو سگرٹ کی تلخی نے تلخ تر کر دیا ہے۔ حلق میں کانٹے سے چبھتے ہیں اور پور پور میں پیاس رچی ہے۔ مسٹر مارسل مجھے ڈھونڈتے ہوئے ٹیرس پر آ جاتے ہیں۔ اور مجھ سے ڈرائنگ روم میں چلنے کو کہتے ہیں۔ میں ان سے معذرت کر لیتی ہوں میں یہیں ٹھیک ہوں۔ انہیں معلوم ہے کہ گوشہ گیری میرے مزاج کا بنیادی عنصر ہے وہ اصرار نہیں کرتے واپس چلے جاتے ہیں۔

جِن کو نیک کا گھونٹ بھرتی ہوں۔ مجھے بڑی شدت سے روڈز Rhodes کی وہ رات یاد آ رہی ہے جب ہم دونوں نے Rodini Wine Festival میں طرح طرح کی مقامی شرابیں پی تھیں۔ اور اپنے حواسوں میں نہ رہے تھے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ جتنی بھی پی لوں حواس قائم رہتے ہیں۔

زندگی محض رائیگانی ہو کر رہ گئی ہے۔ امیت کے خط ہر دوسرے تیسرے آتے رہتے ہیں۔ وہاں وہ دھواں دھواں ہے، یہاں میں راکھ ہوں میں جب مسٹر مارسل کے ہاں آنے کے لیے نکل رہی تھی تو شام کی ڈاک سے اس کا خط آیا تھا۔ وہ خط میں نے پرس میں رکھ لیا تھا' اور راستے میں پڑھا تھا میں اس خط کو نکالتی ہوں اور ایک بار پھر اسے پڑھنے لگتی ہوں۔

''ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بمبئی جا رہا ہوں، میرا جہاز ابھی زمین سے اٹھ کر Level پر آیا ہے اور تمہاری دلّی کے اوپر اڑ رہا ہے، وہ دلّی جو تمہیں بہت عزیز ہے، وہ دلّی جس میں تمہیں سب سے زیادہ چاہنے والا رہتا ہے۔ وہ دلّی جس سے تم نے سب ناتے توڑ لیے۔

''لو اتنی دیر میں ہی جہاز بادلوں سے بہت اوپر آ گیا اور مجھے تمہاری دلّی نہیں نظر آ رہی، کئی دن سے تمہارا خط نہیں آیا ہے۔ تمہارے خط میری زندگی کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے اور تمہارے خیال کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ خیالوں میں تم سے باتیں کرتا ہوں، خوابوں میں تمہیں دیکھتا ہوں اور تم مجھ سے اتنی دور ہو کہ تصور میں بھی دھندلا کر رہ جاتی ہو۔

''ایئر ہوسٹس نے تازہ اورنج جوس دیا ہے اور میں اسے تنہا پی رہا ہوں۔ اس کی مٹھاس تمہارے ہونٹوں کی مٹھاس سے بہت کم ہے اور اس کی ترشی میں تمہارے نمکین پسینے کی خوشبو ہے۔ میں اس گلاس کو تھوڑی دیر تھامے رہتا ہوں اور یہ سوچ رہا ہوں کہ اسی گلاس سے تم بھی پی رہی ہو۔ اس طرح مجھے تمہارے ہونٹوں کی خوشبو کا احساس ہو رہا ہے۔

''ابھی تھوڑی دیر کے لیے جہاز طوفان میں پھنس گیا تھا اور تمہیں کچھ لکھنا محال ہو گیا تھا۔ لیکن اب جہاز بادلوں سے اور طوفان سے نکل آیا ہے۔ بمبئی پہنچنے کا اعلان ہو گیا ہے۔ نیچے بارش ہو رہی ہے اور دھند میں لپٹی ہوئی بے شمار اونچی اونچی عمارتیں نظر آ رہی ہیں، اب میں دور تک پھیلے ہوئے سمندر پر ہوں، جہاز چکر کاٹ رہا ہے، دور دور تک پانی ہے اور یہی سمندر تمہارے شہر سے بھی جا کر ملتا ہے، جب تم اپنے شہر کے ساحل پر جانا تو مجھے یاد کرنا اور یہ بھی سوچنا کہ اسی پانی کی کوئی لہر بمبئی تک آتی ہوگی۔ اسی بمبئی تک جس کے ساحل پر میں ایک ہفتے تک بلاناغہ جاؤں گا اور جہاں بیٹھ کر تمہیں یاد کروں گا۔''

میری آنکھیں پُر آب ہو جاتی ہیں۔ سامنے سمندر ہے لہریں آزاد ہیں، کہیں بھی چلی جاتی ہیں، کسی ساحل کو بھی چوم کر آ جاتی ہیں لیکن میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں۔

اب میں کچھ دنوں سے کراچی میں ہوں۔ یہاں کچھ لوگوں سے شناسائی ہو گئی ہے،

کچھ سے انگلینڈ کے زمانے کی جان پہچان نکل آئی ہے۔ مسٹر مارسل بھی انہی لوگوں میں ہیں، ان کی ایک بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔ وقت گزاری کے لیے میں اس ایجنسی میں کام کر رہی ہوں۔ دونوں میاں بیوی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ سیٹزن شپ کے لیے سفارشوں کا چکر چل رہا ہے۔ نو آبجکشن سرٹیفکیٹ، پولیس رپورٹ، انڈین نیشنل، پاکستان نیشنل۔

''اچھا تو آپ اب Migrate کر رہی ہیں؟ بہت دیر کردی آپ نے، ہاں صاحب جن سنگھ والے بھارتی مسلمانوں کو بھلا کب چین سے بیٹھنے دیتے ہیں۔'' ایک مقامی شناسا کہتے ہیں۔

''بھئی ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا، اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی، ملازمتوں کا ملنا محال ہو گیا ہے۔ کوئی بہت بڑی سفارش ہو تو بات الگ ہے۔ ویسے تم تو سنا ہے بڑی کنزنیشنلسٹ تھیں۔'' یو پی کے ایک سینئر بیورو کریٹ کہتے ہیں، جنھوں نے 47ء میں پاکستان کے لیے Opt کیا تھا۔

''عمر بھی خاصی ہوگئی ہے۔ بیچاری کی، اب وہاں اچھے رشتے بھلا جڑتے کہاں ہیں۔ شاید اسی چکر میں...... '' ایک شناسا خاتون بہ آواز بلند سرگوشی کرتے ہوئے دوسری خاتون سے کہہ رہی ہیں۔

جملے تیرتے ہوئے، کانوں کو برماتے ہوئے دل کو سوختہ کرتے ہوئے جملے۔ امیت میری جان، آنے لگے ہیں تیر مری خیمہ گاہ تک۔

میں سمندر پر کروٹیں بدلتی چاندنی کو ایک نظر دیکھتی ہوں اور مڑ کر ڈرائنگ روم میں چلی جاتی ہوں۔ آخری مہمان رخصت ہو رہے ہیں۔ میں بھی مسٹر اور مسز مارسل سے اجازت طلب کرتی ہوں تو وہ دونوں ملازموں کو ہدایتیں دیتے ہوئے میرے ساتھ نیچے آتے ہیں اور پھر حسب وعدہ مجھے گھر چھوڑنے کے لیے اپنی گاڑی نکالتے ہیں۔

ہم کلفٹن برج کے پاس پہنچتے ہیں تو بہت سے لڑکے سائیکلوں اور اسکوٹروں پر سوار جتھے بنائے ہوئے سمندر کا رخ کر رہے ہیں۔ ہم اور آگے بڑھتے ہیں تو ایک ٹکڑی ہمیں انتر

کانٹی نینٹل سے لورز برج کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ عثی جیٹی جا رہے ہیں۔

''یہ اتنے بہت سے لڑکے اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟'' مسز مارسل حیرت سے پوچھتی ہیں''۔

''آج ان لوگوں کا ایک تہوار ہے اس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔'' میں مسز مارسل کو دو جملوں میں ٹال دیتی ہوں۔ میں انہیں اپنا اور اپنے لوگوں کا قصہ کیسے سمجھا سکتی ہوں۔ انہیں کیسے بتاؤں کہ آج صاحب العصر والزمان کی ولادت کی شب ہے۔ یہ لوگ اور ان جیسے بہت سے دوسرے سمندر میں عریضے ڈالنے جا رہے ہیں۔

دعائیں، منتیں، مرادیں، آرزوئیں۔ دنیا اور دنیا کی خواہشیں جن کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ آج کی رات خواہشوں کی، منتوں کی، مرادوں کی رات ہے۔ آج کی رات عریضے لکھو پھر ان عریضوں کو سمندر میں بہادو، حسین ابن روح کے سپرد کر دو۔

میرا جی چاہتا ہے کہ مسٹر مارسل سے کہوں گاڑی عثی جیٹی کی طرف لے چلیں ایک عریضہ میں بھی ڈالنا چاہتی ہوں۔ لیکن کیسا عریضہ؟ کاہے کی آرزو؟ میں نے اپنا معاملہ وقت کے حوالے کیا۔یا صاحب العصر والزمان ' الامان الامان۔

○○

بود و نبود کا آشوب

اندھیرا پیڑوں پر بچھ گیا تھا، خوشبو بن کر رات کی رانی میں اتر گیا تھا، خنکی بن کر ہوا میں گھل گیا تھا۔

میں دھوئیں سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ تھکن میری پنڈلیوں اور تلووں میں رچ گئی تھی۔ میں اپنے شوہر اور اس کے دوستوں سے معذرت کر کے باہر نکلی اور برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگی۔

ڈرائنگ روم کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور روشنی کے قتلے برآمدے کے فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بچپن کا ایک کھیل یاد آ گیا، جب ہم اپنے گھر کے آنگن میں روشنی کے ایسے ہی بڑے اور چھوٹے قتلوں کو پھلانگتے جاتے اور جب کسی کا پیر غلطی سے روشنی کے کسی قتلے پر پڑ جاتا تو سزا کے طور پر اسے چور بنا دیا جاتا، پھر ہم سب کچھ بھول کر، بھرا مار کر دوڑتے اور چور بننے والا لنگڑی ٹانگ سے ہمارے پیچھے لپکتا۔ اس وقت روشنی کے سارے قتلے ہمارے پیروں تلے روندے جاتے اور اندھیرے کے تمام گوشے ہماری چیخوں سے بھر جاتے۔

اس رات جب میں برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہل رہی تھی تو یوں ہوا کہ ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکیوں نے سب کچھ اگل دیا، سب کچھ نگل لیا۔

میں اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ میری نظر اپنے شوہر پر پڑی، وہ ہاتھ بڑھا کر اسٹیریو کا سوئچ آن کر رہا تھا۔ Boney M کی چیختی ہوئی آواز اٹھی۔ Ra Ra Rasputeen میں

نے دہشت زدہ ہو کر ان سب کو دیکھا، اندر چار دوست تھے شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے اور سامنے کتابوں کی الماری پر ایک تصویر تھی۔ تصویر میں سفید پتھروں والی ایک چٹیل پہاڑی تھی۔ اس پہاڑی کے ایک مختصر حصے کو تراش کر ہموار دیوار کی شکل دے دی گئی تھی اور دیوار میں ایک سلاخ دار دروازہ لگا تھا، جس میں آہنی قفل تھا۔ اس دروازے سے پرے ایک غار تھا اور محراب تھی' محراب سے پرے ایک تنگ و تاریک غار تھا اور اس غار سے پرے ابد تھا اور لانہایت نیند تھی جو زندوں اور مردوں کے درمیان عدل کرتی ہے۔

میں بھی اس تصویر میں تھی، دروازے کی ایک سلاخ تھامے ہوئے اور غار کے اندر جھانکتی ہوئی۔ چہرہ غار کی سمت اور پشت کیمرے کا سامنا کرتی ہوئی اور اسی تصویر کے برابر کانسی کا ایک مجسمہ تھا۔ غار کے قیدی کا یہ مجسمہ میں نے اسی شہر سے خریدا تھا۔

جب میں نے یہ تصویر کھینچوائی تھی اور جس لمحے میں نے یہ مجسمہ خریدا تھا، اس لمحے میں نہیں جانتی تھی کہ ایک رات ایسی بھی آئے گی جب میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ایک شخص اس تصویر اور مجسمے کو دیکھ کر ایک جملہ کہے گا اور پھر اندھیرا روشنی کے تمام قلعوں کو نگل لے گا۔

میری نگاہیں بھٹکیں اور کتابوں کی الماری کے مقابل رنگین ٹیلی ویژن پر جم گئیں۔ ٹیلی ویژن کیبنٹ پر سیاہ فریم میں جڑا ہوا ایک فوجی اعزاز سجا تھا۔ چند ہفتوں پہلے یہ اعزاز میرے شوہر کو اعلیٰ پیشہ ورانہ خدمات کے صلے میں عطا ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے کا وہ لمحہ میرے اندر ازل کی طرح منجمد تھا جب ڈرائنگ روم کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے میرے شوہر کے عزیز ترین دوست کی آواز آئی تھی اور اس آواز نے پوچھا تھا "یار یہ سلاخ دار دروازے کی تصویر کیسی ہے؟"

تب میرے شوہر نے بتایا تھا کہ یہ اس بوڑھے فلسفی کا قید خانہ ہے جس نے زہر کے پیالے کے انتظار میں یہاں تیس دن اور تیس راتیں گزاری تھیں۔

یہ سن کر میرے شوہر کے اسی عزیز ترین دوست نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا "بھابی نے اس کمرے میں خوب تضاد اکٹھا کیا ہے، ایک طرف صدیوں پہلے زہر پینے والے بوڑھے

کے قید خانے کی تصویر اور اس کا مجسمہ ہے اور دوسری طرف تمہیں ملنے والا اعزاز سجا ہے۔''

''ذرا آہستہ بولو۔ تمہاری بھابی نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔'' میرے شوہر کی آواز شاید مریخ سے آرہی تھی۔

''اسے واقعی کچھ نہیں معلوم۔''

''لیکن وہ تو اس تقریب میں شریک تھیں جس میں تمہیں یہ اعزاز ملا تھا۔''

''ہاں وہ شریک تو تھی لیکن اسے نہ اس اعزاز کا پس منظر معلوم ہے اور نہ میری سرکاری مصروفیات کے بارے میں کچھ علم ہے۔'' یہ اس شخص کی آواز تھی جو مجھے جان سے عزیز تھا۔

وہ باتیں کررہے تھے، میرے شوہر کو داد دے رہے تھے، وہ تنظیم جسے میں بہت عزیز رکھتی تھی اس کے کچل دیئے جانے کا سہرا میرے شوہر کے سر باندھ رہے تھے۔ سیاہ فریم میں جڑا ہوا اعزاز میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس شخص کا چہرہ بھی جسے یہ اعزاز عطا ہوا تھا۔ کیا یہ وہی شخص تھا جس سے میں نے گھنٹوں ادب اور تاریخ کے معاملات پر باتیں کی تھیں، جو فنون کا دلدادہ تھا، کتابوں کا شیدائی تھا اور فلسفۂ تاریخ جس کا محبوب موضوع تھا۔

کیا یہ واقعی اسی شخص کی آواز تھی۔

میری ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا، میں وہیں بیٹھ گئی۔ آوازیں مجھ تک آتی رہیں۔ یہ انسانوں کی آوازیں تھیں یا بھیڑیوں کی غراہٹیں؟ وہ ان لوگوں کے نام لے رہے تھے، ان کی باتیں کررہے تھے جن میں سے کئی کو میں نام بہ نام جانتی تھی۔ ان سے میں نے ادبی نشستوں اور نجی محفلوں میں گھنٹوں باتیں کی تھی، ان کے ساتھ میں نے کئی پسماندہ بستیوں کا سفر کیا تھا۔ وہ علاقے اور ان میں بسنے والے محروم ترین انسان جن کی زندگی کی پستیوں کا شہر میں رہنے والے تصور بھی نہیں کرسکتے۔ یہ لوگ پسماندہ بستیوں میں رہنے والوں کے ساتھ انہی کی طرح رہتے تھے۔

مجھے ان پر ہنسی آئی تھی۔ آخر سقراط نے بھی تو یونان کی ریاست کے کسی عام سپاہی کی طرح حلف اٹھایا تھا اور عہد کیا تھا کہ ''میں اپنے ہتھیاروں کی بے حرمتی نہیں کروں گا اور

میدان جنگ میں اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا اور دیوتاؤں اور انسانوں کی چیزوں کے لیے جنگ کروں گا۔"

میں نے کتابوں سے سیکھا تھا کہ پیشے انسانوں کی افتادِ طبع نہیں بدل سکتے، یہ تمام باتیں میں نے بھیا سے کہی تھیں اور وہ چپ ہو گئے تھے۔ یوں بھی عشق کے سامنے دلیلیں ہار جاتی ہیں سو وہ بھی ہار گئے۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہم دونوں وطن واپس آ گئے۔ میں پانچ برس ملک سے باہر رہی تھی اور جب واپس آئی تو خواہش کے باوجود پرانے دوستوں سے رشتہ استوار نہ ہو سکا۔ جبر کی فضا میں اضافہ ہوا تھا، لوگ بکھر سے گئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے مجھ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ان کے خیال میں Trojan Hurse تھی، وہ مجھے قلبِ لشکر میں کس طرح لے کر جاتے۔

یہ اتنی قیامت کی اذیت تھی جس کا اظہار بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں اپنے اندر سہم کر، ٹھٹھر کر رہ گئی۔ وہ بھی حق بجانب تھے اور شاید میں بھی درست تھی کہ عشق کی بیمار تھی۔

اس وقت یہ لوگ جن کے نام لے رہے تھے، ان کی گرفتاری کی خبر ہماری واپسی کے چند ہفتوں بعد ہی چھپی تھی، پھر خبر آئی کہ ان کا معاملہ ایک فوجی ٹریبونل کے سپرد کر دیا گیا۔ میں نے اپنے شوہر سے اس معاملے پر بات کرنی چاہی لیکن وہ ٹال گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں سے کئی میرے ذاتی دوست ہیں۔ وہ تفصیلات بتا کر مجھے اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک شخص تشدد کی تاب نہ لا کر ختم ہو گیا۔ اور اس کی لاش لاوارثوں کی طرح ایک چھوٹے سے شہر کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ اس کی قبر پر کوئی کتبہ نہ تھا، وہ گمنام سپاہی کی قبر تھی۔ اس کی بیوہ اور اس کے ضعیف ماں باپ کی آہ وزاری کی ایک کالمی خبریں آئیں اور پھر سب کچھ یوں بھلا دیا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی موت کی خبر نے مجھے کئی روز تک رُلایا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر انسان مر بھی سکتا ہے۔ وہ زبان جو دانائی کے موتی رولتے نہ تھکتی تھی، وہ گویائی سے محروم بھی ہو سکتی ہے وہ ہاتھ جنہوں نے ہمیشہ سچ لکھا تھا، وہ پیوند زمین بھی ہو

سکتے ہیں۔

میں نے بے یقینی کی ریتیلی دیوار کو تھام کر یقین کی پتھریلی سرزمین تک پہنچنا چاہا لیکن ریتیلی دیوار کا قامت کم ہو رہا تھا، میری انگلیوں کے درمیان سے ریت پھسل رہی تھی، گر رہی تھی۔

آوازوں کا پگھلتا ہوا، دہکتا ہوا سیسہ، بہتا ہوا میری سماعت تک آ رہا تھا۔ یہ لوگ بار بار اس شخص کا نام لے رہے تھے جو موجود انسانوں میں میرے لیے بہت محترم تھا۔

وہ ہنس رہے تھے، ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ انہوں نے اسے کس کس طرح کی اذیتیں دیں، اس کی انگلیوں سے ناخن کس طرح کھینچے گئے، اسے کتنے گھنٹے برف کی سل پر لٹایا گیا اور کتنی مرتبہ بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔

تب میں نے جانا کہ وہ ہلاک ہونے سے ہفتوں پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اسے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور کیا گیا، اسے برہنہ کر کے غلاظت کے تلاب میں غوطے دیئے گئے، پیروں میں وزن باندھ کر اور کلائیوں کو آہنی حلقوں میں جکڑ کر چھت سے لٹکایا گیا۔

اذیت، ہر وہ اذیت جو صرف ایک انسانی ذہن ہی سوچ سکتا ہے، اسے اور اس کے ساتھیوں کو دی گئی۔ صرف اس لیے کہ وہ ان حکمرانوں سے اختلاف رکھتے تھے جنہوں نے انسانوں پر جینا حرام کر رکھا تھا۔ یہ حکمران جن کا خیال تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نائب ہیں اور خدا کے نائبین سے زیادہ بھلا اور کون عدل کر سکتا ہے، سو انہوں نے بھی عدل کیا۔

سزاؤں کا نگران اعلیٰ اندر بیٹھا تھا اور ہنس رہا تھا، جب اس کی نگرانی میں ان سب لوگوں کو سزائیں دی جا رہی تھیں، جب ان پر دنیا کی ہر راحت بند تھی اور جب ان پر عقوبت کا ہر در کھلا تھا، انہی دنوں میں نے اس عقوبت کے نگراں کا ہر شام بے تابی سے انتظار کیا تھا اور ہر شب، شب بسری کی تھی۔

کتابیں، کتابچے، رپورٹیں میری نگاہوں میں تھے۔ International Protection Of Human Rights ایمنسٹی کی رپورٹ آن ٹارچر۔ اقوام متحدہ کا Universal Declaration Of Human Rights جس پر میرے شوہر کے سابق و موجود حکمرانوں کے دستخط تھے۔ جس کی پہلی شق یہ تھی کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں

اور وہ یکساں حقوق اور مساوی رتبے کے حقدار ہیں جس کی نویں شق یہ تھی کہ......

لیکن صرف پہلی اور نویں شق کا ہی ذکر کیوں؟ اس دستاویز کی تیس شقیں تھیں اور نہ جانے کتنی ذیلی شقیں۔ تو کیا اس دستاویز پر دستخط کرنے والوں کے اندر کبھی کسی سوال نے سر نہیں اٹھایا تھا؟

ایسے سوال اور ان کے جواب ضمیر کی کھیتی میں اکھوے کی طرح پھوٹتے ہیں اور ضمیر کی کھیتی سفید محل میں رہنے والے ان دیوؤں کے ہاتھ گروی رکھ دی گئی تھی جن کی آنکھیں نیلی تھیں اور جن کے بدن تانبے کے رنگ کے تھے۔

میرے چاروں طرف آوازیں تھیں، آگ تھی اور دھواں تھا، خون کی اور سڑتے ہوئے گوشت کی بساند تھی۔ مجھے ابکائی آئی اور جو کچھ بھی میرے اندر تھا، باہر آ گیا۔ یہ سڑا ہوا رزق اس اذیت دہی کے عوض ملنے والے روپوں سے خریدا گیا تھا۔ میں اس سڑے ہوئے رزق کے پاس بیٹھی رہی۔

میں جانے کتنی دیر تک بیٹھی رہی، پھر میں ہمت کر کے اٹھی اور اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں نے پانی سے اس سڑے ہوئے رزق کو دھویا۔ لیکن ابھی تو بہت کچھ میرے اندر تھا۔ ابھی تو میرے اندر ایک عزیز از جان رشتے کی مسخ شدہ لاش تھی۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر سے لپ اسٹک صاف کی اور آئینے میں مجھے اپنا ہاتھ نظر آیا۔ یہ ہاتھ جو مر جانے والے، موجود اور پیدا ہونے والے، دوسرے تمام انسانوں کے ہاتھوں کی طرح کھال، چربی دار خلیوں، نسیجوں، پٹھوں، عضلات، ہڈیوں اور جوڑوں سے بنا تھا۔ یہ ہاتھ جس کا اختتام تمام دوسرے انسانی ہاتھوں کی طرح انگلیوں پر ہوا تھا۔

میں نے آئینے میں اپنی انگلیوں کو دیکھا، سبک اور بجل انگلیاں، مخروطی ناخن اور ان پر دمکتی ہوئی ہلکی گلابی نیل پالش، سورج کی انگلی پر سفید اوپل تھا اور اس کی دودھیا سفیدی میں قوسِ قزح کے سات رنگ جھلکتے تھے۔

پھر وہ انگلیاں میری نگاہوں میں کھنچ گئیں جنہیں میں نے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ توانا اور مردانہ انگلیاں، صاف اور ترشے ہوئے ناخنوں کے نیچے سے خون کی سرخی جھلکتی

ہوئی، مشتری اور زحل کی انگلیوں کی پہلی پوروں کے کنارے سگریٹ کے دھویں سے زرد۔ وہ انگلیاں ایک مضمون کے صفحے الٹ رہی تھیں او وہ ہونٹ ان صفحات پر لکھے ہوئے الفاظ کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

وہ آخری موقع تھا جب میں نے ان انگلیوں کو متحرک دیکھا اور ان ہونٹوں کو بولتے ہوئے سنا۔ مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے وہ توانا ہاتھ جب رخصت ہوئے تو محض پھپچیاں رہ گئے تھے، ان ستھری اور حساس انگلیوں اور صحت مند گلابی ناخنوں کی جگہ ٹھٹھری ہوئی، کچلی ہوئی بے ناخن انگلیاں تھیں۔ وہ انگلیاں جو شعر لکھتی تھیں، جنہوں نے تاریخ کی جدلیاتی تعبیر پر کتاب لکھی تھی، اپنے عہد کی بدی کے خدوخال اجاگر کئے تھے، وہ انگلیاں خاک کا رزق ہوئیں۔

ڈرائنگ روم سے ایک بار پھر Boney M کی آواز آئی۔ He Was Steppe.s Wolf میں کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری نگاہوں میں اس بھیڑیے کا توانا بدن کھنچ گیا جسے میں نے لذتوں کا راتب کھلایا تھا

اب میں ڈرائنگ روم کی نیم تاریک محراب کے نیچے سایہ سی کھڑی ہوں۔ ان لوگوں نے میری موجودگی کو محسوس نہیں کیا ہے۔ لیکن جب یہ میری موجودگی محسوس کرلیں گے تو یہ جھپٹ کر اپنے بھیڑ یا چہروں پر بکروں کے ماسک چڑھالیں گے ان کی غراہٹیں گھٹی گھٹی ممیاتی آوازوں سے بدل جائیں گی۔

کہا جاتا ہے کہ نہ جاننا سب سے بڑی نعمت ہے۔ سب کچھ جان لینے کی کھیتی میں نے کچھ اس طور کاٹی ہے کہ آج میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔

انہوں نے میرے قدموں کی چاپ سن لی ہے اور وہ جلدی جلدی بکروں کے ماسک پہن رہے ہیں۔ میں اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھتی ہوں، اس شخص کا پرانا ماسک کہاں ہے؟ آواز تکرار کرتی ہے He Was Steppe.s Wolf میں ایمفی تھیٹر کے وسط میں کھڑی ہوں، تمام روشنیاں مجھ پر مرتکز ہیں اور میرے تمام کردہ و ناکردہ گناہ منہ پھاڑے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔

○○

ابن ایوب کا خواب

سب لوگ جا چکے تھے' ملک ملک کی زبانیں بولنے والے' نت نئے لباس پہننے والے تحقیر کرنے والے، رحم کھانے والے سیاح' گھگھیانے والے گائیڈ، بھیک مانگنے والے بچے، خچروں اور گدھوں کے رینکنے کی آوازیں بھی اب کھو گئی تھیں۔ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور اب وہ اپنے گھر میں تنہا تھا، صحرا کی ریت کے ساتھ، خوفو کے ہرم کے ساتھ۔

ابن ایوب نے المونیم کا پیالہ اپنی طرف گھسیٹا تو سکے پیالے کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگے۔ اس کی بے ناخن انگلیوں نے ان سکوں کو محسوس کیا اور پھر انہیں گنے بغیر قمیص کی بغلی جیب میں رکھ لیا۔ اندھیرے میں حریصوں کی طرح انہیں ٹٹولنا اور گننا اس کے لیے قابل نفرت بات تھی، بالکل اسی طرح وہ صدا لگانے کو بھی طمع کی علامت سمجھتا تھا' وقت نے اس کے پورے وجود کو صدائے دریوزہ گری میں بدل دیا تھا، لوگ اس کو دیکھتے تو خود ہی کچھ نہ کچھ اس کے پیالے میں ڈال جاتے۔

وہ ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا، گدڑی تہ کر کے کاندھے پہ ڈالی، بقچہ سر پر رکھا، ایک ہاتھ سے صراحی سنبھالی اور گھسٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ یہ چالیس پینتالیس گز جو اسے ہر رات اور صبح کو طے کرنے پڑتے تھے، ایک عذاب ناک مسافت تھے۔

بڑے ہرم کی پہلی سیڑھی کے پاس پہنچ کر اس نے صراحی اور بقچہ ریت پر رکھا' گدڑی

بچھائی اور پھر اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی دکھتی ہوئی پشت پر اس کے تمام بزرگوں نے اپنے اپنے ہاتھ رکھ دیئے ہوں۔ اس کے وجود میں لمحے بھر کے لیے سکون پھیل گیا۔ وہ اب اپنے گھر میں تھا، اجنبی لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

چند ثانیوں تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے پُرکھوں کے عقیدے کے مطابق آمون رع کی کشتی اس وقت ظلمات کے سمندر سے گزر رہی تھی۔ خنک رات ریت پر بچھی ہوئی تھی، خوفو کے ہرم پر سائبان بن کر تنی ہوئی تھی۔ کچھ فصل پر شہر آباد تھا جس کی ان گنت روشنیاں آسمان کے سیاہ سائبان پر روشنی کا سایہ ڈال رہی تھیں۔

اس نے اپنے دونوں پیر پھیلائے اور اس کے منہ سے بے ساختہ ایک کراہ نکل گئی، گھٹنے کے جوڑ کا وہ آبلہ جو اسے کئی دنوں سے تکلیف دے رہا تھا اب پھٹ گیا تھا اس نے پیپ کو بہتے ہوئے محسوس کیا لیکن اسے صاف کرنے کی زحمت نہ کی۔ جس طرح اسے سانس لینے کی غیر شعوری عادت تھی، اسی طرح وہ اب اپنے آبلوں سے پیپ کے بہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا، پھر اس نے بغچے میں ہاتھ ڈال کر مکئی کی روٹی کا سوکھا ہوا ٹکڑا اور پیالہ نکالا۔ پیالے میں اس نے صراحی سے پانی انڈیلا اور روٹی کا ٹکڑا پانی میں بھگو کر کھانے لگا۔ لقمے کے ساتھ ریت کے ذرّے بھی اس کے دانتوں تلے کرکرا رہے تھے لیکن وہ بہت توجہ، بہت انہماک سے اپنے جبڑوں کو چلاتا رہا۔

سینڈوچ، پیسٹریاں، چاکلیٹ، یہ تمام ذائقے ماضی کی درازوں میں گم ہو گئے تھے، وہ انہیں کب کا بھول چکا تھا لیکن اس وقت وہ تمام ذائقے اس کی طرف لپک رہے تھے۔ وہ انہیں پیچھے کی طرف دھکیلتا رہا، ان ذائقوں کا وہ سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھیلی میں اتنی رقم ہے کہ وہ اپنے لیے نیا لباس خرید سکتا ہے، تربوز، کھجوریں، شیش کباب، کوفتے اور دوسری نعمتیں کھا سکتا ہے اور یہ بھی کر سکتا ہے کہ تامیہ پیچھے

والے خوانچہ فروش کو اشارے سے اپنی طرف بلائے اور اس سے ایک نان اور تامیہ خرید لے۔ لیکن وہ اپنی ان خواہشوں کو مسلسل کچلتا رہتا تھا۔ وہ رقم جو دوسروں کی جیبوں سے نکل کر اس کے پیالے تک آتی تھی، وہ امانت تھی۔ کچھ دنوں پہلے وہ بھیک میں ملنے والے سکے خرچ کر دیتا تھا لیکن اب تو ساری رقم امانت تھی، وہ اسے کس طرح ہاتھ لگاتا؟

پچھلے تین دنوں سے زبیدہ نہیں آئی تھی اور یہ اس کی لائی ہوئی روٹیوں کا آخری ٹکڑا تھا جسے وہ اس وقت چبا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ بقچے میں دو کھجوریں بھی ہیں، یہ کھجوریں بھی زبیدہ ہی اس کے لیے لے کر آئی تھی۔

پہلے وہ روزانہ اس کے لیے کھانا لے کر آتی تھی، کچھ دنوں بعد ہر دوسرے دن آنے لگی اور اب کبھی تین اور کبھی چار دن کا وقفہ ہو جاتا تھا۔ زبیدہ کی آنکھوں کی پتلیوں پر سفید پانی جمتا جا رہا تھا۔ اس کے بیٹوں کو ڈر تھا کہ ان کی ماں کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے اسی لیے وہ اب اس کے روزانہ باہر نکلنے پر معترض ہوتے تھے۔

ان دنوں زبیدہ اس سے کچھ زیادہ ہی ناراض رہنے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دن بھر میں جتنی بھی رقم اسے ملتی ہے، اس سے وہ اپنے لیے کھانے پینے کی چیزیں، دوائیں اور لباس کیوں نہیں خریدتا۔ اس کے آگے پیچھے تو کوئی بھی نہیں تھا پھر رقم جوڑنے کی اور اپنے آپ کو ترسانے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟

وہ سر جھکائے زبیدہ کی ڈانٹ پھٹکار سنتا رہتا اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ گھبرا کر پہلو بدلتا تو وہ سکے جو اس کی قمیص کی جیب میں قید ہوتے، شور مچانے لگتے۔ وہ شرمندہ ہو جاتا کیونکہ یہ آواز سن کر زبیدہ کے جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے پر غصے کی لکیریں اور بھی گہری ہو جاتیں لیکن وہ اسے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ اس سے کس طرح کہتا کہ یہ سکے امانت ہیں۔

وہ روزانہ ملنے والی بھیک کو بڑی احتیاط سے جمع کر رہا تھا جب اس کے پاس بہت سے پیاسٹر اور ملیم جمع ہو جاتے تو وہ کسی خوانچہ فروش سے ان کے بدلے گنی کے نوٹ لے لیتا اور پھر انہیں کمر سے بندھی ہوئی تھیلی میں چھپا لیتا۔

روٹی کا ٹکڑا ختم ہو گیا تو ابن ایوب نے اپنے خارش زدہ اور پیپ میں لتھڑے ہوئے بدن کو گٹھری کی طرح سمیٹا اور خوفو کے ہرم کی پہلی سیڑھی کے سائے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیوند لگی ہوئی گدڑی پر ریت کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ ریت کے ذرّے اس کی داڑھی میں، اس کی پلکوں اور بھوؤں میں، اس کے بالوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی نوکیلی انگلیاں اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ اس وقت بھی ریت کے ذروں نے اس کی داڑھی میں سوئیاں چبھوئیں تو وہ بے تاب ہو گیا اور اس کا جی چاہا کہ اپنی داڑھی کو خوب زور زور سے کھجائے۔

اس نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ اسکی انگلیاں کہاں ہیں، وہ تو بس ٹھٹھرے ہوئے گوشت کے پیپ بھرے لوتھڑے ہیں۔

اس نے اپنے بغچے میں کچھ ٹٹولا اور جب ایک نوکیلا اور چکنا پتھر اس کے ہاتھ آ گیا تو اس نوکیلے پتھر سے اپنی داڑھی کھجانی شروع کر دی۔ ایسے کئی چکنے اور نوکیلے پتھر اس نے ایسے ہی وقتوں کے لیے بہت احتیاط سے رکھ چھوڑے تھے۔ اس کے ناخن نہیں رہے تھے لیکن خوفو کے ہرم کے سائے میں ابھی ایسے بہت سے چکنے اور نوکیلے پتھر تھے۔

نوکیلے پتھر نے اسے کچھ تسکین دی، داڑھی کے بالوں میں الجھے ہوئے ریت کے ذرّے کچھ دیر کو نچلے بیٹھ گئے۔ اس نے ایک گہری سانس لی، اسے اپنی پُرگوشت، بھری بھری اور مستعد انگلیاں یاد آئیں۔ وہ برسوں سے اب ان دنوں کی یاد کی دھند میں زندگی کر رہا تھا جب اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خم نہیں آیا تھا، اس کا بدن چست تھا، اس کی انگلیاں مستعد تھیں اور اس کے پیروں میں زمانے بھر کی قوت تھی۔

وہ قبطی النسل تھا، عظیم فراعنہ کی عظیم تر روایات کا سچا وارث۔ وہ جس گاؤں کا رہنے والا تھا، وہ دریائے نیل کے کنارے آباد تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کشتیاں کھیتے تھے، ہل چلاتے تھے لیکن ابن ایوب کو نہ ہل چلانا آتا تھا، نہ اسے کشتیوں سے دلچسپی تھی یہی وجہ تھی کہ جب قبطی کلیسا کے ایک مشنری گروپ نے اس کے گاؤں کا دورہ کیا اور قبطی عیسائیوں کے بچوں کو پڑھنے کی ترغیب دی تو ابن ایوب اس گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جو مقدس باپ کے

سامنے جا کھڑا ہوا اور ان کے ساتھ قاہرہ چلا گیا۔ اس کی ماں سوتیلی تھی، اسی لیے ، کے باپ نے بھی اس کا راستہ نہ روکا۔

وہ پانچویں جماعت میں تھا جب اس کے ایک ساتھی نے مقدس باپ کی جیبی گھڑی چرائی اور پھر خوف سے وہ گھڑی ابنِ ایوب کے بستے میں چھپا دی۔ جب وہ گھڑی تمام جماعت کے سامنے ابن ایوب کے بستے سے برآمد ہوئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے گھڑی واقعی اسی نے چرائی ہو۔ وہ زرد چہرے اور کانپتی ٹانگوں سے کھڑا رہا۔ اس نے استاد کے کسی سوال کا جواب نہ دیا، کسی الزام کی تردید نہ کی اور جب چھٹی کا گھنٹا بجا تو ہوسٹل کی بیرک نما عمارت کا رخ کرنے کے بجائے اس نے بستہ کلیسا کے احاطے کی دیوار سے لگا کر رکھا اور خود باہر نکل گیا۔

اس دن کے بعد وہ کبھی بھولے سے بھی اس کلیسا کی طرف سے ہوکر نہ گزرا۔ اس رات اس نے ایک پارک کے بہتے ہوئے نل سے پانی پی کر اپنا پیٹ بھرا اور دوسرے دن جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ چلتا رہا اور جہاں وہ ٹھہرا وہاں گڑھے کھدے ہوئے تھے اور بے شمار مزدور کام کر رہے تھے۔

یہ ماہرین آثار قدیمہ کا کیمپ تھا جو فرانس اور امریکہ سے آئے تھے اور زمین کھود کر قدیم مصر کو مٹی کی قید سے آزاد کر رہے تھے۔

اسی دن اسے وہاں کام مل گیا۔ یہ کھدائی کے دوران نکلنے والی مٹی کو ٹوکری میں بھر کر دوسری جگہ ڈالنے کا کام تھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔

وہ مہینوں یہ کام کرتا رہا، پھر ایک دن ہمت کر کے اس نے اپنے باپ کے نام ایک خط بھیجا اور ہفتوں جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن انتظار بے سود تھا۔ اتنے دنوں مٹی ڈھوتے رہنے کی مشقت نے اسے زندگی کے بہت سے نکتے تعلیم کر دیئے تھے۔ اگلی مرتبہ اس نے خط کے بجائے تھوڑی سی رقم باپ کے نام منی آرڈر کر دی۔ دو ہفتے بعد اسے گھر سے خط موصول ہوا جس میں سگے باپ اور سوتیلی ماں نے اسے بہت سی دعائیں بھیجی تھیں اور یہ بھی پوچھا تھا کہ جہاں وہ کام کرتا ہے وہاں سے اسے کیا ملتا ہے اور یہ کہ بد عادتوں میں پڑ

کر اسے رقم نہیں اڑانی چاہیے۔

انہی دنوں امریکہ سے ایک نیا آفندی آیا ہوا تھا۔اسے جب معلوم ہوا کہ ابنِ ایوب قبطی کلیسا میں پانچ جماعتیں پڑھ چکا ہے، عربی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھنا بھی جانتا ہے تو وہ سائٹ سپرنٹنڈنٹ پر ناراض ہوا اور اس نے ابن ایوب سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ رہے، وہ اسے کھدائی کے دوران برآمد ہونے والے مٹی کے ٹھیکروں کی صفائی کا کام سکھائے گا اور اگر اس نے ذہانت سے کام لیا تو پھر اسے Numbering اور Cataloguing سکھائی جائے گی۔

مصر کے بازار میں یعقوب کا بیٹا یوسف سوت کے چند گولوں کے عوض بکا تھا اور اس دن آفندی ڈیمک نے ابن ایوب کو بن داموں خرید لیا۔

آفندی ڈیمک نے کام کے آغاز سے پہلے اسے اپنے خیمے میں بلایا اور اس سے باتیں کرتا رہا۔وہ ٹوٹی پھوٹی عربی بولتا رہا اور ابن ایوب نے اٹکتی ہوئی انگریزی سے کام چلایا۔

آفندی ڈیمک نے اسے بتایا کہ فراعنہ قبطی النسل تھے اور چونکہ وہ بھی قبطی الاصل ہے اس لیے وہ اور اس جیسے دوسرے اپنے اجداد کے صحیح وارث ہیں اور وارثوں پر واجب ہے کہ جب وہ اپنے اجداد کی عظمت کے ثبوت اکٹھے کریں تو اس میں بہت احتیاط، اخلاص اور تحمل کا ثبوت دیں۔

دوسرے دن جب اس نے آفندی ڈیمک کے خیمے کے ایک گوشے میں رنگین اور منقش ٹھیکروں کے ڈھیر دیکھے اور اس نے جب ان ٹھیکروں کو ہاتھ لگایا تو اس کے بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اس دن اسے اپنا باپ، اپنی ماں، اپنے بھائی سب بہت حقیر لگے۔ وہ عام سے لوگ تھے اور ایک وہ تھا کہ ہزاروں برس پہلے گزرنے والے شہنشاہوں کے مقبروں سے نکلنے والے ساز و سامان کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ اس دن اس نے ان ٹکڑوں پر سے چونے کی تہ، گرد اور مٹی صاف کرتے ہوئے اپنی روح کی تمام قوت اور مستعدی اپنے ہاتھوں میں منتقل کر دی تھی۔

جلد ہی اسے یومیہ اجرت کے بجائے تنخواہ دی جانے لگی اور اس نے آفندی ڈیمک کے ذاتی خدمت گار کے فرائض بھی سنبھال لیے اور جس طرح اس کے آقا کا وفادار کتا نپولین اچھے راتب سے نوازا جاتا تھا اسی طرح ابن ایوب کو بھی لنچ اور ڈنر کا پس خوردہ ملنے لگا۔ تب اس کی زبان نے ان ذائقوں کو جانا جن سے اس کا سارا خاندان اور اس کے گاؤں کے تمام لوگ نا آشنا تھے۔ وہ ان سب سے کس قدر زیادہ اہم تھا، کتنا خوش نصیب تھا۔ وہ آفندی کو اس کے دھلے ہوئے کپڑے نکال کر دیتا، اس کے جوتوں پر پالش کرتا اور اس کے بچے ہوئے سینڈوچ اور سوپ سے اپنا پیٹ بھرتا۔ وہ اپنے خدا سے کس قدر قریب تھا۔

اس کی اطاعت گزاری، جاں نثاری اور زیادہ سے زیادہ کام سیکھنے کی لگن نے اسے بہت جلد مٹی کی زبان سمجھنا سکھا دیا۔ زمین اور اس کے مختلف طبقات، مختلف پرتیں، کاربن 12، اور کاربن 14 کے نمونے جو کھدائی میں برآمد ہونے والی شے کے زمانے اور اس کی قدامت کا تعین کرتے تھے، موٹر ڈرل اور Magnetometer کا استعمال، کھدائی سے پہلے کھونٹیوں کی تنصیب۔

اب وہ خاصی صاف انگریزی بولنے لگا تھا، اس نے قاہرہ اور دوسرے کئی شہروں کے میوزیم دیکھ ڈالے تھے اور آفندی کے ساتھ کرناک، لکسر اور تھیبز تک ہو آیا تھا۔

ابن ایوب کی ٹانگ میں خارش اور تپکن کی ایک لہر سی اٹھی اور وہ بے تاب ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کھجانے کی خواہش پر قابو پایا اور ایک بار پھر آفندی ڈیمک کے بارے میں سوچنے لگا۔

اسے احساس ہوا کہ واقعات کی ترتیب اسے صحیح یاد نہیں رہی ہے۔ آفندی نے جب اسے ترقی دی تھی، اس کے چند ہی مہینوں بعد باپ اور سوتیلی ماں کے اصرار نے اور اس کے بدن میں ہنگامہ برپا کرتی ہوئی خواہشوں کے سیلاب نے۔ اسے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی بیوی اس کے سوتیلے ماموں کی بیٹی اور ایک صابر و شاکر دیہاتی لڑکی تھی۔ وہ شادی کے نو برس بعد تک زندہ رہی اور اس کا بیشتر وقت تنہا ہی گزرا، ابن ایوب اسے ساتھ

نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی کیونکہ شادی کے چار سال کے اندر ابن ایوب کا باپ اور اس کی ماں دونوں چل بسے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے پوتے کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا نام انہوں نے یوسف رکھا تھا۔ یوسف کے بعد ابن ایوب کے خاندان میں اضافہ نہ ہوا۔

ابن ایوب کا بیٹا اس کی شدید خواہش کے برخلاف گاؤں میں پلتا بڑھتا رہا۔ اسے اپنے باپ کے کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے نانا کے ساتھ کشتی کی سیر کو جاتا اور اپنے نانا اور ماموؤں کی طرح کشتی رانی کا اور مچھلیاں پکڑنے کا دلدادہ تھا۔

امبابہ، قاہرہ کا ایک چھوٹا سا محلّہ تھا، کم حیثیت اور کم سواد لوگوں کا محلّہ اور یہیں اس کی ملاقات زبیدہ سے ہوئی۔ زبیدہ کے لیے اس کی خواہش میں کوئی کھوٹ، کوئی وقتی ہیجان شامل نہ تھا۔ وہ اس کا احترام کرتا اور اس کے عشق میں گرفتار تھا۔ زبیدہ بھی اس پر مرمٹی تھی، وہ گھنٹوں اسے فراعنہ کے خزانوں کے قصے اور ان رنگین دیواروں کی کہانیاں سناتا جو آج سے کئی ہزار برس پہلے بنائی گئی تھیں۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ زبیدہ مسلمان تھی اور وہ عیسائی۔ وہ شادی شدہ تھا اور اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ غرض یہ کہ وہ زبیدہ کو دیکھتا اور آہیں بھرتا' خواہشیں بے لگام ہونے لگتیں تو بازار چلا جاتا اور کسی بھی کسبی کے ساتھ ایک رات گزار آتا۔

جس نرمی اور محبت سے وہ فراعنہ کے مقبروں سے نکلنے والے مٹی کے ٹھیکروں کو چھوتا تھا، اس نرمی سے اس نے کبھی ان عورتوں کے بدن نہیں چھوئے تھے جنہیں وہ ایک رات کے لیے خریدتا رہا تھا۔ وہ اسی کی طرح گوشت پوست سے بنی تھیں، وہ نہ ہزاروں برس قدیم تھیں اور نہ کسی فرعون کے مقبرے سے برآمد ہوئی تھیں۔ ان کے بدن کے نشیب و فراز کسی شاہی کمہار کے چاک پر بھلا کب ڈھلے تھے کہ وہ انہیں احتیاط سے برتتا۔ اور پھر یہ بھی تو تھا کہ وہ انہیں خریدنے کے پیسے ادا کرتا تھا جبکہ فراعنہ کے مقبروں سے نکلنے والے مٹی کے ٹھیکروں کو چھونے اور صاف کرنے کے عوض اسے روپے ملتے تھے۔ مٹی کے یہ ٹھیکرے اس کے آقا تھے۔ فراعنہ ہزاروں برس پہلے ختم ہو چکے تھے لیکن ان کے ساتھ دفن ہونے

والے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اب بھی ان گنت لوگوں کو دو وقت کی روٹی عطا کرتے تھے۔ فراعنہ نہیں رہے تھے اور پھر بھی رازق تھے، ان داتا تھے۔

وہ زبیدہ کے لیے تڑپتا رہا اور اسی اثنا میں زبیدہ کی شادی ہوگئی۔ وہ اپنے عم زاد سے بیاہ دی گئی جو تربوز اور کھجوریں بیچتا، اس کی ہر بات پر شک کرتا اور ہر تیسرے چوتھے طلاق کی دھمکی دیتا۔ زبیدہ کی شادی کے ڈھائی برس بعد اس کی بیوی ختم ہوگئی تب اس نے بہت چاہا کہ وہ زبیدہ کو کسی طور پر اپنے شوہر سے طلاق لینے پر آمادہ کر سکے۔ اس نے کہا کہ وہ شادی کے لیے مسلمان ہو جائے گا، اسے قاہرہ کے کسی اچھے محلے میں گھر لے کر دے گا۔ لیکن زبیدہ اب ایک بیٹے کی ماں تھی اور دوبارہ امید سے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خلع کی صورت میں اس کا بیٹا اس سے چھن جائے گا اور آخر کار نوزائیدہ بھی اس سے الگ کر دیا جائے گا۔ زار زار روتے ہوئے اس نے ابن ایوب کو سمجھایا کہ وہ اسے بھول جائے اور اپنے ہی مذہب کی کسی لڑکی سے شادی کر لے۔

ابن ایوب نے یہ مشورہ سنا اور اسے ذہن کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔ فرق ہوا تو بس اتنا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے کسبیوں کے پاس جانے لگا۔ دل کے معاملے الگ ہیں۔ لیکن بدن دل کے معاملے بھلا کب سمجھتا ہے۔

اسی زمانے میں اس کے جنگھاسوں پر گلٹیاں نمودار ہوئیں اور پھر وہ زخموں میں تبدیل ہوگئیں۔ ان گلٹیوں اور زخموں نے اس کے جسم میں آگ لگا دی اور درد نے اس کے وجود میں بسیرا کر لیا لیکن پھر بھی وہ لگن سے کام کرتا رہا۔

ابن ایوب کو وہ دن آج بھی پوری تفصیل کے ساتھ یاد تھا جب آفندی ڈیمرک نے خوفو کی شاہی کشتی دریافت کی تھی، جب ایک چٹان میں سوراخ کر کے رسی سے ٹارچ باندھی گئی تھی اور اس ٹارچ کی روشنی میں پانچ ہزار برس پرانی اس تدفینی کشتی کو سب نے باری باری دیکھا تھا جسے فرعون خوفو نے اس لیے تیار کرایا تھا کہ موت کے بعد وہ اس میں بیٹھ کر مقدس دریا کو عبور کر سکے اور ابدی زندگی کا سفر اختیار کر سکے۔

اس کشتی کو گہری خندق سے نکالنے کا کام بہت تھکا دینے والا اور اعصاب شکن تھا،

اور اس تمام ہنگامے کے دوران وہ آفندی ڈیمک اور پروفیسر ابوبکر کا دست راست رہا تھا۔

ان لمحوں کو یاد کر کے ابن ایوب کے بدن میں سرخوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اس کا جی کچھ کھانے کو چاہا، یوں بھی اس نے مکئی کی روٹی کا جو ٹکڑا تھوڑی دیر پہلے پانی میں بھگو کر کھایا تھا، وہ اس کی بھوک مٹانے کے لیے ناکافی تھا۔ وہ سوچتا رہا پھر اسے وہ کھجوریں یاد آئیں جو زبیدہ چند دن پہلے لائی تھی اور جن میں سے دو کھجوریں اس نے بچالی تھیں۔ بقچے میں سے ٹٹول کر اس نے وہ دونوں کھجوریں نکالیں، ان میں سے ایک اپنی مٹھی میں دبالی اور دوسری کو منہ میں رکھ لیا۔ اس کی اینٹھی ہوئی اور ذائقوں کو ترسی ہوئی زبان پر شیرینی کی دھنک سی نکل آئی۔ وہ دیر تک اس ایک کھجور کو جبڑوں اور زبان کے درمیان الٹتا پلٹتا رہا، چوستا، چباتا رہا۔ شیریں لعاب اس کے حلق سے نیچے اترا تو اسے محسوس ہوا کہ زندگی اب بھی بہت حسین ہے، بہت بامعنی ہے۔

اسے زندگی کا سب سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا جب آفندی ڈیمک واپس چلا گیا اور اس کی جگہ آنے والے آفندی نے اسے وہ منصب عطا نہ کیا جس پر فائز رہنے کا وہ کئی برس سے عادی تھا۔

ادھر اس کی گلٹیاں اور زخم بڑھتے اور پھیلتے ہی چلے جا رہے تھے۔ وہ کیمپ کے ڈاکٹر سے اکزیما کی دوائیں لیتا رہتا تھا لیکن فائدے کی کوئی صورت نہ تھی۔ نئے آفندی نے اس کی حالت دیکھی تو اسے قاہرہ کے ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس اپنا خط دے کر بھیجا۔ ڈاکٹر نے اسے اچھی طرح دیکھا بھالا، خون اور پیشاب کا معائنہ ہوا۔

دوسرے دن جب وہ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے نئے آفندی کے نام ایک خط دیا۔ ابن ایوب اپنے مسیحا کا خط لے کر کیمپ پہنچا، نئے آفندی نے ڈاکٹر کا خط پڑھا اور اسے کھڑے کھڑے ملازمت سے برخاست کر دیا۔

وہ صرف اکزیما ہی کا بیمار نہیں تھا، اسے آتشک بھی ہو گئی تھی، جو وقت اس نے کسبیوں کے پاس گزارا تھا، وہی وقت اس کے لہو میں سڑ گیا تھا۔

اس نے اپنی ساری جمع پونجی علاج پر خرچ کر دی لیکن آرام اس سے بہت دور جا چکا

تھا۔ وہ ماہرین آثار کے کیمپوں میں مارا مارا پھرتا، اپنی کارگزاری اور اپنی صلاحیتیں بتاتا۔ آفندی ڈیمک کا دیا ہوا اعلیٰ کارکردگی کا سرٹیفکیٹ دکھاتا لیکن کوئی نہ اس کی صلاحیتوں سے غرض رکھنا چاہتا تھا، نہ سند دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ روحانی اور جسمانی دونوں جذاموں کی سزا بھگت رہا تھا۔

خندقیں، زمین کی گہرائیوں میں اتری ہوئی سرنگیں، فراعنہ کے چھوٹے اور بڑے ہرم، مٹی کے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے یہ سب کچھ اس کی زندگی تھے۔ وہ قبطی الاصل تھا اور اس نے اپنی زندگی اپنے عظیم شہنشاہوں کے آثار کی دیکھ ریکھ کے لئے دان کر دی تھی۔ وہ ان چیزوں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لیکن اب مردہ شہنشاہوں اور زندہ عالموں کو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

جب اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی تو وہ اپنے گھر چلا گیا۔ گھر اس کے سوتیلے بھائی، اس کی بیوی اور بچوں کا تھا اور اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

بھائی سے مایوس ہو کر اس نے خسر کے گھر کا رخ کیا جہاں اس کا بیٹا تھا، اس کا اپنا خون، بیٹا مچھلیاں پکڑتا تھا اور اپنی شادی کے لیے پیسے جوڑ رہا تھا۔ یوسف نے جب باپ کا یہ حال دیکھا تو کہا کہ وہ دو راتیں بیل کے چھپر تلے گزار دے، وہ مچھلیاں پکڑنے جا رہا ہے۔ دو روز بعد واپس آئے گا تو اس کے لیے دریا کے کنارے ایک جھونپڑی ڈال دے گا اور روزانہ اسے کھانا پہنچا دیا کرے گا۔

بیٹے کا یہ ہمدردانہ رویہ ابن ایوب کے لیے نعمت عظیم تھا۔ وہ بیل کے پیشاب کی کھراند اور گوبر کی بو سے بسی ہوئی فضا میں دو دن تک اپنے زخموں سے مکھیاں اڑاتا رہا اور ان روٹیوں پر گزارا کرتا رہا جو بیٹا اسے دے گیا تھا۔

تیسرے دن یوسف کا نانا اپنی داڑھی نوچتا ہوا اور سر پر خاک ڈالتا ہوا بیل کے چھپر تک آیا اور چیخ چیخ کر ابن ایوب کو برا بھلا کہنے لگا۔ ابن ایوب نے اپنے زخموں پر سے مکھیوں کو اڑاتے ہوئے اس کی چیخ و پکار کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ نیل کی لہریں یوسف کی کشتی کو نگل گئی ہیں۔

ابن ایوب سر جھکائے بیٹھا رہا اور اپنے خسر کی فریاد سنتا رہا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب اس نے قبطی الاصل شہنشاہ خوفو کی تدفینی کشتی کو زمین کی گہرائیوں سے نکالنے والے رسّوں کی چرخی کو چلایا تھا اور پانچ ہزار برس پرانی کشتی کو وہ اور اس کے ساتھی اوپر لے آئے تھے۔ اور اب جب کہ اس کا خون، اس کا اکلوتا بیٹا لکڑی کے معمولی تختوں سے بنی ہوئی کشتی میں بیٹھ کر نیل کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا تو وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی لاش ڈھونڈنے کے لیے دریا میں بھی نہیں اتر سکتا تھا۔

ایک وہ کشتی تھی اور یہ بھی ایک کشتی ہی تھی اور یوسف بھی خوفو کی طرح قبطی النسل ہی تھا۔ اس رات ابن ایوب کو ملکہ تی کے مقبرے کی رنگین دیواری تصویر یاد آئی۔ اس تصویر میں ایک دریائی گھوڑی دردزہ کے عذاب سے گزر کر اپنے بچے کو جنم دے رہی ہے۔ بچے کا آدھا دھڑ باہر آچکا ہے اور عین اسی جگہ ذرا نچائی کی طرف ایک مگر مچھ منہ کھولے للچائی ہوئی نظروں سے بچے کو دیکھ رہا ہے کہ کب وہ ماں کے پیٹ سے باہر آئے اور کب وہ اسے نگل لے۔

یوسف زندگی کے بطن سے باہر آیا ہی تھا کہ موت کے گھڑیال نے اسے نگل لیا۔

ابن ایوب اپنے بیٹے کی موت کے تیسرے دن پو پھٹے نبیل کے چھپر سے باہر آیا اور قاہرہ کی طرف چل پڑا۔

کئی دن بعد جب وہ قاہرہ کے قریب پہنچا تو نیم مردہ تھا۔ اس کی جیب میں قسم کھانے کو ایک ملیم کا سکہ بھی نہ تھا اور اس کی انتڑیوں نے دو دن سے اناج کے ایک بھی دانے کا بوجھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنا خارش زدہ بدن اور بھوک سے اینٹھتی ہوئی انتڑیاں لے کر قبطی کلیسا چلا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے بدن کا ضرور علاج کریں گے۔ اس کے معدے کو اناج سے بھر دیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ پھر اس کی روح کا بھی علاج کرنا چاہیں گے۔ اس کی روح جوان کے نزدیک بیمار تھی، تب ہی تو وہ کسبیوں کے گھر جھانکتا پھرا تھا۔

اس نے شہنشاہوں کے مقبرے، ان کی ممیاں، ان کا سازوسامان، ان کے زرجواہر

سب کچھ دیکھے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ حیات جاودانی کے لیے فراعنہ اور ان کے امراء نے جو عظیم الشان مقبرے تعمیر کرائے تھے اور جو ساز و سامان جمع کیا تھا وہ سب لٹیروں نے لوٹ لیا تھا اور سفید پٹیوں میں لپٹی ہوئی ممیاں ان لٹیروں کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھیں، دوائیں، تعویز اور سراپ ان لٹیروں کا بال بیکا نہ کر سکے تھے۔ روح، حیات بعد موت اور روزِ آخرت پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ وہ اپنے عظیم جد خوفو کی طرح پروہتوں اور راہبوں سے نفرت کرتا تھا۔

برسوں پرانا اپنا وہ بستہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جسے وہ کلیسا کی دیوار کے سائے میں رکھ کر چلا آیا تھا اور پلٹ کر کبھی نہیں گیا تھا۔ ایک ناکردہ گناہ کی سزا اس نے یہ بھگتی تھی اور اب تو وہ کردہ گناہوں کی سزا پاتا تھا۔

وہ سوچتا رہا اور لڑکھڑاتا ہوا چلتا رہا۔ اس کے پیروں میں آبلے تھے اور روح کانٹوں کے بستر پر تھی۔ چلتے چلتے اس نے اپنے آپ کو خوفو کے ہرم کے سائے میں پایا۔ اس کی داستان جہاں سے شروع ہوئی تھی، ایک بار پھر وہیں آ کھڑی ہوئی تھی۔

دیس دیس کے لوگوں کا ہجوم تھا، وہ ہجوم سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا، لوگ اس کے قریب سے گزرتے رہے پھر کسی نے گزرتے ہوئے اس کے سامنے چند پیاسٹر پھینک دیئے۔ گزرنے والا گزر گیا۔ وہ ان سکوں کو چند ثانیوں تک دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی ٹھٹھری ہوئی اور اینٹھی ہوئی انگلیوں سے وہ سکے اٹھائے اور اس طرف لپکا جہاں ایک خوانچہ فروش روٹی اور تامیہ بیچ رہا تھا۔

یہ پہلی خیرات تھی جو ابن ایوب نے قبول کی اور جس کے عوض اسے ایک روٹی اور تامیہ میسر آیا۔

یومیہ اجرت کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا۔

دن، ہفتے، مہینے، سال، لمحہ، ساعت، یہ سب اس کے لیے بے معنی لفظ تھے۔ تمام دن یکساں تکلیف تھے، تمام راتیں مسلسل درد تھیں۔ تمام مہینے عذاب کی گردان تھے اور تمام سال اذیتوں کا تسلسل تھے۔ پھر وہ دنوں کے نام اور مہینوں کی تاریخیں کیوں اور کس لیے یاد

رکھتا؟ اب اسے وقت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

جانے کتنے دن اسی طرح گزر گئے۔ خوفو کا ہرم، آس پاس پھیلے ہوئے دوسرے کھنڈر اور مقبرے اس کا گھر تھے۔ وہ رات کو خوفو کے ہرم کی پہلی سیڑھی سے لگ کر سو جاتا اور دن بھر ہرم کے سامنے اپنی گدڑی پر بیٹھا رہتا۔ اسے صدا لگانے یا گھگھیانے سے نفرت تھی۔ یوں بھی زندگی اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس کے لیے وہ مزید ذلت اور مزید رسوائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا۔ وہ گھومتے ہوئے سیاحوں، بھیک مانگتے ہوئے فقیروں، انگریزی اور فرانسیسی بولتے ہوئے گائڈوں اور کھانے پینے کا سامان بیچتے ہوئے خوانچہ فروشوں کو دیکھتا اور خاموشی سے ریت پر لکیریں کھینچتا رہتا۔ گزرتے ہوئے لوگ اسے دیکھ کر خود ہی چند سکے اس کے سامنے پھینک دیتے۔

پھر اس نے ایک دن زبیدہ کو دیکھا۔ وہ سر پر گٹھڑی رکھے ہوئے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اور وہ پہلی ساعت تھی جب اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ اس کے منہ سے زبیدہ کا نام بے ساختہ ایک چیخ کی صورت میں نکلا۔

زبیدہ نے اپنا نام سنا تو ٹھٹھک گئی۔ ایک فقیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی ہوئی داڑھی، بڑھے ہوئے بال، بدن پر مکھیاں بھنکتی ہوئی۔ اسے گمان ہوا کہ شاید اس کے کانوں نے غلط سنا ہے لیکن جب فقیر نے اس کا نام دوبارہ لیا تو وہ جھجکتے ہوئے قریب آئی۔

زبیدہ نے ابن ایوب کو پہچانا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جس شخص نے آج سے برسوں پہلے اس سے شادی کرنے کی خاطر اپنا مذہب بدلنے کی ہامی بھری تھی، جو اس کو ریشمیں کپڑوں اور چمکیلے پتھروں والے زیوروں کے تحفے دیتا تھا، جو اسے کئی مرتبہ اچھے ہوٹلوں اور سینما گھروں میں لے گیا تھا، جس کا بٹوا گنی اور پیاسٹر کے نوٹوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہی خوش پوشاک اور کھاتا پیتا آدمی کاسۂ گدائی لیے بیٹھا ہے۔ اپنے بدن سے مکھیاں اڑاتا ہے پر وہ نہیں اڑتیں۔

ابن ایوب نے زبیدہ سے کچھ نہ چھپایا۔ چھپانے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ سر جھکائے سب کچھ سنتی رہی، پھر اس نے گٹھری اٹھا کر سر پر رکھی اور دوسرے دن آنے کا

وعدہ کر کے چلی گئی۔

وہ پہلی رات تھی جب ابن ایوب نے لمحوں، ساعتوں اور گھنٹوں کا حساب کیا۔

دوسرے دن وہ آئی تو اپنے شوہر کا ایک جوڑا اور نائی ساتھ لائی۔ نائی نے ابن ایوب کا حال دیکھا تو اس کے بال تراشنے اور داڑھی بنانے سے انکار کر دیا۔ وہ جھنجھلاتا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو زبیدہ ابن ایوب کا ہاتھ پکڑ کر ایک قریبی جوہڑ تک لے گئی اور جب وہ اس جوہڑ سے زندگی کے تمام غم اور ساری محرومیوں کو دھو کر نکلا تو زبیدہ نے اسے اپنے شوہر کی اترن پہنادی۔ ابن ایوب نے اپنے آپ کو جتنا امیر اس دن پایا، اس کا وہ حساب بھی نہ کر سکا۔

زبیدہ نے اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹی اور کباب اس کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ کھاتا رہا اور زبیدہ اسے بتاتی رہی کہ امبابہ کا علاقہ تو انہوں نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ ایک قریبی بستی میں رہتے ہیں۔ اس کے شوہر نے تربوز بیچنے کا کام ترک کر دیا تھا اور اب وہ برتنوں کی ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ اس کے تینوں بیٹے بھی اس قابل ہو گئے تھے کہ خوانچہ لگا کر اور آفندیوں کی گاڑیاں دھو کر روزانہ کچھ نہ کچھ گھر لے آتے تھے۔

اس دن کے بعد زبیدہ نے یہ روز کا معمول بنا لیا کہ وہ دوپہر سے پہلے اس کے لیے کھانے کی پوٹلی لے کر آتی، کچھ دیر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی اور چلی جاتی۔

کئی برس تک زبیدہ نے اپنے معمول میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اگر کسی دن اس کا شوہر طبیعت کی خرابی یا چھٹی کے سبب گھر میں ہوتا، اس دن ابن ایوب کو انتظار لا حاصل کے عذاب سے گزرنا پڑتا۔

پھر اچانک زبیدہ تیزی سے بوڑھی ہونے لگی، اس کی آنکھوں میں موتیا کا پانی اترنے لگا، اس کے چہرے پر جھریوں کا جال تیزی سے پھیلنے لگا۔ ایک دن اس نے کہا کہ وہ اب روزانہ اتنا نہیں چل سکتی ہر دوسرے دن آیا کرے گی، ابن ایوب کے لیے دن اب بارہ گھنٹوں کے بجائے 24 گھنٹوں کا اور رات بھی 12 کے بجائے 24 گھنٹوں کی ہونے لگی۔

اس کے بعد زبیدہ کئی دن تک نہ آئی، وہ دن اور راتیں ابن ایوب نے جہنم کے ساتویں طبقے میں بسر کیں۔ چند دنوں بعد اس نے دیکھا کہ ایک گھبرایا ہوا لڑکا ایک ایک فقیر کو غور سے دیکھتا اور کچھ پوچھتا ہوا گھوم رہا ہے، پھر وہ لڑکا اس کے پاس آ کر رک گیا۔ یہ زبیدہ کا لڑکا تھا اور اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی ماں عدت میں ہے۔

وہ لڑکا ہر تیسرے چوتھے دن اس کے لیے کھانا لے کر آتا اور پوٹلی جلدی سے اس کے حوالے کر کے چلا جاتا۔ اس کی سمجھ میں یقیناً یہ بات نہیں آئی ہو گی کہ اس کی ماں آخر اس خاص فقیر کے لیے ہی خیرات کیوں بھجواتی ہے۔

زبیدہ کی عدت کی مدت ابن ایوب نے کانٹوں پر بسر کی، وہ اس کی ویران اور پُرآزار زندگی میں مسرت کا واحد سبب تھی۔ وہ آئی تو اسے دیکھ کر ابن ایوب پہلے تو بہت خوش ہوا، پھر وہ رو دیا۔ وہ اب واقعی بوڑھی ہو گئی تھی۔

اب جب کہ اس کا شوہر نہیں تھا، زبیدہ نے چاہا کہ وہ اس کے یہاں چل کر رہے وہ اس کے لیے الگ کوٹھری کا انتظام کر دے گی لیکن ابن ایوب نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ جوان بیٹوں کی بوڑھی ماں کے احترام میں کسی کمی کے آنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے زندگی میں صرف ایک عورت کا احترام کیا تھا اور وہ زبیدہ تھی۔ پھر اب وہ اسے کس طرح بے وقار کر سکتا تھا۔ پاس پڑوس والے کیا کہیں گے، جوان بیٹے نہ جانے کیا سوچیں۔ یوں بھی اب اسے زمانے سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وقت نے اس کے ہاتھ میں بھیک کا ٹھیکرا تھما دیا تھا لیکن وقت نہ اس سے ماضی کی یادیں چھین سکا تھا اور نہ زبیدہ کے دل سے اس کی محبت کھرچ سکا تھا۔ اور یہی وہ مقام تھا جہاں وقت اس سے ہار گیا تھا۔

ایک دن جب زبیدہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی تو باتوں ہی باتوں میں زبیدہ کی آنکھ کے آپریشن کا ذکر نکل آیا۔ زبیدہ نے اسے بتایا کہ اگر خیراتی ہسپتال میں آپریشن کرایا جائے تب بھی خاصی رقم دواؤں اور کھانے پینے پر اٹھ جاتی ہے۔

اس دن کے بعد ابن ایوب نے اپنی ذات پر اپنی یومیہ اجرت کا ایک سکہ بھی خرچ نہ

کیا۔ ابن ایوب آہستہ سے ہنسا، اس نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی تھیلی ٹٹولی، اس میں نوٹ ہی نوٹ تھے اور یہ نوٹ اس کی مہینوں کی بچت کا نتیجہ تھے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کل یا پرسوں جب زبیدہ آئے گی تو وہ ساری رقم اس کے حوالے کر دے گا۔ یہ اتنی رقم ضرور تھی کہ اس کی آنکھوں کا آپریشن کسی خیراتی ہسپتال کے بجائے کسی اچھے ہسپتال میں ہو سکے، دوائیں بھی خریدی جا سکیں اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔

یہ رقم زبیدہ کی امانت تھی، وہ اس امانت کو اسے ہی لوٹا دے گا۔ خوشی اس کے بدن میں دائرے بنانے لگی، لہریں لینے لگی۔ پھر اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی، کاش وہ اسے اپنی بیوی بنا سکتا۔ اس نے زبیدہ کو اپنی خواہشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کسبیوں کا گھر دیکھا تھا۔

وہ ہڑ بڑا کر ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔ اس کی نگاہیں اندھیرے میں کیسے کیسے خاکے بنا رہی تھیں پھر ان میں رنگ بھر رہی تھیں۔ زبیدہ اس کی دلہن بنی ہوئی تھی۔ وہ اسے ملکہ نیفر تیتی کے زیور پہنا رہا تھا، اس کی انگلیوں کو ملکہ تی کی انگوٹھیوں سے سجا رہا تھا۔ خوفو کی شاہی کشتی میں بٹھا کر وہ اسے نیل کی سیر کرانے نکلا تھا۔ وہ اسے کرناک، تھیبز اور لکسر کے کھنڈر، مقبرے اور مندر دکھا رہا تھا۔

وہ اس کے ساتھ تھی، اس میں تھی، وہ اس کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، اس کے ہونٹوں سے چکھ رہی تھی، اس کے پیاسے وجود کو سیراب کر رہی تھی۔

ابن ایوب کے سینے میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ زبیدہ آج اس کی تھی، صرف اس کی۔ آج کی رات جشن کی رات تھی۔

اس کا دایاں ہاتھ بے اختیار بغچے میں رینگ گیا، کھجور کا آخری دانہ بغچے میں تھا، اس کے ہاتھ نے زبیدہ کی عطا کو ٹٹول کر مٹھی میں دبا لیا۔ بھولے بسرے ذائقے اس کی اینٹھی ہوئی زبان اور ترسے ہوئے حلق میں بجھنے لگے۔ شیریں ذائقے اس کی زبان کو چھوتے ہوئے حلق سے نیچے اتر رہے تھے، لمس کی صد رنگ لذتیں اس کی پور پور میں سانس لے رہی تھیں۔

ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی دو آنکھوں نے پلکیں جھپکا کر ادا سے اسے دیکھا پھر وہ دو آنکھیں فضا میں تیرتی ہوئی اس تک آئیں اور اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھیلی میں چھپ گئیں، یہ آنکھیں اب اس کی تھیں، صرف اس کی۔

یہ جشن کا لمحہ تھا، اس کا دایاں ہاتھ لبوں تک آیا، آخری کھجور کو جبڑوں اور دانتوں کے حوالے کرنے کے لیے اور اسی لمحے ابن ایوب کے ہاتھ نے اور اس کے بدن نے جھٹکا کھایا، وہ لذت کی شدت سے دہرا ہو گیا اور پھر اس کا زخمی وجود زمین پر بچھ گیا۔

ابن ایوب کا پہلا اور آخری خواب مکمل ہو گیا تھا۔

○○

رنگ، تمام خوں شدہ

دیواروں پر کنول روشن تھے، امام باڑے کے وسط میں لٹکتے ہوئے جھاڑ کا ہر فانوس روشن تھا۔ چاروں کونوں میں اگر دان جل رہے تھے اور خوشبو ماحول اور منظر کو اپنے پروں میں سمیٹے ہوئے تھی۔

گیلریاں عورتوں اور بچوں سے پٹی ہوئی تھیں، نیچے مردوں کا ہجوم تھا۔ سینکڑوں لوگوں کی سانسوں کے ساتھ مل جل کر اگر کا دھواں اوپر کو چڑھ رہا تھا۔

عذرا کو گھمیری سی آئی۔

سوز خواں تخت سے اتر چکے تھے۔ ان کے لحن کی گونج ابھی لہو میں گردش کر رہی تھی۔ علی کرار صاحب زیبِ منبر ہو چکے تھے۔ ان کی پاٹ دار آواز امام باڑے کے طاقچوں، دروں اور دریچوں میں گریہ کر رہی تھی۔

گھر گرتے ہیں بستی میں، یہ بدعت ہے، یہ بیداد
ویراں ہیں جو سو گھر تو کہیں ایک ہے آباد
پھرتے ہیں مکانوں کے مکیں مضطر و ناشاد
حاکم ہے وہ مغرور کہ سنتا نہیں فریاد

لفظ، ان کے معانی، ان کی جہتیں اور ان کی نزاکتیں آواز کے وسیلے سے سننے والوں تک پہنچ رہی تھیں اور حسبِ ذوق، حسبِ استطاعت استعارے اور اشارے اپنا اثر دکھا

رہے تھے۔

مغرور حاکموں، اور مظلوم محکوموں کی یہ کہانی کتنی قدیم تھی۔ ہر استبدادی شہر کوفہ تھا۔ ہر مغرور حاکم ابن زیاد تھا۔ عہد بہ عہد کہانی کا لوکیل، اس کے کرداروں کے نام، ان کی قومیتیں اور ان کے عقیدے بدل جاتے تھے۔

علی کرار صاحب کی آواز کڑکی۔

یہ معرکہ دیکھے گا وہ، زندہ جو رہے گا

خوں تا بہ کمر دار امارہ میں بہے گا

عذرا کو ایک بار پھر زور کی گھمیری آئی اور اس نے بے تاب ہو کر اپنی پیشانی گیلری کے آہنی جنگلے سے ٹکا دی۔ ٹھنڈک اس کے اندر اترنے لگی، خوف کی اور بے یقینی کی ٹھنڈک۔ دار امارہ میں تو کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹتی تھی، وہاں راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

صبح کورٹ میں اس نے اپنے دوستوں کو گاڑی سے اترتے دیکھا تھا۔ یہ لوگ جس گاڑی سے اتارے گئے تھے اس کے عقبی حصے میں اوپر کی طرف ایک آہنی جنگلہ لگا ہوا تھا اور جب گاڑی کورٹ کے احاطے میں رکی تھی تو اس جنگلے سے اسے اپنے دوستوں کے چہروں کی کترنیں سی نظر آئی تھیں۔ سفید ڈلے۔ سیاہ دیدے، مٹیالی پیشانیاں۔

نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی سر اٹھا کر دیکھے تو شاید اسے بھی ہمارے چہروں کی کترنیں نظر آئیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی عذرا کی نگاہوں میں وہ رلیاں گھوم گئیں جو سینکڑوں اور ہزاروں میں بکتی تھیں اور رنگین کپڑوں کی کترنوں سے بنائی جاتی تھیں۔

لیکن یہ لوگ انسانوں کی کترنوں سے کیا بناتے ہیں؟ دار امارہ کے قالین شاید انہی کترنوں سے بنتے ہوں، حکمرانوں کی قباؤں میں بھی شاید یہی کترنیں استعمال ہوتی ہوں،

علی کرار صاحب کی آواز کی گریہ تا کی اسے پھر زماں سے مکاں میں کھینچ لائی۔

اب آ نہیں سکتے کہ ہمیں گھیرے ہیں جلاد

بابا کی وصیت نہ بھلانا ' یہ رہے یاد

مشکل ہے جو کچھ، سہل ہوئی جاتی ہے بیٹا

درو دیوار سسکیوں اور آہوں سے بھر گئے۔ علی کرار صاحب دلوں کو شق کر کے منبر سے اتر آئے۔ عذرا نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات خاصی گزر گئی تھی اور اب گھر پہنچنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ صبح اسے بہت سویرے اٹھنا تھا اور سات بجے اس پنج ستارہ ہوٹل میں پہنچ جانا تھا جہاں سے ایک قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ قیمتی رلیاں، خوبصورت اجرکیں، رنگین کرسیاں اور نیلے رنگ کے منقش برتن اس قافلے کے منتظر تھے۔

قافلے کو اپنے شہر سے چلے ہوئے ساتواں اور آخری دن تھا۔ آج شب، شبِ رخصت تھی۔ آج دن ہی دن میں انہیں سب کچھ دیکھ لینا تھا، ہر چیز برت لینی تھی۔ حیدر آباد، ہالہ اور بھٹ شاہ سے گزر کر قافلہ اب امرکوٹ میں تھا اور قلعے کے اندر اترا ہوا تھا۔

تاریخ جب کسی عجائب گھر میں کتابوں، ہتھیاروں، فرامین، مجسموں اور تصویروں کی صورت میں نظر آئے تو لوگوں کا رویہ اس کے بارے میں کچھ قبرستانوں جیسا ہوتا ہے۔ آہستہ چلو، آہستہ بولو ہنسی نہ آئے۔ بس گزرے ہوئے بادشاہوں کی بادشاہی کے نمونے دیکھو، ان کا اپنے حکمرانوں سے موازنہ نہ کرو اور گھر کی راہ لو۔

اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت تھی۔ ہال میں سب ہی دبے قدموں چل رہے تھے اور سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ ایک دیوار پر توڑے دار بندوقیں، ڈھال، خود، طمنچے اور تبر آویزاں تھے اور دوسری دیوار پر بہت سی مغل تصویریں سجی ہوئی تھیں۔

ایک میں سیف الملوک کا منظر تھا کہ شہزادہ ناچتی ہوئی پریوں کے جھرمٹ میں ہے۔ دوسری میں شہزادہ نہار رہا ہے۔ نہلانے والی کنیز بھی پانی میں اتری ہوئی تھی اور بے لباس تھی۔ تیسری تصویر میں جواں سال اکبر اپنے درباریوں کے درمیان تھا۔ سر پر چھتر کا سایہ تھا، درباریوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور شہنشاہ کے سامنے زمین پر ایک کیڑا رینگ رہا تھا۔ شاید یہ کیڑا اس عہد کے عوام کا Symbol تھا۔ ان ہی جتنا بے بضاعت اور بس ان ہی جتنا قابل ذکر۔

آقا اور رعیت کے رشتے سے نجات نہ عجائب گھر میں تھی، نہ مغلیہ عہد کی تصویروں

میں عذرا نے کڑھ کر اس شوکیس کو دیکھا جو اکبر اعظم کی تصویر کے نیچے رکھا تھا اور دودھیا روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ شوکیس میں رکھی ہوئی کتاب کھلی ہوئی تھی اور اس کے نیچے ''آئین اکبری'' کی اور ''ابوالفضل علامی'' کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

عذرا نے جھک کر کھلے ہوئے صفحے کی عبارت پڑھنی شروع کی۔

''بادشاہی اس ربِ یکتا و بے مثل کا ایک پرتو، آفتابِ عالم تاب کی ایک کرن، کمالات کے صحیفوں کی فہرست اور لیاقتوں کا مجموعہ ہے۔ اسے موجود زبان میں ''فرایزدی'' اور زبان قدیم میں ''کیاں خورہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بغیر کسی درمیانی وسیلے کے خدا کی طرف سے مقدس جسم میں پہنچائی جاتی ہے اور اس کے دیدار سے تمام لوگ اپنی جبینِ ستائش غلامی کی چوکھٹ پر رکھ دیتے ہیں''۔

اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ شاہوں کے، حکمرانوں کے آئین ابتداء سے اب تک ایک ہی تھے۔ عہد بہ عہد ان کے القاب بدل جاتے تھے، ان کا طریق حکمرانی بدل جاتا تھا لیکن وہ ہمیشہ ظل اللہ تھے، مامور من اللہ تھے۔ آج بھی حکمرانی، حکمرانِ وقت کے مقدس جسم میں بغیر کسی درمیانی وسیلے کے پہنچتی تھی۔

اس کا دم گھٹنے لگا، عجائب گھر کی دیواروں پر ہتھیار تھے اور عجائب گھر کی الماریوں میں وہ کتابیں تھیں، جو ان ہتھیاروں کو ظالموں کے حق میں استعمال کرنے کی دلیلیں لاتی تھیں۔ ''تحفہ شیر شاہی''، ''آئین اکبری''، ''انشائے ابوالفضل'' شاہ کے حق میں ہر دلیل تھی۔ شاہ کا ہر دعویٰ درست تھا۔

وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔ کھلی فضا میں، تازہ ہوا میں لیکن فضا اور ہوا میں بارود کی بو تھی۔ اس نے فصیل سے دیکھا۔ قلعے کے دروازے سے آرمرڈ کاروں کا ایک کانوائے نکل رہا تھا۔ چند میل دور تھر کے ریگستان میں فوجی مشقیں ہو رہی تھیں۔ قلعے میں فوجی کیمپ قائم تھا، دو جرنیل ان مشقوں کو دیکھنے کے لیے قلعے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

میزبان محکمے کے پی آر او بہت خوش تھے۔ حیدر آباد کا سیمینار بہت کامیاب رہا تھا اور دوسری بستیوں کا سفر بھی۔ فصیل پر لڑکیاں ان کے گرد اکٹھی تھیں اور انہیں طرح طرح

کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔ کسی کو فوجی مشقیں دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ اور کوئی انہیں اس پر راضی کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ چند گھنٹوں بعد شب چہار دھم شروع ہونے والی ہے تو کیوں نہ رات ریگستان میں گزاری جائے اور تھر کی ریت پر سوئی ہوئی چاندنی دیکھی جائے۔

پی آر او صاحب نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا پھر بتایا کہ تیس چالیس لوگوں کے لیے ریگستان میں رات گزارنے کا فوری طور پر انتظام ان کے لیے ممکن نہیں۔ اس خواہش کا اظہار اگر ان سے ایک دن پہلے کر دیا جاتا تو وہ ضرور کچھ کرتے۔ اور تب اچانک لاہور سے آنے والی ڈیلیگیٹ تہمینہ نے یاد دلایا کہ اکبر اعظم کی جائے پیدائش قلعے سے کچھ فاصلے پر ہے تو کیوں نہ وہاں کا رخ کیا جائے۔

''ہاں بی بی، یہ ضرور ممکن ہے لیکن وہ جگہ ریگستان میں ہے، وہاں ہماری گاڑیاں نہیں پہنچ سکتیں، ریت میں پھنس جائیں گی۔ آپ سب یہیں فصیل پر ٹھہریں، میں کرنل صاحب سے بات کرتا ہوں، اگر انہوں نے اپنے ٹرک ہمیں دے دیئے تو بات بن جائے گی۔'' پی آر او صاحب نے نیچے کا رخ کیا، ان کے نائب چنہ صاحب بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ وقت گزاری کے لیے لڑکیوں نے ذو ٹکڑیوں میں بٹ کر گانا شروع کر دیا۔

عذرا اور اسی جیسی چند دوسری بے سری لڑکیاں قلعے کی فصیل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں کے گیت سننے لگیں۔ کسی بھی ٹکڑی کو گانے مکمل یاد نہ تھے اس لیے ایک گیت ابھی پورا نہ ہوتا تھا کہ دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔

''تم نے میوزیم میں لگے ہوئے فرامین دیکھے''؟ لاہور کی تہمینہ نے سگرٹ سلگاتے ہوئے عذرا سے پوچھا۔ ان سات دنوں میں عذرا نے اسے کھل کر بات کرتے یا ہنستے نہیں دیکھا تھا۔

''ہاں دیکھے بھی اور پڑھے بھی۔''

''تمہیں ان میں اور اب کے فرامین میں کچھ فرق نظر آیا''؟ تہمینہ نے دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے تو بہت فرق نظر آیا۔ پہلے وہ عقوبت کے احکامات فارسی میں صادر کیا کرتے تھے اب یہی احکام انگریزی، اردو اور پنجابی میں دیئے جاتے ہیں تمہارے خیال میں کیا یہ بڑا فرق نہیں''؟

تہمینہ خاموشی سے ماچس کی جلی ہوئی تیلی سے فصیل کی ایک درز کو کریدنے لگی۔

''فصیلوں میں جلی ہوئی تیلیوں سے نقب نہیں لگتی۔'' عذرا نے اسے یاد دلایا

''یہ بات مجھ سے زیادہ کون جانے گا، میرا دوست شاہی قلعے میں ہے'' تہمینہ نے آہستہ سے کہا اور اس کا فقرہ عذرا کو دہلا گیا۔ اس نے بے تاب ہو کر تہمینہ کا ہاتھ تھام لیا جو نازک تھا، سفید تھا اور سرد تھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے اس کا قطعاً علم نہ تھا۔'' عذرا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اور کیا کچھ کہے۔

''کوئی بات نہیں۔'' تہمینہ نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس طرف متوجہ ہو گئی جدھر لڑکیوں کی ایک ٹکڑی فرش پر بیٹھی تھی اور تالیوں کی سنگت میں زور زور سے گا رہی تھی۔

''تری محفل میں قسمت آزما کے ہم بھی دیکھیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد ان کے قافلے نے جو دو فوجی ٹرکوں اور ایک جیپ پر مشتمل تھا، صحرائے تھر میں اس علاقے کا رخ کیا جہاں اکبر اعظم کی پیدائش ہوئی تھی اور جس سے ذرا آگے فوجی مشقیں ہو رہی تھیں۔

خوف آسمان پر تنا ہوا تھا، سروں پر Aleoutte ہیلی کاپٹر اڑ رہے تھے اور دور سے ٹھہر ٹھہر کر گولیوں کی آواز آ رہی تھی۔ مشقیں یقیناً بڑے پیمانے کی تھیں، تب ہی Blank کارتوس استعمال کئے جا رہے تھے۔

جیپ ناہموار راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ عذرا نے کچے گھروں اور جھونپڑوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے بعض کی چھتوں پر لمبے بانسوں سے بندھے ہوئے سیاہ پھریرے ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ یہ سیاہ علم اس بات کی علامت تھے کہ ابن سعد ابھی قتل نہیں ہوا ہے، عابد بیمار ابھی مسکرائے نہیں ہیں، سوگ ابھی بڑھا نہیں ہے۔ لوگ ابھی سیاہ

پوش ہیں۔

اس نے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کچھ فصل پر دونوں فوجی ٹرک تھے جن میں لڑکیاں بھری ہوئی تھیں۔ یہ مفتوحہ علاقے کا مالِ غنیمت نہ تھا، لکھنے والیاں تھیں۔ جنہیں شہر شہر سے اکٹھا کیا گیا تھا اور جو اپنے سفر کا آخری دن بسر کر رہی تھیں۔ انہوں نے سیمینار میں لمبی لمبی تقریریں سنیں تھیں، انہیں ہالہ کے رنگین برتن دکھائے گئے تھے۔ بھٹ شاہ لے جایا گیا تھا، وہ امر کوٹ میں پھری تھیں، ضلع کونسلوں میں اعداد و شمار سنائے گئے تھے، گراف دکھائے گئے تھے جن کے خطوط نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتے تھے۔

اپنے اپنے شہروں میں رہتے ہوئے انہوں نے اس سندھ کو دیکھا تھا جو بڑے شہروں کے پنج ستارہ ہوٹلوں میں نظر آتا تھا۔ اونٹوں کی چمکتی ہوئی گھنٹیاں، حسین ترین رنگوں سے کاڑھے جانے والے جیومٹریکل ڈیزائن، رلیاں، رنگین پیڑھیاں، اجرکیں، فیروزی اور طاؤسی رنگ والے کاشی کاری کے برتن اور ٹائیلیں۔

لیکن جو سندھ انہیں دیکھتی آنکھوں نظر آ رہا تھا اس کی بستیوں سے زندگی شیشے کی گرگابیاں پہن کر کبھی نہیں گزری تھی۔ اس کے ڈنگر اور اس کے بچے ایک جوہڑ سے پانی پیتے تھے۔ اس کی عورتیں اٹھنیوں اور روپوں کے لیے مرچوں کے کھیت میں جھکے جھکے دہری ہوگئی تھیں۔ ان کا تارِ نظر سرخ، سبز، اودے، سیاہ اور نیلے صحرائی ٹانکوں کے ساتھ ہی کپڑوں کے ٹکڑوں میں اتر گیا تھا۔ ان کے مردوں کے بدن میں لہو، مٹیالا پانی بن کر رگوں سے گزرتا تھا۔ وہ جھلنگا چارپائیوں پر لیٹ کر آسمان کو تکتے تھے اور جب حریف کا خیال دل کو گرماتا وینی چھڈائن، پنجری، جوتنیی اور بلہاڑ و کھیل کر دل کی تمام حسرتیں نکال لیتے تھے۔ انہوں نے میگھ واڑوں کے گوٹھ اور بہراڑیاں دیکھی تھیں، انہیں ڈھاڈکی میں فریاد کرتے سنا تھا۔ تمام فریادیں بے کار تھیں، داد رسی کرنے والے عرش پر بیٹھے تھے اور ڈھاڈکی، تھری اور لاڑ سے واقف نہ تھے۔

جیپ نے ایک زوردار جھٹکا کھایا اور تہمینہ اپنی نشست سے گرتے گرتے بچی۔

"جوان۔ سنبھل کر چلاؤ۔" کیپٹن رحیم نے کڑوے لہجے میں نائب صوبیدار عیسیٰ

خان کو تنبیہہ کی۔

''یہ بہت خدائی خوار راستہ ہے۔ ٹرک والیوں کا حال تو بہت ہی تباہ ہوگا۔'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں عذرا اور تہمینہ سے مخاطب ہوا۔

''ٹرک والیاں تہمینہ بی بی کو دعائیں دے رہی ہوں گی۔ یہاں آنے کی تجویز انہی کی تھی۔'' پی آر او صاحب اپنی مونچھوں کے سائے میں مسکرائے۔

جیپ جس تنگ راستے سے گزر رہی تھی، اس کے دونوں طرف جھاؤ کے اونچے اونچے پیڑ تھے جن کے کانٹے جیپ کے دونوں پہلوؤں میں چبھ رہے تھے۔

''لیجیے بی بی۔ وہ رہا یادگاری چبوترہ۔'' پی آر او صاحب نے قدرے کھلے ہوئے علاقے کی طرف اشارہ کیا۔ صحرائی پیڑوں اور خاردار پودوں سے گھرا ہوا خاکستری رنگ کا ایک چبوترہ آنے والوں کی راہ دیکھ رہا تھا۔

جیپ سے اتر کر وہ لوگ اس یادگاری چبوترے کے سامنے جا کھڑے ہوئے چار دروں والے چبوترے کے اوپر ایک چھوٹا سا قبہ تھا اور فرش کے عین وسط میں چھوٹا سا پتھر نصب تھا جس پر اکبر کا سنہ پیدائش درج تھا کسی منچلے نے اس یادگاری پتھر پر نشانہ بازی کی تھی، چھروں نے بیشتر حروف اڑا دیئے تھے یا بگاڑ دیئے تھے۔

بے سروسامان ترک نژاد شاہ نے شگون کے طور پر نافہ مشک کے ریزے اپنے وفاداروں میں یہیں تقسیم کئے تھے۔

ہنستی کھلکھلاتی ہوئی لڑکیاں ٹرکوں سے اتر کر چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔ چبوترے سے چند گز کی دوری پر جھاؤ کے پیڑوں کی اوٹ میں دو جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں رہنے والے باتوں کا قہقہوں کا شور سن کر باہر نکل آئے تھے۔ اور ان کی بکریاں بھی ممیاتی ہوئی سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

عذرا کو ''ہمایوں نامے'' کی وہ مغل تصویریں یاد آئیں جن میں اکبر کی پیدائش کا منظر ہے۔ حمیدہ بیگم چند عورتوں کی اوٹ میں لیٹی ہوئی ہے۔، ایک عورت اکبر کو گود میں اٹھائے ہوئے ہے اور پیڑوں کے درمیان تخت بچھا ہوا ہے۔ تخت پر ہمایوں متمکن ہے۔ خدام پشت

پر مورچھل اٹھائے کھڑے ہیں۔ ایک درباری اکبر کی پیدائش کا مژدہ سنا رہا ہے اور کنیزیں رقص کر رہی ہیں۔

سورج مغرب کی طرف اترنے لگا تھا لیکن فضا کی تپش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ تہمینہ نے پیاس کا اظہار کیا تو کیپٹن رحیم کے اشارے پر نائب صوبیدار عیسٰی خان جیپ سے Canteen نکال لایا۔تہمینہ نے دو گھونٹ پی کر Canteen عذرا کی طرف بڑھا دی۔ ایک لمحے کے لیے عذرا کو تہمینہ کے اس دوست کا خیال آیا جس کا وہ نام بھی نہیں جانتی تھی اور جو قلعے میں تھا اور پھر اس نے Canteen تھام لی۔

وقت نے کچھ سے پانی کے دو گھونٹ چھین لیے تھے اور کچھ کو پانی کی تقسیم پر مامور کیا تھا۔

چند صاحب ٹہلتے ہوئے جھونپڑیوں کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ پلٹے تو جھونپڑی والے اپنی چارپائیاں اور دھوپ کھائی رلیاں نکال لائے اور سایہ دار جگہ بچھانے لگے۔ سب ہی تھک گئے تھے اس لیے چند صاحب نے نہ صرف آرام کا انتظام کیا تھا بلکہ آدھ گھنٹے بعد سب کو بکری کے دودھ کی چائے بھی ملنے والی تھی۔

جس کو جہاں جگہ ملی وہیں ٹک گیا۔تہمینہ اور عذرا ایک پیڑ کے نیچے جا بیٹھیں اور ان دو لڑکیوں کو دیکھنے لگیں جو بڑی تندہی سے بکریاں دوہنے میں جٹ گئی تھیں۔

''تمہارا دوست کب سے قلعے میں ہے؟'' عذرا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

''سات مہینے سے۔''

عذرا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ تہمینہ سے اور کیا پوچھے، کیا بات کرے۔تہمینہ نے ریت پر سات کو تیس سے ضرب دیا اور پھر دو سو دس دنوں کو چوبیس سے ضرب دینے لگی۔ چند لمحوں تک عذرا اس کے سبک ہاتھ کی جنبش کو دیکھتی رہی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ریت پر لکھے ہوئے اعداد، ریت میں ملا دیئے۔

''حواس کھو نہ بیٹھنے کے لیے کبھی کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ ضرب، تقسیم، جمع، تفریق

بھلا دی جائے۔ اعداد بھلا دیئے جائیں، دن اور ساعت کا حساب بھلا دیا جائے۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن بعض اوقات میرے ذہن پر سیاہی کی چادر سی تن جاتی ہے۔ اس وقت بھی میری یہی کیفیت ہے۔ اس جیپ میں سفر کر کے، اس Canteen کے پانی سے حلق تر کر کے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے عابد سے غداری کی ہے۔"
"پھر تو سانس لینا، اپنے کمرے سے قدم باہر نکالنا اور لوگوں سے بات کرنا بھی غداری ہے۔"
وہ دونوں اسی طرح باتیں کرتی رہیں، قہقہوں کا اور باتوں کا شور کم ہوتا گیا شاید سب ہی تھک گئے تھے۔ تب اچانک عذرا کی نظر چبوترے کی طرف اٹھی۔
وہاں ایک مورنی اپنے پر سمیٹے کھڑی تھی، پھر جھاڑیوں سے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز آئی اور ایک مور اڑ کر چبوترے پر آ کھڑا ہوا۔ مورنی نے گردن گھما کر اسے دیکھا، جھوم کر دو قدم آگے بڑھی اور اکبر کے سنہ پیدائش پر ٹھونگ مارنے لگی۔ مور نے جھنکار کر ادھر ادھر دیکھا پھر پروں کو پھلا کر جھومتے ہوئے مورنی کے گرد پھرنے لگا۔
عذرا کے لیے اور تمام لڑکیوں کے لیے یہ ایک ناقابل یقین اور یادگار منظر تھا۔ سندھ کے تمام رنگ ان دو پرندوں میں سمٹ آئے تھے۔
"ہائے اللہ، کوئی ان دونوں کو پکڑ لے" اس لڑکی کی آواز آئی جو ہمیشہ بے موقع بولتی تھی، جس کا چہرہ روج کی زیادتی سے ہر وقت سرخ رہتا تھا اور جس کا نام پہلے ہی دن بوگوشہ رکھ دیا گیا تھا۔
"حسن کو کہیں تو آزاد رہنے دو۔ زیادہ ہائے اللہ کرو گی تو دونوں اڑ جائیں گے۔" عذرا نے جھنجھلا کر کہا۔
سب نے ایک دوسرے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک ٹک چبوترے کی طرف دیکھتے رہے۔
مور ٹھمکتا ہوا مورنی کے گرد پھرا لیکن جب توجہ نہ ملی تو حلق سے پیہو کی آواز نکالی، پوٹا پھول گیا، ہفت رنگ پر آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوئے، یوں جیسے سات چمکدار رنگوں کی

پسلیں پرکار میں ایک ساتھ لگا دی گئی ہوں اور پرکار ہفت رنگ نصف دائرہ کھینچتی چلی جائے۔

وہ جو عہد قدیم میں دیوی ہیرا کا خاص پرندہ تھا اور مندروں میں رہتا تھا۔ وہی اپنے پر پھیلا کر چبوترے پر دائیں بائیں چند قدم چلا پھر جھنکارتے ہوئے رقص کرنے لگا۔

ہوا تھم گئی تھی، پیڑ اور پودے ساکت تھے، ہر شخص تصویر بن گیا تھا۔ اوپر نیلا آسمان تھا، نیچے صحرا کی زمین تھی اور ان دونوں کے درمیان دھوپ کا سنہری پن تھا جس میں قوسِ قزح سانس لیتی تھی۔ کائنات کے سب رنگ ان پروں میں سمٹ آئے تھے، جزو کُل میں بدل گئے تھے، لازوال اور دائمی روح کا اشارہ بن گئے تھے۔ پروں پر کھلی ہوئی متعدد آنکھیں انہیں دیکھ رہی تھیں، گھوم گھوم کر جھوم جھوم کر وہ آنکھیں لاجوردی آسمان پر پلک جھپکتے ہوئے تارے بن گئی تھیں۔

مورنی پھریری لے کر اور اپنے پر کھول کر سامنے آئی، آگے بڑھ کر ناچتے ہوئے مور کی چونچ سے چونچ ملائی، ناچتا ہوا مور چند لمحوں کو تھما، ان کی چونچوں نے مل کر دانا پلٹی کی پھر دونوں جھنکارتے ہوئے الگ ہوئے اور رقص کرنے لگے۔

ایرانی قالینوں پر شجرِ حیات کے دائیں اور بائیں کڑھے ہوئے دونوں مور زندہ ہو گئے تھے اور ترک نژاد شہنشاہ کی جائے پیدائش پر اتر آئے تھے۔

اچانک عذرا کو اپنے دائیں جانب کسی حرکت کا احساس ہوا، اس نے پلٹ کر دیکھا اور تڑپ کر ہاتھ بڑھایا لیکن بہت دیر ہو گئی تھی۔ کیپٹن رحیم کے ریوالور نے تولہ بھر سیسہ اگلا اور پندرہ سترہ گز دور چبوترے پر ناچتے ہوئے، جھنکارتے ہوئے مور نے جھونک کھائی، اس کے لاجوردی، سبز اور سنہری پر ہوا میں اڑے اور خون کے چھینٹے اڑاتا ہوا بدن پھڑکنے لگا۔ وہ طاؤس تھا یا تموز تھا؟ یہ طاؤس کا قتل تھا کہ تموز کا؟ تموز جس کی موت خزاں کی علامت تھی۔ جس کا ماتم عشتار کے ساتھ تمام کنواریاں اور تمام کسان کرتے تھے۔

مورنی کے حلق سے ایک تیز چیخ نکلی، وہ پھڑپھڑاتی ہوئی اڑی اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گئی۔

''عیسیٰ خان۔ حلال کرو'' کیپٹن رحیم کی آواز کڑکی۔

''یس سر''۔ نائب صوبیدار عیسیٰ خان لپک کر چبوترے پر چڑھ گیا۔ کھٹکے دار وزیر آبادی چاقو کھول کر عیسیٰ خان نے پھڑکتے ہوئے مور کو بائیں ہاتھ سے پکڑا اور کلمہ پڑھتے ہوئے دائیں ہاتھ سے چاقو گردن پر پھیر دیا۔

مہابلی اکبر کی سلطنت میں اتوار کے دن کوئی جانور ذبح نہیں ہوسکتا تھا اور آج بھی اتوار تھا۔ یہ اکبر کا یوم سبت تھا۔

گولی کی آواز جھونپڑی والوں کو باہر لے آئی تھی۔ لیرلیر کپڑوں میں اپنے ننھے بدن کو چھپائے ہوئے ایک بچی آگے بڑھی۔ اس نے چبوترے کی طرف دیکھا اور زمین پر لوٹ گئی۔

''ھائے منھنجو شاھو۔ بابا منھنجو شاھو۔'' اس کی سیاہ اوڑھنی زمین پر گر گئی۔ چہرہ اور بال خاک میں اٹ گئے۔

سب ساکت تھے۔

تب عذرا آگے بڑھی اور اس بچی کے پاس زمین پر دوزانو ہوگئی۔ اس نے خاک پر پڑی ہوئی سیاہ اوڑھنی اٹھا کر بچی کے سر پر ڈال دی کہ ایام عزا ابھی ختم نہیں ہوئے تھے اور اس کا دھول میں اٹا ہوا سر تھپکنے لگی۔ وہ اس بچی کو کس طرح سمجھاتی کہ پہلے تو یوم سبت ہوتا تھا لیکن اب کوئی یوم۔ یوم سبت نہیں ہے۔

○○

زمیں آگ کی، آسماں آگ کا

چاند مشرق کو جھک گیا۔ گہنائی ہوئی چاندنی نے اپنی ایڑیاں خوشبو کے ہالے میں گھرے ہوئے چمپا، موتیا اور مولسری کے پودوں پر رکھ دیں۔ شبنم سے بھیگے ہوئے آنگن میں ملگجا اندھیرا کسمسایا۔ سہ دری سے لپٹی ہوئی بیل میں ہوا سسکیاں بھرنے لگی۔ آنگن میں بکھرے ہوئے پتھر انہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے، لیکن وہ جانتی تھیں کہ صبح جب وہ سمیٹے جائیں گے تو ان سے ٹوکریاں بھر جائیں گی۔

برسوں پرانی رضائی کو اپنے گرد لپیٹ کر انہوں نے کروٹ لی ...... اور داہنی ٹانگ آرام تکیے پر رکھ دی۔ آنکھوں میں بھی موتیا اتر آیا تھا، تب ہی رخصت ہوتی چاندنی روپہلی افشاں کا دھندلا سا غبار لگ رہی تھی۔ خوشبو کی سواری ہر طرف سے بڑھی چلی آتی تھی۔ اس سگندھ پر ان کی جان جاتی، بس چلتا تو اسے کٹوروں میں بھر کر پیتیں۔

منڈیر پر ٹکی ہوئی دھندلائی سی چاندنی نے انہیں بھولے بسرے مصرعے یاد دلائے۔ فلک نے کئے برہمی کے رسوم چلا ماہ نے کر سیاہ نجوم پڑی اوس، میلی ہوئی چاندنی ...... آدھی صدی پرانی بات ...... خود وہ لگ بھگ پون صدی ٹپ گئی تھیں۔ انہیں جھرجھری سی آئی۔ خوف جب انہیں برستے ہوئے پتھروں اور نرغہ کرتے ہوئے لوگوں سے نہیں آیا تو اب ہول کیوں چڑھ رہا تھا؟

دو راتوں سے ابا میاں آ رہے تھے۔ براق کپڑے اور کلف لگی دوپلی پہنے باغ میں ٹہل رہے ہیں۔ پلٹ کر انہیں دیکھتے ہیں۔ ''شہنشاہ بانو ان دنوں تم بہت یاد آتی ہو۔'' وہ

ان کی آواز سن کر تعظیم کے لئے اٹھنے لگتی ہیں، تو وہ باغ، وہ سماں بھک سے اڑ جاتا ہے جیسے جادوگری ہو۔

''شہنشاہ بانو۔'' انہوں نے اپنا نام زیرِ لب دہرایا۔ کڑواہٹ کی ایک لکیر حلق تک کھنچ گئی۔ ''یہ نام کیوں رکھا تھا، آپ نے مجھ بختوں جلی کا؟'' ان کے اندر ہوک اٹھی۔ نیند جانے کہاں جا سوئی تھی اور نگاہوں تلے گزری ہوئی زندگی کے منظر پھر رہے تھے۔

وہ دلہنوں کی طرح پھولوں کے گجرے سی مہک رہی ہیں۔ چاندی کی رحل پر چکنی مٹی سے لپی ہوئی تختی اور چاندی کی کٹوری میں کھرل کیا ہوا زعفران ہے۔ خوشبو سے ان کی آنکھیں جھکی جاتی ہیں۔ سارا کنبہ اکٹھا ہے۔ خاندان کی لڑکیاں بالیاں کنبے کی اس پہلی لڑکی کو دیکھ رہی ہیں جس کی مکتب ہو رہی ہے۔ ابا میاں ان کے ننھے سے لرزتے ہوئے ہاتھ میں سرکنڈے کا قلم تھماتے ہیں۔ وہ اسے زعفران میں ڈبوتی ہیں۔ دیکھنے والی آنکھوں میں اچنبھا ہے۔ یہ لڑکی پڑھنا ہی نہیں لکھنا بھی سیکھے گی۔ ابا میاں، نئی روشنی کے دلدادہ، تعلیمِ نسواں کے حامی، بیٹی پڑھنے کے قابل ہوئی تو کتابوں سے اس کی الماری بھر دی۔ بیوی نے اگر اتنی دھوم دھڑکا، پٹیک پیا نہ مچائی ہوتی تو وہ شہنشاہ بانو کو انگریزی بھی پڑھواتے۔

زمانہ زن زن کرتا گزر رہا ہے۔ ان کی ہم جولیاں، سہیلیاں، بہنیلیاں، انہیں گھیرے بیٹھی ہیں۔ بڑی بوڑھیوں سے چھپ کر شہنشاہ بانو کی زبانی، داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا سننے میں کیا حلاوت ہے۔ یہ وہ داستانیں ہیں جو مردوں نے مردوں کے لئے لکھیں۔ ان کا ذائقہ نرالا ہے۔ لڑکیوں کو ممانعت ہے ان کے پڑھنے یا سننے کی۔

شہنشاہ بانو اپنی موہنی آواز میں سناتی ہیں ''ملکہ صنعت نے جب دیکھا کہ لشکر میرا آ گیا، وہ خود بھی تخت، اژدھوں پر اپنا کھنچوا کر سوار ہوئی اور شام ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا کہ طبلِ جنگ بجواتی۔ اسی وقت سمتِ لشکر مہرخ چلی اور جب قریب اس فوج کے پہنچی، خنجرئی سحر و قرنائے جنگی اور دہل طبل کا شور، گوشِ ہمایونِ مہرخ میں پہنچا۔ اس عرصے میں طائرانِ سحر نے خبر دی کہ اے ملکہ، فوج دشمن سر پر آ گئی۔ ملکہ مہرخ نے بہت جلد نفیرِ سحر کو دم دیا، ادھر ملکہ صنعت تیغۂ سحر پکڑ کر پانچ لاکھ سے لشکرِ مہرخ پر جا گری۔ اس طرف سے مہرخ بھی

مع فوج بڑھ کر غٹ پٹ ہوگئی۔ اب تو بیئے ابر کے آنے لگے' پیکانِ تیر و مار و عقرب برسانے لگے۔'' سننے والیاں ان عجوبہ باتوں کو ہق دق بیٹھی سنا کرتی ہیں۔ یہ وہ لڑکیاں ہیں جو شکر کے دریا میں صبر کی ناؤ کھیتی ہیں۔ سب بھنورے میں پلی ہوئی۔ زنان خانوں کی اسیر۔ وہاں سے رہائی ملے گی تو قبرستان آباد کریں گی۔ جبکہ طلسم ہوشربا کی دنیا ہی الگ ہے۔ یہاں عورتوں کی عملداری ہے۔ میدان جنگ میں گھوڑے وہ دوڑائیں' تلوار سے' نیزے سے' جادو سے' سحر سے مردوں کو وہ زیر کریں۔ ان کا پشتارہ باندھ کر گھوڑے کی پشت پر ڈال کر انہیں ساتھ لے آئیں۔ عشق کریں' حسد کریں' محفلیں سجائیں' ملکہ برقِ شمشیر زن' ملکہ روشن نگاہ سربلند' ملکہ مشعل نگاہ' ملکہ ذیلم سحر زبردست' ملکہ صنعت سحر ساز' کیسی کیسی شہزادیاں اور جادوگرنیاں ہیں کہ جن کے نام کے کھم گڑے ہوئے ہیں اور جن کی زمین سے آسمان تک فرمانروائی ہے۔

وقت کی نوبت بج رہی ہے۔ مراثیوں کی آوزیں لو دے رہی ہیں۔ بابل تابعدار کھڑے رہیو۔ بیرن ہشیار کھڑے رہیو...... خوشیاں' وسوسے' اندیشے' رسمسا ہٹیں۔ وہ نہیں جانتیں لیکن وقت تو جانتا ہے کہ یہ خانہ آبادی کی نہیں' خانہ بربادی کی تیاریاں ہیں۔ وہ نیہر سے رخصت ہورہی ہیں اور ساری آن تان' راؤ رچاؤ ان سے رخصت ہو رہا ہے۔ وہ جن کی پاپوش میں کرن آفتاب کی لگتی تھی' وہی پاپوش کے برابر بھی نہیں سمجھی جائیں گی۔ ان کے نہانے کے پانی میں عرقِ گلاب ملایا جاتا تھا' اب وہی صبح و شام چھریوں کا غسل کریں گی۔

زندگی کی چاندنی چلچلاتی دھوپ بن گئی تو کتنی ہی مرتبہ ان کا جی چاہا ابا میاں سے سوال کرنے کا ''کیا سمجھتے تھے آپ ابا میاں؟ نام بھی تقدیر بناتے ہیں؟ بھلا کس پر راج کرسکتی تھی میں کہ نام آپ نے شہنشاہ بانو رکھا؟ میں کہاں کی نور جہاں بانو بیگم تھی کہ نام کا سکہ شاہی ٹکسال میں ڈھلتا؟ میں کب ارجمند بانو کا نصیبہ لکھوا کر آئی تھی کہ تاج محل تعمیر ہوتا میرے لئے؟ میں تو ابا میاں گلبدن بانو' زیب النساء بانو بیگم بھی نہ تھی کہ توزک لکھتی' شعر کہتی' اور میری محفلوں میں ایرانی شہزادے بار پاتے۔

''میں ایک عام مسلمان عورت' ناقص العقل' مرد کے پاؤں کی جوتی۔ میں تو پیدا ہی

اس لئے ہوئی تھی کہ ایک مرد سے بیاہی جاؤں‘اس کے اشارۂ ابرو پر زندگی گزاروں۔ زیست میرے لئے ہُو کا مکان ہو اور موت رہائی کا سامان۔ ابا میاں شکوہ اس کا نہیں کہ آپ نے کس کے دامن سے پلّو باندھ دیا تھا۔ شکایت اس کی ہے کہ مجھے پڑھنا لکھنا‘ سوچنا کیوں سکھایا آپ نے؟ گلہ اس کا ہے کہ نام کی شہنشاہی کیوں عطا کی؟‘‘

انہیں جزدان میں لپٹا ہوا ’’بہشتی زیور‘‘ یاد آیا جو اماں نے بڑے چاؤ سے کلام مجید کے ساتھ انہیں جہیز میں دیا تھا۔ ایک صندوق میں ان کی من پسند کتابیں بھی تو ساتھ گئی تھیں۔ طلسم ہوشربا‘ الف لیلہٰ‘ اندر سبھا‘ آرائش محفل‘ عرب کا چاند‘ فلورا فلورانڈا‘ منصور موہنا۔

شادی کے چند ہفتوں بعد جھٹپٹے کا وہ وقت ان کی نگاہوں میں ہمیشہ کھنچا رہا۔ جب ان کے مجازی خدا مصطفیٰ علی خان عرف دلارے میاں نے پہلی مرتبہ ان کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تھی۔ اگلی ساعت اس کتاب کے چار ٹکڑے باہر کی طرف اچھال دیئے گئے۔ پھر کتابوں کا صندوق گھسیٹ کر آنگن تک لے جایا گیا اور آن کی آن میں وہاں کتابوں کی ہولی جلی۔

لقا جادوگرنی بھسم ہوئی۔ منیر شامی اگن بان بنا۔ افراسیاب جادویوں جلا جیسے آتشی قلم‘ شہزادہ دنیازادہ چندر مکھی‘ مہتابی کی طرح راکھ ہوئیں۔ جعفر برمکی‘ ہارون الرشید تارامنڈل ہوئے۔ بغداد کا دربار ’اندر سبھا‘ کے کردار اگن چادر بنے‘ اندھیرے میں چمکے‘ لہرائے اور بجھ گئے۔ زمیں آگ کی آسماں آگ کا‘ جدھر دیکھیے اک سماں آگ کا۔ لفظوں کی چتائیں‘ گھیر ملا غیرت کے شمشان میں چٹختی رہیں‘ جلتی رہیں۔

ابا میاں کے دوست کا بیٹا وکالت پڑھنے والا نئے زمانے کا لڑکا حبس زدہ اور نیم تاریک کمرے کی طرف پلٹا۔ اس کی آواز نے شہنشاہ بانو کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ ’’آج کے بعد ان ہاتھوں میں کوئی چھپا ہوا ورق نظر آیا‘ کسی کاغذ پر انگلیاں لکھتی دکھائی دیں تو قسم ہے ربِ ذوالجلال کی انہیں کچل کر رکھ دوں گا اور بھرتا تمہارے باوا کو پارسل کر دوں گا۔‘‘

شہنشاہ بانو سر جھکائے اپنے مہندی رچے ہاتھوں اور انگلیوں کو دیکھتی رہیں۔ کوئی لازم

تو نہیں کہ ہاتھ کسی تلوار کسی خنجر ہی سے قلم ہوں‘ مجازی خدا کا حکم بھی تو ہاتھ کاٹ دیتا ہے۔ انگلیاں کتر دیتا ہے‘ تب ہی تو آخری سانس تک ابا میاں کو ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حرف دیکھنے کی حسرت رہی۔

وہ جانتی تھیں کہ شام پڑے دلارے میاں نہا دھو کر اور رچ سنور کر کہاں جاتے ہیں۔ رات گئے جب واپس آتے ہیں تو ان کے ہونٹوں پر کس کے ہاتھ سے کھلائی ہوئی گلوریوں کا لاکھا ہوتا ہے اور بدن میں کس کے لباس کی خوشبو۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ دلارے میاں شعر کہتے ہیں۔ مشاعروں میں جاتے ہیں‘ زہر عشق کے اشعار گنگناتے ہیں۔ قصہ گل بکاؤلی پڑھتے ہیں۔ وہ مرد تھے‘ یہ سب کچھ ان کا حق تھا۔ انہوں نے رشتے کی ایک بہن سے عشق کیا تھا‘ لیکن خاندانی جھگڑوں کے سبب اس میں ناکام رہے۔ اس ناکامی کا مداوا انہوں نے لقابائی سے چاہا اور اس ناکامی کا انتقام انہوں نے شہنشاہ بانو سے لیا۔ چار دن کی بیاہی دلہن سے یوں مخاطب ہوتے جیسے باپ مارے کا بیر ہو۔

شادی کو چند مہینے ہی گزرے تھے‘ دلارے میاں حسب معمول اس رات بھی دیر سے آئے۔ یہ پہلی رات تھی جب ان کے انتظار میں جاگتے جاگتے شہنشاہ بانو کی آنکھ لگ گئی تھی۔ کواڑ کھلنے کی آواز کانوں میں پڑی تو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں اور لیمپ کی لو کو اونچا کیا۔ مہکتی ہوئی شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے دلارے میاں کی نگاہ ان کی نیند ماتی آنکھوں پر پڑی تو آگ بگولہ ہو گئے اور شیروانی ایک طرف اچھال کر طاق پر سے ''بہشتی زیور'' اتار لائے۔

''مذہب کے بارے میں خاک بتایا تھا تمہارے باوا نے؟'' دلارے میاں کی سان چڑھی آواز نیم تاریک کمرے میں بجلی کی طرح چمک گئی ''قرآن ختم کر چکی ہے میری بچی‘ تفسیر حدیث سے واقف ہے۔ بیسیوں کتابیں نظر سے گزار چکی ہے۔ بہشتی زیور پڑھ رکھا ہے اس نے۔'' انہوں نے ابا میاں کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے ''بہشتی زیور'' کھول لیا۔

''درمیان میں ابا میاں کو تو نہ لائیے'' شہنشاہ بانو نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں التجا کی۔

''اس پر زبان بھی چلاتی ہو۔ تمہارے ابا میاں ہیں کہ اللہ میاں جن کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا؟ خاک پڑھا اور سمجھا ہے تم نے مسئلے مسائل کو؟ سنو حضرت اشرف علی تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں: ''جہاں تک ممکن ہو سکے میاں کا دل ہاتھ میں لئے رہو اور اس کے آنکھ کے اشارے پر چلا کرو۔ اگر وہ حکم کرے کہ رات بھر ہاتھ باندھے کھڑی رہو۔ تو دنیا اور آخرت کی بھلائی اس میں ہے کہ دنیا کی تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے آخرت کی بھلائی اور سرخروئی حاصل کرو۔ کسی وقت کوئی بات ایسی نہ کرو جو اس کے مزاج کے خلاف ہو۔ اگر وہ دن کو رات بتلا دے تو تم بھی دن کو رات کہنے لگو۔'' دلارے میاں ''بہشتی زیور'' کی عبارت فراٹے سے پڑھتے گئے۔ ''شرع شریف یہ کہتی ہے اور تم میرے انتظار میں جاگنے کی بجائے سو گئیں؟''

شہنشاہ بانو نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ ''پلک جھپکنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔'' انہوں نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں صاحب، گناہ تو مجھ سے ہوا کہ مجھ ناچیز نے شہنشاہ بانو بیگم کو دلی کی ملکہ عالیہ کو چین سے بے چین کیا۔'' دلارے میاں کی آواز کے بچھوؤں کا ڈنک ان کے کانوں میں اتر گیا۔

کیسے قابوچی اور قساوڑے تھے دلارے میاں۔ کوئی گھڑی ایسی نہ تھی جب انہوں نے نیو چے نہ لئے ہوں۔ تکے نہ توڑے ہوں۔ انہیں وہ رات یاد آئی جب دلارے میاں نے بندوق چھتیالی تھی ان پر۔ بڑے والا پانچ سال کا ہو گیا تھا اور منجھلا دو سال کا۔ اس رات منجھلے کو ہلہلا کر بخار چڑھا تھا اور دلارے میاں دستور کے مطابق دیر سے آئے تھے۔

بچے کی حالت دیکھ کر وہ غرائے ''مجھے کیوں نہیں بلوایا تم نے؟ کیا اسے مار ڈالنے کا ارادہ ہے؟''

''کیسے بھیجتی؟ کہاں بھیجتی؟ کیا لقا بائی کے کوٹھے پر؟'' شہنشاہ بانو جن کا کلیجہ شق ہو رہا تھا۔ انہوں نے بچے کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھتے ہوئے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔

لقا بائی کا نام نہیں فلیتہ تھا کہ دلارے میاں توپ کی طرح دغ گئے۔ دیوار سے دو تالی اتار لائے "بھیجا اڑا دوں گا اگر آئندہ یہ نام کبھی زبان پر آیا۔"

اس رات بھی "بہشتی زیور" نکالا گیا اور دلارے میاں نے اس کی عبارت چیخ چیخ کر انہیں سنائی "لکھنؤ میں ایک بی بی کے میاں باہر ہی بازاری عورت کے پاس رہا کرتے تھے۔ گھر میں بالکل نہیں آتے اور طرہ یہ کہ وہ بازاری فرمائشیں کرتی ہے کہ آج پلاؤ پکے اور آج فلانی چیز پکے اور وہ بے چاری دم نہیں مارتی جو کچھ میاں کہلا بھیجتے ہیں روزمرہ برابر کھانا پکا کر بھیج دیتی ہے اور کبھی کچھ سانس نہیں لیتی۔ ساری خلقت اس بی بی کی کیسی واہ واہ کرتی ہے۔ خدا کے یہاں جو اس کو رتبہ ملے گا وہ الگ رہا۔"

پھر کتاب بند کرتے ہوئے دلارے میاں ہونکے تھے "کس رات گھر سے باہر رہا ہوں میں؟ کون سے پلاؤ پکائے ہیں تم نے لقا بائی کے لئے؟ کب خوان سجا کر بھیجے ہیں میری فرمائش پر؟ سنو شہنشاہ بانو' یہ شہنشاہی کا خناس دماغ سے نکال دو۔ عورت کا درجہ اتنا کم تر' اتنا حقیر ہے کہ اس کے وضو اور غسل کے بچے ہوئے پانی سے مرد کو وضو اور غسل کرنا منع آیا ہے۔ ہمیں عورتوں پر شیر کیا گیا ہے' کیا سمجھیں تم؟"

وہ پہلی رات تھی جب انہیں یقین ہو گیا کہ عورتوں کی نجات کا کوئی نسخہ آسمان سے زمین پر نہیں اتارا گیا ہے۔ تمام کتابیں' تمام تحریریں' تمام اقوال اس لئے ہیں کہ مردوں کو اس سے آگاہ کیا جائے کہ وہ دنیا میں ہی عورتوں کو کس طرح جہنم کے ساتویں طبقے میں رکھ سکتے ہیں۔

اس رات ان کے اندر ایک انجانی' ایک ان ہوئی عورت چھپ کر بیٹھ گئی۔ نماز پڑھتے میں وہ عورت ان کے دل پر دستک دینے لگتی۔ سوال اٹھانے لگتی۔ کوئی خدا ہم عورتوں کا بھی ہے؟ ہمیں بھی کسی نے اپنی مخلوق جانا ہے؟ وہ عورت جب ان سوالوں کو دہراتی تو وہ دل ہی دل میں جلدی سے لاحول پڑھتیں اور انکا سجدہ طول سے طویل تر ہو جاتا۔ جاء نماز آنسوؤں سے بھیگ جاتی' لیکن اس عورت کی آواز آنا بند نہ ہوتی۔ وہ تو جیسے ان کے اندر مستقل آباد ہو گئی تھی۔

انہوں نے ابا میاں کی لاج کی قربان گاہ پر صبح و شام چھریوں کا غسل کیا اور اف نہ کی۔ شام زندگی اور شب زندگی کا پُرسہ انہوں نے کسی سے نہ مانگا۔ انہیں میکے جانے کی اجازت نہ تھی۔ میکے پر ہی کیا منحصر تھا۔ ان کیلئے تو ہر جگہ کا جانا موقوف تھا۔ حضرت مولانا کا کہنا تھا کہ عورتوں کو اپنے گھر سے نکلنا اور کہیں آنا جانا' بہ وجوہ بہت سی خرابیوں کے' کسی طرح درست نہیں۔ انہوں نے ضمیمۂ ثانی بہشتی زیور حصہ ہفتم میں فرمایا تھا کہ بیاہ شادی موئذن' چلہ' چھٹی' ختنہ' منگنی' چوتھی وغیرہ میں کہیں مت جاؤ' نہ اپنے یہاں کسی کو بلاؤ۔

اماں کی سناؤنی آئی تو وہ رام پور میں بیٹھی اپنے مجازی خدا کی دوسرے شہر سے واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم نہیں نکالا جاسکتا تھا۔ دلارے میاں میرٹھ سے گھر واپس آئے تو اماں کے تیجے کو دو دن گزر چکے تھے۔

چچا جان نے ابا میاں کی رخصت کی خبر بھجوائی تو دلارے میاں گھر میں تھے۔ شہنشاہ بانو گنگ صم بیٹھی رہیں۔ غالب کا شعر ان کے اندر بھنور ڈالتا رہا۔ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور' تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور' دلارے میاں نے دلّی جانے والی ٹرین کے وقت کی بات کی تو انہوں نے نگاہ اٹھا کر اپنے خداوند کو دیکھا۔ ابا میاں ان کا چہرہ تو درکنار' ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط کو دیکھنے کی آرزو میں ختم ہو گئے تھے۔ "جب ان کی بیماری میں نہ جا سکی تو اب کیا جانا' میرے پہنچنے سے پہلے ہی انہیں مٹی دی جا چکی ہوگی۔" انہوں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا:

"کیوں مکان' دکان' سامان یہ سب اپنے عم اور عم زادوں کو بخش دینے کا ارادہ ہے؟"

دلارے میاں نے چتون اٹھا کر پوچھا "اپنا حق چھوڑنا بھلا کس شرع میں آیا ہے؟"

یہ شخص آدمی تھا یا قصائی؟ قصائی بھی ذبح کرنے سے پہلے جانور کو پانی تو پلا ہی دیتا ہے۔ ابا میاں کا پرسہ تو دور کی بات تھی' اس شخص نے ان کے دفن سے پہلے ہی شرعی حق کا بہی کھاتا کھول لیا تھا۔

وہ زہریلے انداز میں مسکرائیں "ہاں' واقعی بھلا شرعی حق کیسے چھوڑا جاسکتا ہے۔"

"باپ کی موت پر ہنستے ہوئے تم ہی کو دیکھا۔" دلارے میاں ان کے جملے کے نشتر

سے بلبلاتے ہوئے اور اپنی دانست میں جوابی وار کرتے ہوئے مردان خانے کو چلے گئے۔

یادوں کی باڑھ سے شہنشاہ بانو کا منہ تک جگر آنے لگا۔ انہوں نے بجھتی ہوئی آنکھوں سے آنگن کی طرف دیکھا۔ چاند کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ ہر طرف منجھیلی اور ڈراؤنی رات تھی۔ انہوں نے عبور دریائے شور کے بارے میں پڑھا تھا۔ جانتی تھیں کہ کتنے ہی لوگوں نے کالا پانی کاٹا ہے' لیکن ان کے لئے تو گھیر ملا غیرت ہی کالا پانی ہو گیا تھا۔ کیسی کیسی کٹھنائیاں نہیں جھیلی تھیں انہوں نے۔ ان پر کلی دار پاجامہ یا تن زیب کا کرتا جیسے کپڑے پہننے پر پابندی تھی۔ خوشبو جس کی وہ بچپن سے عاشق زار تھیں' اسے لگانے کی مناہی تھی۔ وہ عطر کو ترستیں' لانبی آستینوں کا نیچا اور موٹے کپڑے کا کرتا پہنتیں۔ موٹی ململ کا دوپٹہ اوڑھتیں۔ سہاگن ہونے کی علامت بس یہ تھی کہ کپڑے رنگین ہوتے تھے ورنہ سچ تو یہ تھا کہ رنڈاپا ان پر ٹوکروں برستا۔

ادھر بٹوارے کی ہوا چلی' ادھر ان کے سسر کا انتقال ہوا۔ چند مہینوں بعد ساس بھی چل بسیں۔ شہنشاہ بانو نے چین کا سانس لیا۔ شاید اب ان کے دن پھر جائیں۔ گھر میں دلارے میاں جب نہ ہوں گے تب وہ اپنی سی کر سکیں گی۔ لیکن سکھ کا ان سے اللہ مارے کا بیر تھا۔ اماں کی چھ ماہی کے بعد ایک دن گھر میں بم چلا کہ دلارے میاں نے دوسری شادی کر لی۔

شہنشاہ بانو کو اپنی زندگی بچہ سقہ سے بھی گئی گزری لگی۔ چند دنوں بعد نئی دلہن بھی گھر میں آ گئیں' ان کے آنے سے پہلے بڑا انتظام و انصرام ہوا۔ کوٹھے پر دو نئے کمرے بنے۔ گھر بھر میں پتائی ہوئی۔ مماؤں' اصیلوں نے بتایا کہ یہ بھی دلی والی ہیں۔ بیوہ ہیں۔ پہلے سے چار سال کا ایک بیٹا بھی ہے۔ میاں کی کسی جائیداد کے مقدمے کی بابت دلارے میاں وکیل سے جان پہچان ہوئی اور پھر وہ جان کا ٹکڑا ہو گئیں۔ راہ کا روڑا اماں باوا کی ذات تھی۔ سو اب دونوں ہی نہیں رہے تو کاہے کی شرم اور کس کا خوف۔

نئی دلہن گھر آئیں تو شہنشاہ بانو جن کی شہنشاہی اپنے کمرے سے باورچی خانے تک تھی۔ معزول ہوئیں اور گھر کا کل بندوبست نئی دلہن کے حوالے ہوا جنہیں دلارے میاں نے "رونق دلہن" کا خطاب دیا تھا۔ وہ دلارے میاں جو ان کے حق میں ہمیشہ آگ کا پتلا

رہے' رونق دلہن کو کیسی میٹھی نظر سے دیکھتے۔ مٹھائی کے دونے' پھولوں کے گہنے' عطر' تیل پھلیل' مسّی' کاجل کیا تھا جس کی رونق دلہن کو کمی تھی۔ شروع میں رونق دلہن ان سے کھنچی رہیں' پر جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ نام نہاد زنگی' کافور کی طرح بس نام کی شہنشاہ ہیں تو ان کی تیوریوں کے بل کھلنے لگے۔ فاتح' سدا مفتوح کو رحم کی نظر سے دیکھتا ہے۔ رونق دلہن بھی ان پر ترس کھاتیں۔ دل میں خوف خدا تھا' اس لئے کوشش کرتیں کہ دلارے میاں کی زیادتیوں کا کچھ ازالہ کر سکیں۔ وہ اگر ان سے سوکناپا برتتیں تو شاید شہنشاہ بانو کو اتنی اذیت نہ ہوتی۔

تینوں بیٹے بڑے ہوئے' تو ان میں سے دو شادیاں کر کے پاکستان اڑ گئے۔ تیسرا شاہجہاں پور میں اپنی ملازمت پر رہتا۔ شادی اس کی بھی ہو چکی تھی اور وہ بیوی کو ساتھ رکھتا۔ گھر میں رونق دلہن کے بچے بڑے ہو رہے تھے' وہ انہیں بڑی اماں کہتے۔ ان کا جی بھی بچوں سے ہل مل گیا تھا۔ رونق دلہن کے پہلے شوہر کا بیٹا شکیل ان کے آگے پیچھے پھرتا۔

شہنشاہ بانو کو وہ دوپہر یاد آئی جب دلارے میاں جائیداد کا مقدمہ ہار کر تنتناتے ہوئے ان کے کمرے میں آئے تھے۔ ابا میاں کی موت کے بعد یہ مقدمہ انہوں نے شہنشاہ بانو کے دونوں چچا زاد بھائیوں کے خلاف کیا تھا۔ ابا میاں زندگی میں ہی ایک مکان اپنے بھتیجوں کے نام کر گئے تھے' لیکن دلارے میاں کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ ان کے سالوں کی جعل سازی ہے۔ وہ لڑتے رہے' سیشن کورٹ' ہائیکورٹ اور اب سپریم کورٹ سے بھی مقدمہ خارج ہو گیا تھا اور فیصلہ ان کے سالوں کے حق میں برقرار رہا تھا۔ وہ انہیں بے نقط سناتے رہے اور 55 برس کی شہنشاہ بانو کلیجے پر صبر کی سل رکھے اپنے ان بھائیوں کے بارے میں سنتی رہیں جنہیں انہوں نے چالیس برس سے نہیں دیکھا تھا۔ دلارے میاں کے قول کے مطابق وہ سب نامحرم تھے۔ شرع ان سے ملنا تو کجا انہیں دیکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔

ابا میاں ان کے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے تھے' لیکن ایک دھیلا بھی ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ دلارے میاں نے وہ ہاتھا چھانٹی دکھائی کہ دکان' مکان' روپے پیسے سب ہی ڈکار

گئے۔ رقم اور جائیداد تو دور کی بات تھی، دلارے میاں نے تو بیٹوں کی شادی کے موقع پر ان کے بری اور جہیز کے زیور تک نہ چھوڑے تھے اور سب کچھ بہوؤں کو چڑھاوے میں دلوا دیا تھا۔ ان باتوں کی یاد سے ان کے کلیجے پر گھونسہ لگا۔ بھائیوں کی برائیاں سنتے سنتے تھک گئیں تو چیخ کر بولیں "بس صاحب اب چپ رہیں"۔

"کیوں چپ ہو جاؤں؟ تمہارا شرعی حق مارا گیا ہے۔ اہل ہنود کی حکومت ہے، جو چاہتی ہے سو وہ کرتی ہے۔ نہ اسلامی قاعدوں پر عمل ہوتا ہے، نہ قانون پر۔" دلارے میاں گرجے۔ بٹوارے کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ چھوٹے موٹے نیم سیاسی رہنما بن بیٹھے تھے۔ مسلم پرسنل لاء اور مسلمانوں کی شناخت کے بارے میں ان کے بیانات ضلع کے اردو اخبارات میں اکثر چھپتے تھے۔

"ابا میاں یہ مکان اپنی زندگی میں بھتیجوں کے نام کر گئے تھے۔ موت کے بعد جو کچھ تھا وہ سب آپ نے سمیٹا، تو پھر میرا شرعی حق کیسے مارا گیا؟" شہنشاہ نے تنک کر پوچھا۔

بیوی کا جملہ دلارے میاں کو گولی کی طرح لگا "گدی سے زبان کھینچ لوں گا اگر اب آواز سنائی دی۔ اُن مردودوں کے لئے کلیجہ پھٹ رہا ہے جبکہ میرے ہزاروں اس مقدمے میں خاک ہو گئے۔ غلطی میری ہے کہ تمہارے باپ کی زندگی میں ہر چیز کی لکھا پڑھی نہیں کرائی۔ مرتے مرتے بھی ہاتھ دکھا گیا پاجی کہیں کا۔" دلارے میاں ہونکے۔

شہنشاہ بانو کو محسوس ہوا کہ جیسے قلعے پر چڑھی ہوئی ہزار توپیں ایک ساتھ دغ گئی ہوں۔ شریف و نجیب ابا میاں، مرحوم و مغفور ابا میاں جن کی ہڈیوں کو بھی چونا لگ چکا تھا، ان کے لئے یہ لفظ؟ ان کا جگر شق ہو گیا۔ چالیس برس انہوں نے ابا میاں کی لاج رکھنے کے لئے زبان نہیں کھولی تھی، اف نہیں کیا تھا۔

"ہوش کے ناخن لو مصطفیٰ علی خان...... معلوم ہے کہ کیا کہہ رہے ہو اور کسے کہہ رہے ہو؟" شہنشاہ بانو نے سر اٹھا کر اپنے مجازی خدا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور زندگی میں پہلی مرتبہ ان کی آواز کمرے سے نکل کر آنگن تک پھیل گئی۔

یہ گستاخانہ انداز تخاطب دلارے میاں کے لئے نیا تھا۔ ان کی تو عقل چرخ ہو گئی،

''ہاں ہاں..... تمہارے باپ کو کہہ رہا ہوں۔'' ان کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

شہنشاہ بانو کی کنپٹیاں تڑخنے لگیں۔ برسوں کی سوئی ہوئی آگ جاگنے لگی۔ ''اب تمہاری شرع کہاں گئی کہ میرے مرحوم باپ کے بارے میں ناروا کہتے ہو اور یہ بھی یاد نہیں رکھتے کہ ان کا نمک کھایا ہے تم نے۔''

دلارے میاں کے سینے پر کسی نے دونالی بندوق خالی کر دی ''تمہارے باپ کا نمک اور میں؟'' وہ چیخے۔

''ہاں! میرے باپ کا نمک اور تم..... ان کی جائیداد ان کی رقم' یہ سب کچھ کس کی گرہ میں گیا؟ کس نے عیاشیاں کیں ان روپوں سے؟'' شہنشاہ بانو چالیس برس کا حساب گھنٹہ گھڑی میں چکانے پر تلی ہوئی تھیں۔

''مرنے کے بعد ان کی ہر چیز تمہاری تھی۔'' دلارے میاں نے سامنے رکھی ہوئی تپائی کو ٹھوکر ماری اور وہ دور جا گری۔

''تو پھر تم میرے نمک خوار ہوئے' اس لئے سنبھل کر بولو میرے باپ کے بارے میں'' شہنشاہ بانو کے کانوں نے اپنے کہے ہوئے جملے کو سنا اور انہیں یقین نہ آیا کہ یہ جملہ ان ہی کی زبان سے نکلا ہے۔

دلارے میاں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ عورت' پاؤں کی جوتی' ناقص العقل' مرد سے کمتر جس کے چھوڑے ہوئے پانی سے وضو جائز نہیں..... وہی عورت انہیں اپنا نمک خوار کہہ رہی تھی۔ ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ چند لمحوں تک وہ بت بنے کھڑے رہے' پھر انہوں نے انگارے اگلتی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا جس کے وہ مجازی خدا تھے۔

''شہنشاہ بانو اس لمحے کو تم ہمیشہ روؤ گی۔'' انہوں نے قہرناک لہجے میں کہا اور باہر نکل گئے۔

وہ پتھرائی ہوئی بیٹھی رہیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ان ہی کی آواز تھی جو اونچی ہوئی تھی۔ یہ وہی تھیں جس نے اپنے سرتاج کو اپنے نمک کا طعنہ دیا تھا۔ وہ خالی الذہن بیٹھی رہیں اور چالیس برس سرسراتے ہوئے ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہے۔

اس روز جھٹپٹے سے پہلے گھر میں کہرام مچ گیا۔ شہنشاہ بانو دالان میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں، جب دلارے میاں تیز تیز قدموں سے انہیں اپنے کمرے میں جاتے دکھائی دیئے۔ چند لمحوں بعد وہ ان کے کپڑوں کا بکس گھسیٹتے ہوئے باہر نکلے۔ ''اٹھاؤ اپنا سامان اور نکل جاؤ اس گھر سے۔'' وہ گرجے۔

شہنشاہ بانو نے چائے کا پیالہ پلنگ کی پٹی پر رکھ کر انہیں حیرت سے دیکھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں ''کہاں جاؤں؟''

''میری طرف سے جہنم میں۔''

دلارے میاں کے چیخنے کی آواز سن کر رونق دلہن باورچی خانے سے نکل آئیں۔ اسی وقت شہنشاہ بانو کا مرادآبادی پاندان اڑتا ہوا آیا اور صحن میں کتھا' چونا' کتری ہوئی چھالیہ' زعفرانی زردہ سب ہی کچھ بکھر گیا۔

''ارے اپنے حواسوں پر سے صدقہ دیجئے' یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

رونق دلہن تیز تیز قدموں سے میاں کی طرف بڑھیں۔

''خاموش رہو بیگم...... میں ایک لفظ نہ سنوں اس قطامہ کی حمایت میں۔'' دلارے میاں ہنکارے۔

''ہے ہے...... کیا واہی تباہی نکال رہے ہیں منہ سے۔'' رونق دلہن میاں کے منہ سے شہنشاہ بانو کے لئے گالی سن کر بلبلا گئیں۔

سارے بچے سہمے کھڑے رہے۔ ماما بھی باورچی خانے سے نکل آئی۔ رونق دلہن نے میاں کی منتیں کیں' خدا رسول کے واسطے دیئے لیکن دلارے میاں کو ایک ہی رٹ تھی کہ اب یہ نافرمان اور پاجی عورت یہاں نہیں رہے گی۔

اس شام کی یاد سے شہنشاہ بانو کی بوڑھی ہڈیوں کو کپکپی چڑھنے لگی۔ اس روز آسمان ان کا نہ تھا' زمین ان کی نہ تھی۔ جب وہ دروازے کی طرف دو قدم چلیں اور تیورا کر گرنے لگیں تو یہ رونق دلہن کے پہلے میاں کا بیٹا شکیل تھا جس نے لپک کر انہیں کولی میں بھر لیا تھا۔

''حوصلہ رکھیے بڑی اماں' میں آپ کو لے کر جاؤں گا' بڑے بھیا کے پاس شاہجہاں

پور میں آپ کو لے کر جاؤں گا۔'' آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ اندھیرے نے انہیں نگل لیا تھا۔

وہ شام غریباں ایسی شام ۔۔۔۔ وہ لٹی اور جلی ہوئی شام جب انہیں گود میں اٹھا کر شکیل نے چادر لگے رکشے میں بٹھایا۔ جست کا ایک بکس' دری میں لپٹا ہوا تکیہ' ایک لوٹا' ایک صراحی اور مرادآبادی پاندان جس کا ڈھکنا پھینکے جانے سے ٹوٹ گیا تھا۔ یہ تھی ان کی کل کائنات ۔۔۔۔ ان کی آنکھوں میں وہ جہیز گھوم گیا جسے چالیس برس پہلے وہ مصطفیٰ علی خان کے گھر لے کر آئی تھیں اور جس سے ان کا گھر بھر گیا تھا۔

چمٹا بجا اور نیم تاریک گلی میں مدن فقیر کی آواز کی روشنی پھیل گئی۔ اللہ میرے ہمیں نہ دل سے بھول۔ مولا میرے' ہمیں نہ دل سے بھول۔ اللہ میرے' مولا میرے' ان کی ہچکی بندھ گئی۔ مولا اپنے دل سے کیوں بھلا دیا تو نے؟ کیوں بھلا دیا؟ آج جمعرات تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ آج اس در سے مدن فقیر کو ایک کٹورا آٹا اور ایک آنہ ملے گا' لیکن اس در سے وہ تو خالی ہاتھ ہی لوٹا دی گئی تھیں۔

ہوا سے ہٹ جانے والی چادر کے کونے سے گھیر ملا غیرت کا وہ دروازہ انہیں دکھائی دیا جس کا ایک پٹ نیم وا تھا۔ میونسپلٹی کے کھمبے سے جھولتے ہوئے بلب کی زرد روشنی میں رونق دلہن نیم رخ نظر آئیں۔ ان کا سر چوکھٹ سے ٹکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ ان کے روئیں روئیں سے رونق دلہن کے لئے دعا نکلی۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے چپکے سے ان کی ہتھیلی میں دو سو روپے رکھ کر مٹھی بند کر دی تھی۔ یہ ان کا بیٹا شکیل تھا جس نے سوتیلے باپ کی گالیاں اور لاتیں کھائی تھیں پر زبان سے اف نہیں کی تھی اور لٹلے بھر کے لئے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا

سوکن کی سسکیوں اور مدن فقیر کی آواز کے سائے میں وہ گلی سے رخصت ہوئیں تو انہیں اپنی پہلی رخصت یاد آئی۔ مراثنوں کی آواز لو دے رہی ہے۔ بابل تابعدار کھڑے رہیو۔ بیرن ہشیار کھڑے رہیو۔ ڈولی کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا' نہ بابل' نہ بابل کا دیس۔

اس چوکھٹ کے چھوٹنے کے بعد سے کیسے کیسے انقلاب آئے زندگی میں۔ وہ برسوں سے بڑے بیٹے کے گھر میں تھیں۔ وہ بیٹے جو پاکستان میں تھے انہوں نے کبھی پلٹ کر خبر ہی نہیں لی تھی۔ کچھ دنوں انہوں نے ان دونوں کا غم منایا پھر یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ ترک وطن کرنے والے اپنے خون سے رشتوں کی خوشبو نچوڑ کر اپنے پیچھے ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ ساتھ لے جائیں تو یادوں اور یادگاریوں سے کلیجہ نہ شق ہو جائے۔ شاہجہاں پور والے کا دم غنیمت تھا کہ اس نے روتے جھینکتے ان کا بڑھاپا گزروا دیا۔ اس کی بہو بھی بری نہ تھی۔ ہاں برسوں کی مقدمے بازیوں سے تنگ تھی۔

بیٹے کی مناہی کے باوجود انہوں نے دلّی سے اپنے ان بھائیوں کو بلوایا تھا جن کی صورتیں انہوں نے چالیس برس سے نہیں دیکھی تھیں۔ مہینوں مشورے کئے تھے ان سے اور آخر کار نان نفقے کا مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ وہ مقدمہ ڈیڑھ برس چلا۔ ابھی اس مقدمے کا فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا کہ انہیں دلارے میاں کا پہلا اور آخری خط ملا۔ سفید کاغذ کے دائیں جانب سبز رنگ کی روشنائی سے مصطفیٰ علی خان کا نام چھپا ہوا تھا۔ اس خط میں مسماۃ شہنشاہ بانو کو اطلاع دی گئی تھی کہ انہیں تین طلاقیں دے دی گئی ہیں اور اس طور وہ مصطفیٰ علی خان کی زوجیت سے خارج ہو گئی ہیں۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ حق مہر جو تین ہزار سکہ رائج الوقت ہے، عدالت میں جمع کروا دیا گیا ہے اور اس کی ادائیگی کے بعد اب ان کا نہ کوئی حق ہے، نہ کوئی دین۔

باسٹھ برس کی عمر میں طلاق وصول کرنے کے بعد شہنشاہ بانو کی زندگی کا واحد مقصد مصطفیٰ علی خاں عرف دلارے میاں سے اپنا حق وصول کرنا ہو گیا۔

عدالتی کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا گیا۔ ایک مجسٹریٹ نے مصطفیٰ علی خاں کو حکم دیا کہ وہ گزارہ الاؤنس کے طور پر 25 روپے کی ''خطیر رقم'' شہنشاہ بانو کو ماہانہ ادا کریں۔ دو سال...... چار سال...... پانچ سال، بات کھنچتے کھنچتے سپریم کورٹ تک پہنچی۔ یہاں تک کہ وہاں سے تاحیات 179 روپے 20 پیسے ماہانہ کی ادائیگی کا حکم ہوا۔

مصطفیٰ علی خاں نے سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف اپیل کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ عدت کی مدت گزر جانے کے بعد شریعت کی رو سے مطلقہ عورت نان نفقے کی حقدار نہیں رہتی۔ ادھر ہندوستانی قانون تھا کہ جس کے مطابق کوئی بھی ہندوستانی عورت دوسری شادی کے نہ کرنے تک اس کی حقدار ٹھہرتی تھی۔

شہنشاہ بانو کوزور کی جھرجھری آئی۔ وہ قانونی جنگ جو ان کے اور دلارے میاں کے درمیان برسوں چلی وہ اپنے اختتام کو پہنچتے پہنچتے کفر واسلام کی جنگ میں بدل گئی۔ ایک طرف ان کا بوڑھا اور تنہا وجود تھا اور دوسری طرف کروڑوں مجاہد — حقارت' نفرت' ذلت ... ایک جہنم تھا جس میں وہ جلائی جا رہی تھیں۔ دو دو بالشت کے دس بیس لونڈے سکھا پڑھا کر ان کی گلی میں بھیج دیئے جاتے اور وہ ان کے دروازے کے سامنے کھڑے نعرے لگاتے رہتے۔

بیٹے کے گھر کی دیوار فتوؤں کے پوسٹروں سے کالی ہو چکی تھی۔ بیٹا بہو مقدمے بازی اور اس سے ملنے والی ذلت سے عاجز آ چکے تھے۔ علمائے دین اور مفتیانِ متین سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہزار ہا مسجدوں سے ان پر سب وشتم کرتے ''برادران اسلام — یہ دینی حمیت کا معاملہ ہے — ایک ملحد و بے دین بڑھیا نے غیرت اسلامی کو للکارا ہے۔''

بیٹے کے گھر آنے کے بعد ان کا واحد مشغلہ' کتابیں' رسالے اور اخبار پڑھنا تھا۔ یہ نعمت ان کے لئے چالیس برس منع رہی تھی۔ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی عینک ناک پر جما کر ''ندائے مسلمان'' اور ''صدائے اسلام'' جیسے اخباروں کو پڑھتیں۔ یہ اخبار انہیں بتاتے تھے کہ وہ بے دین ہو گئی ہیں۔ مشرکوں کے ہاتھوں بک گئی ہیں۔ دین کی دشمن ہیں۔ یہ سب کچھ پڑھ کر ان کی آنکھوں سے خون کی دھاریں بہنے لگتیں۔ پھر ان کے خلاف جلوس نکلنے لگے۔ پانچ ہزار' دس ہزار' پچاس ہزار سے لے کر لاکھ' قوم تھی کہ اندی چلی آ رہی تھی۔ ستر برس کی ایک بے کس و بے بس بڑھیا کے سبب اسلام خطرے میں تھا۔

ان پر دباؤ ڈالا جانے لگا۔ وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں۔ عدالت کو اپنا فیصلہ واپس لینے کی درخواست دیں۔ جیتی ہوئی جنگ ہار جائیں۔ وہ ڈٹی رہیں۔ نہ اپنے لئے اور

نہ ان چند روپوں کے لئے جو عدالت عظمیٰ نے انہیں دلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ لڑ رہی تھیں تمام مسلمان عورتوں اور مسلمان لڑکیوں کے لئے۔ ہندوستان کے نادار مسلمان گھرانے عربوں کی حرم سرا بن گئے تھے۔ سال کے سال وہ گاڑیاں بدلتے اور بیویاں بھی...... اپنی اندھی دھندلی آنکھوں سے انہوں نے کتنی ہی خبریں ان مظلوم لڑکیوں کی پڑھی تھیں جو حیدرآباد' پونا' بمبئی اور دلی میں چند ہزار کے مہر کے عوض چند دنوں یا چند ہفتوں کے لئے عرب شیوخ کی دلہن بنتیں اور پھر ہاتھ میں طلاق نامہ اور گود میں نوزائیدہ بچے اٹھائے بازاروں میں بیٹھتیں۔ مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی۔ پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی...... یہ نظم انہوں نے ریڈیو سے سنی تھی۔ ان خبروں کو پڑھ کر انہیں یہ نظم یاد آتی۔ وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں اسے گنگناتیں اور زار زار روتیں۔ پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی...... مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی۔

چند ہزار روپوں کے مہر کے عوض نت نئی لڑکیوں کو تصرف میں لانے والے' ایسی کوئی نظیر کیسے گوارا کرتے۔ کل کلاں ان کی طلاق یافتہ بیویوں نے ان سے نان نفقے کا مطالبہ شروع کر دیا تب؟ نکاح کرنا اور طلاق دینا ان کا مذہبی حق تھا اور اس حق میں کسی قسم کی دراندازی سے دین پر آنچ آتی تھی۔ سو دین کی حفاظت کے لئے ان کی داد و دہش منبر و مسجد پر ہوئی اور قلم و قرطاس پر بھی۔ نہ خریدنے والوں کی کمی تھی اور نہ بکنے والوں کی۔ تحریریں' تقریریں' فتویٰ بازیاں' دشنام طرازیاں' اسلام خطرے میں ہے برادران اسلام...... اسلام خطرے میں ہے۔

دباؤ بڑھتا گیا...... فتوے فروشوں کا' قوم کا' بیٹے اور بہو کا اور پھر اب سے چند گھنٹوں پہلے ہزاروں فرزندان توحید کا ایک جم غفیر بعد نماز جمعہ ان کے محلے میں داخل ہوا۔ لوگ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے ان کی اپنی گلی اور آس پاس کی گلیوں میں بھر گئے۔ ناگاہ فوجِ شام سے تیر ستم چلے۔ گھر کے دروازے پر' دیواروں پر پتھر برس رہے تھے' آنگن میں گر رہے تھے۔ سہ دری میں ان کی نماز کی چوکی تک آ رہے تھے' پھر دروازہ چولوں پر سے ہلایا جانے لگا۔

بیٹے نے بے بسی سے ان کی اور پھر کمرے کی دہلیز پر کھڑی ایک دوسرے سے لپٹی اور لرزتی ہوئی اپنی دونوں بیٹیوں کو دیکھا "اماں کیا اینٹ سے اینٹ بجوائیں گی اس گھر کی۔"

"مر جائیں گے کٹ جائیں گے...... دین کے نام پر مٹ جائیں گے......"

دیواریں آوازوں سے لرز رہی تھیں۔ وہ سہ دری میں نماز کی چوکی پر بیٹھی تھیں۔ وقتِ عصر آ پہنچا تھا۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان ان کا نہ تھا' انہوں نے زمین کی طرف دیکھا' زمین ان کی نہ تھی۔ وہ رب العالمین کے حضور سجدے میں گر گئیں۔

"مر جائیں گے' کٹ جائیں گے۔" آواز کے تیز' تلواریں' بلّم اور برچھیاں ان کے ٹکڑے کر رہی تھیں۔ فتوؤں کے سم انہیں روند رہے تھے۔ پامال کر رہے تھے۔ آنسو رام پوری جائے نماز کی بوسیدہ مخمل میں جذب ہو رہے تھے۔ کچھ مدد کہ رنج و الم بے شمار ہیں' میں اک نحیف و زار ہوں' دشمن ہزار ہیں۔ سنگ باری میں اضافہ ہو گیا' دروازے پر شور بڑھ گیا۔

وہ سجدے میں تھیں' جب انہوں نے اپنی بڑی پوتی کی چیخ سنی۔ "یہ ہماری بوٹیاں اڑا دیں گے دادی اماں۔" اس آواز میں جان کے سوا عزت کا خوف تھا۔ یہ ان کی پوتی کی نہیں' ازلی اور ابدی عورت کی چیخ تھی۔ عورت' زمانے کے ہر لشکر کا مالِ غنیمت...... لیکن یہ تو اپنے تھے۔ تاریخ کے صفحوں سے واقعۂ حرّہ نے سر اٹھایا اور ان کی چھلکتی ہوئی آنکھوں میں غروب ہو گیا۔

انہوں نے لرز کر سجدے سے سر اٹھا لیا۔ "دروازہ کھول دو...... جو لوگ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں انہیں میرے پاس لے آؤ۔" انہوں نے اپنی شال کا بکل مارتے ہوئے کہا۔ سیاہ موہیر کا حاشیہ ان کی مغل پیشانی پر جھک گیا' ان کے سفید ابروؤں کو چومنے لگا۔

دروازہ کھلا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنگن ربّ المسلمین کے ماننے والوں سے بھر گیا۔ ان کے گرد کیسے کیسے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کا ہجوم تھا۔ سیاہ اچکنیں' عطر سے مہکتی ہوئی وسمہ لگی داڑھیاں' آنکھوں میں سرمے کا حاشیہ' سروں پر رام پوری ٹوپیاں' چنی ہوئی

دو پلیاں' انہوں نے ایک نظر اس سبزی مائل کاغذ پر ڈالی جس پر ان کے دستخط کفر و اسلام کی اس جنگ کے خاتمے کا اعلان کرنے والے تھے جس نے سارے ملک کو بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کی رو سے وہ ان مومنین کے سامنے اپنے اس حق سے دستبردار ہو رہی تھیں جو مشرکین پر مشتمل عدالت عظمیٰ نے انہیں دلایا تھا۔

امیرِ شریعت مولانا صبغت اللہ شاہ نعمانی نے اپنی اچکن کی جیب سے پارکر کا قلم نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اپنی بیوی کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ گزشتہ نو برس سے اس کی بیوی پائی پائی کو محتاج تیرے میرے در پر پڑی تھی اور اس کا نان نفقے کا مقدمہ بھی عدالت میں گھسٹ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف بڑھنے والے اس صحت مند ہاتھ کو نظر انداز کر کے پوتے کو دیکھا جو اپنے ننھے ہاتھوں سے ان کا شانہ تھامے کھڑا تھا جس کی انگلیوں کی کپکپاہٹ ان کی ہڈیوں تک اُتر رہی تھی

''بٹیا طاق پر سے کجلوٹی تو اتارنا۔''

کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں' لیکن اتنی دیر میں پوتا' طاق سے کجلوٹی اتار لایا تھا۔ انہوں نے کجلوٹی کھول کر اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر کالک لگائی تو بیٹا لپک کر آگے بڑھا۔

''اماں آپ انگوٹھا کیوں لگا رہی ہیں؟ دستخط کیجئے نا!''

''دستخط کرنا مشرکوں کی عورتوں کو زیب دیتا ہے بیٹا۔ ہماری عورتوں کو تو انگوٹھا ہی لگانا چاہئے۔'' انہوں نے کہا اور کالک سے بھرا ہوا انگوٹھا کاغذ پر رکھ دیا۔ سبز رنگ پر سیاہ داغ ابھر کر آیا۔

امیر شریعت نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لیا' کھڑے ہوئے' ہجوم سے چھلکتے ہوئے آنگن کی طرف رخ کیا' ہاتھ بلند کر کے اس کاغذ کو لہرایا اور با آواز بلند ''شکر الحمد اللہ'' کہا۔ ساری فضا ''اللہ اکبر'' کی تکرار سے گونج گئی اور اس کے ساتھ ہی لشکر کی واپسی شروع ہو گئی۔

آنگن جو کچھ گھنٹوں پہلے میدانِ جنگ کا سماں پیش کر رہا تھا' اب وہاں نہ آدم تھا اور

نہ آدم زاد لیکن پتھر ابھی تک ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان پر نرغہ کرنے والوں کی آوازوں کی ابابیلیں ان پر جھپٹ رہی ہیں۔ دیواروں پر اپنے پر مار رہی ہیں۔

منڈیر پر ٹکی ہوئی چاندنی کا دم اکھڑنے لگا۔ ہر طرف پو پھٹنے کی خوشبو تھی۔ تم جیت گئے مصطفیٰ علی خاں۔ تمہاری قوم نے میرے نام کو گالی بنا دیا۔ میرے وہ سجدے جو آنسوؤں سے تر تھے' میرے وہ روزے جو رمضان کے روزوں کے سوا تھے' میرے وہ نوافل جنہیں ادا کرتے ہوئے میرے گھٹنے اور ٹخنے سوج جاتے تھے' کسی نے انہیں نہ دیکھا اور میں دین کی دشمن قرار پائی۔ کافر کہی گئی۔ مجھے سنگسار کرنے کے مطالبے کئے گئے اور تم جو بالا خانوں پر جاتے رہے' اپنی راتیں آباد کرتے رہے' تم دودھ سے دھلے ہوئے مانے گئے' لیڈر بنے' دین کے حامی و ناصر کہلائے' خادم قرار پائے' میں آگ کی بڑھیا سمجھتی تھی کہ جب غیروں نے میرے ساتھ عدل کیا ہے تو بھلا اپنے کیوں، ناانصافی کریں گے' لیکن جیتنا تو تم ہی کو تھا۔ تمہارے لوگ جو اپنی مٹتی ہوئی زبان کے لئے کبھی پانچ سو لوگ اکٹھا نہ کر پائے' انہوں نے مجھ بے بس و بے کس عورت کو کس کس طرح غارت غول نہیں کیا' کتنے بکھان نہیں بکھیرے۔ ہائے مجھ ایک پردہ دار بڑھیا کے لئے لاکھوں دین داروں کی فوج' کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں...... ہمارا نہیں۔

خنکی ان کی ہڈیوں کو چھیدنے لگی۔ انہوں نے اپنا کانپتا ہوا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے انگوٹھے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ہلکے سبز رنگ کاغذ پر اپنے انگوٹھے کا سیاہ نشان ان کی آنکھوں میں لہرایا۔ مصطفیٰ علی خان یہ کلنک تو تم سب مل کر اپنے خون سے بھی نہیں دھو سکو گے۔

دشنام کی ابابیلیں انہیں کنکریاں مار رہی تھیں' فتوؤں کے پتھر انہیں لہولہان کر رہے تھے۔ وہ بھاگ رہی تھیں' ہانپ رہی تھیں۔ گر رہی تھیں' سنبھل رہی تھیں۔ چھری کے تلے دم بھی مارا نہیں' کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں۔

''ابا میاں۔'' وہ گلوگیر آواز میں پکاریں ''آپ زندہ ہوتے تو کس طرف ہوتے ابا میاں؟ قوم کی یا میری طرف؟'' پھر وہ آواز سے رونے لگیں۔ درد دل میں بھنور ڈال

رہا تھا۔ چھری کے تلے دم بھی مارا نہیں۔ انہوں نے برسوں پرانی رضائی میں گرمی کی رمق ڈھونڈنے کی کوشش کی' لیکن اس کی تو اب روئی بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ کر کونوں میں اکٹھی ہوگئی تھی۔

تکئے سے سر اٹھا کر انہوں نے مرتی ہوئی چاندنی کو دیکھنا چاہا تو اپنی گردن انہیں من بھر کی لگی۔ ابا میاں نے سرہانے سے انہیں آواز دی۔ انہوں نے سنبھل کر تعظیم کے لئے اٹھنا چاہا لیکن بدن میں دم کہاں رہا تھا۔ کیا سنبھلے جس پہ ظلم کا یوں آسماں گرے۔ ابا میاں نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھیں' پھر انہیں یاد آیا۔ ابا میاں سے انہیں کچھ پوچھنا تھا۔ ان کے ہونٹوں نے جنبش کی "اس جنگ میں آپ کس کے ساتھ تھے ابا میاں؟" آس بھری نظروں نے ابا میاں کو دیکھا۔

ابا میاں کا سر جھک گیا۔ زمین سے آسمان تک خاموشی کھنچ گئی۔ ابا میاں کا سکوت حرملہ کے تیر کی طرح ان میں ترازو ہوگیا۔ وہ لڑکھڑا کر گریں۔ آگ زمین سے اگ رہی تھی' انگارے آسمان سے برس رہے تھے۔ شہرزاد' دنیا زاد' ملکہ ذیلم زبردست' نور جہاں بانو بیگم' گلبدن بانو' خاک کی پتلیاں بہتی ہوئی آگ میں گھل رہی تھیں۔ زمیں آگ کی آسماں آگ کا' جدھر دیکھیے اک سماں آگ کا۔ تن جھلس رہا تھا' پیاس امڈی چلی آ رہی تھی۔ یا رب العالمین' یا رب العالمین۔ اینٹھی ہوئی زبان اور سوکھے ہوئے ہونٹوں نے اپنے رب کو پکارا۔ دو گھونٹ' صرف دو گھونٹ' ہر طرف سراب' گرداب ہی گرداب اور وہ ماہیٔ بے آب' نیر ڈھلنے لگے۔ تب چمپا' موتیا اور مولسری سکھیوں نے خوشبو کٹورے ان کے ہونٹوں سے لگا دیئے۔ ہر طرف سگندھ تھی۔ سیرابی تھی۔ آنکھیں خوشبو تھیں' حواس خوشبو تھے۔ بدن خوشبو تھا' ہر سو راحت تھی۔ ہر طرف آرام تھا۔ صبح ہوئی آرام کیا۔ نیند کا سکھ پال آ پہنچا۔ انہوں نے اس میں سوار ہونے کے لئے قدم بڑھایا۔ ان کی سنگی سہیلی رائے بیل نے ان کی رخصت دیکھی اور درد سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

OC

یکے بود، یکے نہ بود

دریا اوراس کے حاشیے پر پھیلی ہوئی ہریالی پیچھے رہ گئی ہے۔ سورج کی ترچھی کرنوں نے ببول کی بھاگتی ہوئی جھاڑیوں کے سائے لمبے کر دیئے ہیں۔ سڑک کے دائیں اور بائیں خاک کے چھوٹے بڑے ٹیلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہوا کے ساتھ چک پھیریاں کھاتے ہوئے ذرّے فراٹے بھرتی گاڑی کے بند شیشوں پر دستک دے رہے ہیں۔ یہ جو کبھی گل تریا کسی سیم برکی صورت زندہ ہوں گے، کل جانے کب اور کہاں نمو پذیر ہوں۔ کسی کے نازک لبوں کی تراش میں، کسی کے سرِ پُر غرور کی بناوٹ میں۔ میرے برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے حسن حمیدی گنگنا رہے ہیں۔ میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا۔ میں بھی کبھو کسو کا۔

میری نگاہوں میں برسوں پہلے کا ایک سفر زندہ ہو جاتا ہے۔ سب سے آگے آرنلڈ کی سیاہ لیموزین تھی، اس کے بعد ریڈ کراس کی ایمبولینس، ہماری لینڈ روور سب سے پیچھے تھی، جس کی عقبی نشست پر شاہ پور تھا اور میں...... اس کا سیاہ زیتون ایسے گچھوں سے سجا ہوا سر گاڑی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ چہرے پر ویرانی تھی۔ ہمارے اندر سناٹا تھا اور خاموش رہنے کی خواہش تھی۔ پھر اچانک اس نے سورج کی آخری کرنوں کی رخصت کے بعد سرمئی رنگ اختیار کر لینے والے خاک کے تودوں سے اٹے ہوئے اس میدان کو دیکھ کر کہا تھا: "آدم کو بنانے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی؟"

میرا جی چاہا تھا کہ اس کا دھیان بٹانے کے لئے آدم پر اور تخلیق کی کہانی پر اس سے گفتگو کروں، لیکن اس لمحے زندگی پر بات کرنے کی ہمت بھلا کہاں تھی...... ہاں یہ ضرور ہوا

تھا کہ میری نگاہوں میں ایک بھولی بسری تحریر جاگنے لگی تھی کہ جب بھیجا خدا نے جبرئیل کو زمین پر کہ لائے ایک مٹھی خاک کی کہ جس سے بناؤں میں اپنا نائب..... تب زمین نے کی آہ زاری سامنے جبرئیل کے اور کہا نہ توڑ اے جبرئیل یہ ستم مجھ پر' سو ہوا موم وہ یہ گریہ و زاری سن کر' بھیجا پھر خدا نے اسرائیل اور میکائیل کو' پر آئے یہ دونوں بھی زمین کے کہے میں اور گئے عالم بالا کو واپس بغیر مشتِ خاک کے' تب دیا انجام یہ کام عزرئیل نے اور پہنچائی ایک مٹھی خاک' حضور اپنے رب کے..... رکھی گئی پھر وہ مشتِ خاک مابین طائف و مکہ اور برسی جب اس پر بارش تو خاک گل ہوئی وہ دو برس میں اور چوتھے برس میں صلاب' فخار چھٹے برس میں اور آدم کی صورت اس نے اختیار کی آٹھویں برس میں۔

تو کیا ہم سب اسی مشتِ خاک کا پھیلاؤ تھے؟ یا پھر حقیقت بگ بینگ میں' کروڑوں برسوں میں اور اس کائی میں تھی جس سے زندگی وجود میں آئی تھی؟

کہانیوں کا ایک طومار تھا اور انسانوں کی نسلیں تھیں جو کہانیوں میں پناہ ڈھونڈتی تھیں۔ اسی لمحے ایمبولینس کے ڈرائیور نے ہیڈ لائٹ جلائی تھی اور گاڑی کی چھت پر لگا ہوا سرخ بلب روشن کر دیا تھا۔ رات کی پہلی چاپ سے قدم ملا کر موت کا اگیا بیتال سر پر جلتی ہوئی سرخ ہانڈی اٹھائے ویرانے میں دوڑنے لگا تھا۔

اس راستے پر کیا جانے والا گزشتہ اور موجودہ سفر گڈمڈ ہونے لگتا ہے۔ نام اور چہرے ایک دوسرے میں گم ہونے لگتے ہیں۔ میں خاک کے بھاگتے ہوئے تودوں پر نظر ڈالتی ہوں اور شاہ پور کا چہرہ میری نگاہوں میں طلوع ہوتا ہے۔

میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو اس کے گہرے سیاہ بالوں پر گرد کی ہلکی سی تہہ تھی' سر چاک پر جھکا ہوا تھا اور ہاتھ خداوندی کر رہے تھے۔ انگلیاں گندھی ہوئی مٹی کو زندگی دے رہی تھیں..... اس لمحے مجھے حسن کوزہ گر یاد آیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ حسن کوزہ گر نہیں' کسی جہاں زاد کے لئے اس نے بغداد و حلب و دمشق کی تنگ گلیوں کی خاک نہیں چھانی تھی اور ابھی وہ زمانے کے چاک سے بھی واقف نہ تھا' جس پہ مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انسان..... انسانوں کے بننے بگڑنے کی کہانیاں سمجھنے کی اس کی

عمر ہی نہ تھی..... تب ہی وہ سب سے بے نیاز اور خود میں مگن تھا۔ میں نے اسے دیکھا تھا اور چلتے چلتے ٹھٹک گئی تھی نہیں میں نے غلط کہا' میں اس کے ہاتھوں کے لوچ اور چاک پر اس کی انگلیوں کے رقص کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ گلی ہماری تمام پسماندہ بستیوں اور محلوں کی گلیوں جیسی گندی' تنگ و تاریک اور اوبڑ کھابڑ تھی۔ ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی اور ایک دوسرے کو کہنی مارتی ہوئی۔ کمر خمیدہ اور سیلن زدہ عمارتوں نے سہ پہر کے شفاف آسمان کو تقریباً نگل لیا تھا۔ ہر جانب لاغر اور ننگے بچوں' چیختی چلاتی عورتوں' سیاہ رو اور نیم برہنہ مردوں کا' مٹی اور غلاظت کے انبار کا راج تھا۔ ہر طرف مفلسی کی بو تھی۔ جگہ جگہ گدھے کھڑے تھے۔ ٹاٹ کے جھول میں مٹی کا بوجھ اٹھائے۔

دکانوں کے طاقچوں میں مٹی کی صراحیاں' گلاس' رکابیاں' چلم' کوزے اور آرائشی ظروف تھے۔ اس ساز و سامان کے سائے میں چاک گڑے تھے اور ان کے دور پر برتن ڈولے جا رہے تھے۔ تغاریوں میں کمائی ہوئی مٹی تھی۔ اندر بھٹیاں دہک رہی تھیں اور ان میں برتن پک رہے تھے یا پکائے جانے کے منتظر تھے..... نوجوانوں کی طرح جو زندگی کی بھٹی میں پکنے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔

آرنلڈ اور میں' ہم دونوں اس گلی میں ایک عجوبہ تھے۔ گندگی کے انبار سے بچتے ہوئے اور بھنبھناتی ہوئی مکھیوں سے الجھتے ہوئے ہم ان گنت نگاہوں کے حصار میں تھے۔ ہمارے اردگرد بچے اور فقیر تھے۔ ساب ایک چونی ..... میم ساب ایک چونی۔

چلتے چلتے میری نظر اس پر پڑی اور میں ٹھٹھک گئی۔ اس کی عمر شاید پندرہ یا سولہ سال ہوگی۔ بال سیاہ زیتون کے رنگ کے تھے اور بدن جیسے بلور کا بنا ہوا یا شاید سیل کھری میں چٹکی بھر سیندور ڈال کر اس کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ نہانے کی توفیق جانے کب سے اسے نہیں ہوئی تھی۔ تب ہی ہاتھوں اور ننگے پیروں پر میل کی تہیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

اسی کی طرح اس کی دکان کا سامان بھی منفرد اور خوش نما تھا۔ پشت پر بنے ہوئے طاقچے میں دودھیا سفید روغن والے پیالے' گلدان' آرائشی صراحیاں' رکابیاں اور مرتبان

رکھے تھے جن پر کاسنی، شنجرفی، زمردیں اور زعفرانی رنگوں کے بیل بوٹے تھے۔ طاقچے میں مردوں اور عورتوں کے سر تھے۔ تیکھے خدوخال والے ان چہروں کے نقوش بہت مہارت سے ابھارے گئے تھے۔ بالوں کی لٹیں، رخسار کا ابھار، ہونٹوں کا خم، ان چہروں پر گندھارا میں کھدائی سے برآمد ہونے والے سروں کی خفیف سی شباہت تھی۔ وہی آ یائی خطوط، وہی کھنچی ہوئی نیم خوابیدہ، نیم بیدار آنکھیں۔

اس کے دائیں ہاتھ میں کمائی ہوئی مٹی کی ایک لوئی تھی اور بایاں ہاتھ چکیت کو گردش دے رہا تھا۔ زمانہ گردش میں تھا اور چاک کی گردش پر صراحی کی گردن ڈھل رہی تھی۔ پھر اس لڑکے نے چاک کی رفتار دھیمی کی، پیر کے پاس رکھا ہوا موٹے دھاگے کا گولہ اٹھایا۔ مڑوڑی دیئے ہوئے دھاگے کے گولے کو اپنے پیر سے پکڑا، ایک ہاتھ سے دھاگے کو تانا، اسے گھومتے ہوئے چاک کے قریب لایا اور پلک جھپکتے میں صراحی کی گردن چاک پر لگی ہوئی فاضل مٹی سے علیحدہ ہوچکی تھی۔ مجھے خیال آیا بادشاہوں کے جلادوں کے تیغے بھی اسی صفائی سے گردن تراشتے ہونگے۔ کوئین میری آف اسکاٹ۔ میری این بولین۔ میری انتونیت۔ کھٹ۔ کھٹ۔ گلوٹن گر رہی ہے۔ تن سے گردن جدا ہو رہی ہے۔ چاک اب رُک چکا تھا۔ اس نے صراحی کی گردن کو شیشہ گروں کی سی احتیاط کے ساتھ چاک سے اتارا اور ایک طرف رکھ دیا۔ بدن سے جوڑ دیئے جانے کے لئے۔

آرنلڈ بھی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، پھر آگے بڑھ کر دکان کے تھڑے سے ٹک گیا۔ اس نے لڑکے کو متوجہ کرنے کے لئے سیٹی بجائی لیکن وہ اپنے کام میں مگن رہا۔ تب اس کے قریب بیٹھی ہوئی بڑھیا نے لڑکے کو آواز دی۔ اس نے چونک کر بڑھیا کو دیکھا، پھر بڑھیا کے اشارے پر اس کا سیاہ زیتون کے گچھوں سے بھرا ہوا سر اور سیل کھری اور سیندور کی چٹکی سے بنا ہوا چہرہ ہماری طرف گھوم گیا۔ اس کی آنکھیں گہری بھوری تھیں۔ ناک کا بانسہ اونچا اٹھا ہوا تھا۔ نازک، حساس اور ابھرے ہوئے پُر از نخوت نتھنے شاید مشقت کے سبب پھڑک رہے تھے۔

''تم بہت اچھا کام کرتے ہو'' میں نے اسے داد دی۔

وہ مسکرایا ''میرے بزرگ بھی یہی کرتے تھے۔''

اس کے چہرے اور اس کی رنگ کی طرح اس کا لہجہ بھی اس گلی میں رہنے والوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوال کلبلانے لگے۔ آرنلڈ اچک کر دکان میں چڑھ چکا تھا اور طاقچے میں سجی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

بڑھیا کے اشارے پر سامنے کے ملباری ہوٹل سے ٹین کی دو زنگ آلود کرسیاں آ چکی تھیں اور ایک میلے کپڑے سے صاف کر کے دکان میں بچھائی جا چکی تھیں۔ ہم دونوں ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت چینک والا آ پہنچا جس نے نیلے رنگ کی تام چینی کی چینک سے فنجانوں میں چائے انڈیل کر ہماری طرف بڑھائی اور پھر رک کر دلچسپی سے آرنلڈ کو دیکھنے لگا۔ دکان کے سامنے بھی کئی بچے اور عورتیں اکٹھا ہو چکے تھے۔

بے حد میٹھی چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے میں لڑکے اور بڑھیا سے باتیں کرتی رہی اور آرنلڈ ہم تینوں کو دیکھتا رہا۔ لڑکے کا نام شاہ پور تھا اور وہ قزوین کا رہنے والا تھا۔ ماں باپ کی واحد اولاد۔ باپ اپنے شہر کا مانا ہوا کوزہ گر۔ ہم چار برس کی عمر میں اپنے بچوں کی مکتب کرتے ہیں۔ اس نے چار برس کے بیٹے کو چاک پر بٹھا دیا تھا۔ شاہ پور بارہ برس کا تھا تو ماں رخصت ہوئی۔ دو برس بعد باپ بھی چل بسا۔ شاہ پور نے ماں اور باپ کے تعاقب کی کوشش کی' لیکن جب اس میں ناکام رہا تو ایک رشتہ دار کی دکان پر کوزے بنانے لگا۔ اس کا ایک چچا کراچی میں تھا۔ کسی کی زبانی اسے بھائی کی موت اور بھتیجے کی خودکشی میں ناکامی کا علم ہوا تو خون نے جوش مارا اور اس نے کسی دوست کی مدد سے بھتیجے کو کراچی بلا بھیجا۔

شاہ پور چچا کے گھر پہنچا تو اس نے جانا کہ خون کا جوش اپنی جگہ' لیکن حقیقت یہ ہے کہ چچا نے اسے اپنی بیکری پر بٹھانے کے لئے بلایا ہے۔ شاہ پور کی انگلیوں کو نوٹ گننے' بسکٹ تولنے' کیک کاٹنے اور مرتبان سے بچوں کے لئے ٹافیاں نکالنے کی عادت نہ تھی۔ اس کی انگلیوں کا چاک سے' گندھی ہوئی اور کمائی ہوئی مٹی سے' موقلم' مسالوں اور رنگوں سے رشتہ تھا۔ وہ گیلی مٹی کو زندگی کی شباہتیں اور حسن کی تابانی بخش سکتا تھا' لیکن چبائے جانے

والے توالوں کو روزی کمانے کا ذریعہ نہیں بنا سکتا تھا۔

اس نے چچا کو اپنا مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی تو چچا نے یتیم و بیسر بھتیجے کو ڈانٹا' زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی۔ کوزہ گری کا دور گزر چکا تھا۔ مشین' انسانی انگلیوں کی ہنر کاری کی جگہ لے چکی تھی۔ لمحہ بھر میں چیخ جانے والی مٹی کی روغنی رکابیوں اور پیالوں کی جگہ پلاسٹک اور اسٹیل کی طشتریاں اور ڈونگے استعمال ہو رہے تھے جو سستے تھے اور برسوں چلتے تھے۔ کوزہ گر ساری دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور چند رہ گئے تھے' وہ بھی اس لئے تھے کہ انہیں کوئی اور کام کرنا نہیں آتا تھا۔

یہ تمام باتیں شاہ پور بھی سمجھتا تھا لیکن وہ اپنی انگلیوں کے سامنے بے بس تھا۔ وہ خمیر کی ہوئی مٹی کے لوچ کو محسوس کرنا چاہتی تھیں۔ موقلم تھام کر برتن کی چکنی سطح پر نقش و نگار بنانا چاہتی تھیں' انہیں تار کے ٹکڑے سے کسی پیالے کے کناروں پر کنگوریاں کاٹنے کی خواہش تھی۔

چچا کو عزیز از جان بھتیجے کی نافرمانی پسند نہ آئی' چنانچہ گوشمالی کو اس نے اپنا فرض جانا۔ ادھر یہ گوشمالی بھتیجے کو گوارا نہ ہوئی اور وہ بیکری کی صندوقچی سے کچھ روپے نکال کر فرار ہو گیا اور شہر میں کوزہ گروں اور چرخ کو ڈھونڈتا پھرا۔ یہ تو اسے کئی دنوں بعد معلوم ہوا کہ یہاں کوزہ گر ''کمہار'' کہلاتے ہیں اور چرخ کو ''چاک'' کہا جاتا ہے۔

اب وہ ایک ایسے کمہار گھرانے کا فرد تھا جس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بوڑھا اور بڑھیا دونوں لشتم پشتم زندگی گزار رہے تھے' لیکن شاہ پور نے ان کی زندگی بدل دی تھی۔ وہ ایرانی تھا اور ایران کوزہ گری کے لئے صدیوں سے مشہور ہے۔ اس کے باپ نے اسے ظروف کو رنگنے کے لئے مسالہ تیار کرنے اور روغن کرنے کے قدیمی خاندانی نسخے سکھا دیئے تھے۔ نقاشی میں بھی باپ ہی اس کا استاد تھا اور اسی لئے شاہ پور کے بنائے ہوئے برتن اور فرمے پر ڈھالے ہوئے سر سب سے الگ سب سے منفرد تھے۔

آرنلڈ نے شاہ پور کی بنائی ہوئی کئی چیزیں منتخب کیں اور پھر کچھ کہے یا پوچھے بغیر ان کی قیمت سے کہیں زیادہ روپے دیئے۔ اس گلی میں پھر ہم اور آگے نہ گئے۔ وہیں سے اس

گاڑی کی طرف پلٹ گئے جس پر ڈپلومیٹک کور کی زرد رنگ والی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

آرنلڈ فورڈ فاؤنڈیشن کا ڈائریکٹر تھا اور چند مہینوں پہلے کراچی آیا تھا۔ کوزہ گری سے اسے عشق تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے اپنے گھر کے ایک کمرے کو دکانِ کوزہ گر میں بدل دیا۔ بیوی بچوں کا روگ اس نے نہیں پالا تھا۔ لوگ خاندان ہمراہ لاتے ہیں' وہ اپنا چاک اور بھٹی امریکہ سے لایا تھا۔ پاکستانی اسٹاف نے اس کے اس شوق کو حقارت کی نظر سے دیکھا تھا اور ''نرا کمہار ہے سالا'' کہہ کر اس کے بارے میں تحقیق وتفتیش کا باب بند کر دیا تھا۔ بیشتر لوگوں کو مایوسی اس بات سے بھی ہوئی تھی کہ سفارت کاری کے حوالے سے ہونے والی دعوتوں میں شرکت کے علاوہ اسے محفل سجانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شام کو دربار لگانے کی بجائے وہ تنہا پیتا تھا۔ پیر چاک کے پیڈل کو حرکت دے رہے ہیں' دونوں ہاتھ صراحی کی گردن بنا رہے ہیں' پیالے کو خم دے رہے ہیں۔ اسی دوران لمحے بھر کو تھم کر وہ سفید اور نیلگوں چینی چڑھے مٹی کے کاشانی پیالے سے ایک گھونٹ وہسکی کا لیتا اور پھر چاک پر جھک جاتا۔ یہ پیالہ اس نے ''سوتھ بی'' سے نیلام میں خریدا تھا۔ نوادرات کی اس عالمی شہرت یافتہ دکان کی کیٹلاگ کے مطابق یہ ایک صفوی شہزادے کا پیالہ تھا۔

''سوچو تو سہی اس پیالے سے اس نے خود پیا ہوگا' اپنی محبوباؤں کو پلایا ہوگا۔ کس کس کے لبوں نے چھوا ہوگا اس پیالے کو' پیالے کی تاریخ بتاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو زندگی حال میں کرتے ہیں اور جن کا ذہن مسرت ماضی سے کشید کرتا ہے۔ کراچی پہنچنے کے فوراً ہی بعد اس نے دفتر میں کئی لوگوں سے خواہش ظاہر کی تھی کمہاروں سے ملنے کی اور ان کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھنے کی' آخرکار آرنلڈ کو کمہار واڑے لے جانے کی ذمہ داری میری ٹھہری تھی اور یوں ہم دونوں شاہ پور تک پہنچے تھے۔

ہم شاہ پور سے ملنے کئی مرتبہ اس گلی میں گئے اور ہر مرتبہ یہ احساس مجھے شدت سے ہوا کہ آرنلڈ کی اس میں دلچسپی حد سے بڑھ رہی ہے۔ پھر ایک روز وہ شاہ پور کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لایا۔ شاہ پور نے کوزہ گری کا اتنا قیمتی اور جدید سامان بھلا کب اور کہاں دیکھا تھا۔ اس ساز وسامان کو دیکھ کر وہ دیوانہ سا ہو گیا۔ اس روز جب میں شاہ پور کو کمہار

واڑے چھوڑنے گئی تو راستے بھر وہ کوزہ گری کے اس تام جھام کے قصیدے پڑھتا گیا۔

''خانم اگر یہ سب کچھ میرے باپ کے پاس ہوتا تو سارا ایران اسے جانتا۔ وہ ہمارا سب سے بڑا کوزہ گر ہوتا۔''

''اور اگر یہ سب کچھ تمہارے پاس ہو؟''

''خانم' میں سوتے میں خواب نہیں دیکھتا تو پھر جاگتے میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

مہینے اسی طرح گزرتے رہے۔ ایک روز لنچ سے کچھ پہلے آرنلڈ میرے کمرے میں آ گیا۔

''تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ شاید بات کہنے سے پہلے اسے تول رہا تھا۔ آخر کار اس نے دل کی بات میرے سامنے رکھ دی۔ وہ شاہ پور کو اڈاپٹ کرنا چاہتا تھا۔

''لیکن آرنلڈ .....''

اس نے مجھے بات مکمل نہ کرنے دی ''میں لیکن اور اگر یا مگر کا قائل نہیں ..... فرض کرو کہ میں نے شادی کی ہوتی اور میرا کوئی بیٹا بھی ہوتا' لیکن لازم تو نہیں کہ اسے بھی کوزہ گری کا شوق ہوتا۔ شاہ پور کو بیٹا بنا کر میں اپنے سارے شوق پورے کر سکتا ہوں۔ تم یقین کرو وہ گندھی ہوئی مٹی پر جادو کر دیتا ہے۔ اس گندی گلی میں اس کا فن ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ میں چند مہینے اسے اپنے پاس رکھوں گا پھر سیرا کیوز بھیج دوں گا۔ وہاں امریکن سرامک سوسائٹی ہے۔ سرامک انسٹیٹیوٹ ہیں۔ میں خود سوسائٹی کا ممبر ہوں۔ چند برسوں میں وہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔''

میں آرنلڈ کو دیکھتی رہی' وہ جو کچھ کہہ رہا تھا' سچ کہہ رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی ''کمال ہے' کچھ خواب دیکھے نہیں جاتے اور پھر بھی پورے ہو جاتے ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟''

میں مسکرا دی'' تم سمجھو گے بھی نہیں...... '' اور میرے کانوں میں شاہ پور کی وہ ٹھنڈی سانس گونج گئی جو اس نے آرنلڈ کا ساز و سامان دیکھ کر کمہار واڑے جاتے ہوئے بھری تھی۔

یہ بات میں نے شاہ پور کو بتائی تو پہلے اسے یقین نہ آیا۔ وہ خوشی سے رقص کرنے لگا اور پھر چاک کے پاس نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ کمہلا گیا تھا اور وہ اس بوڑھی کمہارن کی پیٹھ کو تک رہا تھا جو مجھے دیکھ کر چائے لینے کے لئے ملباری کے ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔

''اماں کیا کرے گی ...... بابا کیا کہے گا ...... ؟ شاہ پور نے بے بسی سے کہا۔

میں نے اسے دلاسہ دیا۔ بڑائی کے سفر کا آغاز رشتوں کے باب میں کسی ایسی ہی کشمکش سے ہوتا ہے جو اولین لمحوں میں بہت اذیت ناک ہوتی ہے لیکن کچھ دنوں بعد یاد بھی نہیں رہتی۔

کمہار واڑے کے بانجھ جوڑے سے اس بارے میں بات کرنا میرے لئے سزا تھی اور ان کے لئے قیامت۔ زندگی بس کچھ دنوں کے لئے ان پر مہربان ہوئی تھی۔ جب مہربان ہوئی تھی تب بھی انہیں یقین نہیں آیا تھا اور جب نا مہربان ہوئی تو یہ بھی ان کے لئے نا قابل یقین بات تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ زندگی میں نا قابل یقین باتیں ہی ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

کئی دنوں بعد شاہ پور جب چند جوڑے کپڑے بغل میں داب کر ہمارے ساتھ چلا تو گلی کے بچے، مرد اور عورتیں اس کے پیچھے تھے۔ اس کا قصہ الف لیلہ کے ابوالحسن سے مختلف نہ تھا۔ وہ چاک کو گردش دے رہا تھا کہ سات سمندر پار سے آنے والے ایک شخص کی نگاہوں نے اس کے سر پر ہما بٹھا دیا تھا۔ یہ خواب کی باتیں تھیں اور اب اس گلی میں رہنے والے ایسے ہی خوابوں کے سہارے اپنی بہت سی بے آرام راتیں آرام سے گزارنے والے تھے۔ اللہ نے جیسے شاہ پور کے دن پھیرے تھے ویسے ہی ان کی اولادوں کے دن

بھی پھیر سکتا تھا۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

بوڑھی کمہارن اور اس کا شوہر آنسو بہاتے ہوئے ساتھ تھے۔ وہ گاڑی تک ہمارے ساتھ آئے پھر وہ تینوں بیقرار ہو کر یوں ایک دوسرے سے لپٹے جیسے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ میں نے آرنلڈ کو دیکھا جو ان معصوم لوگوں کہ زندگیاں تہ و بالا کر کے لاتعلقی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ خالص مغربی لاتعلقی' جیسے اس سارے ڈرامے میں اس کا کوئی کردار ہی نہ ہو۔ مجھے آرنلڈ پر اور اس سے زیادہ اپنے آپ پر غصہ آیا۔ یہ میں ہی تو تھی جو آرنلڈ کو اس گلی میں لے گئی تھی۔

تیسری دنیا سے پہلی دنیا کی طرف شاہ پور کے اس سفر کی ابتدا میں ہی میں لاہور چلی گئی۔ وہاں سے لوٹی، تو دو ہفتے گزر چکے تھے۔ شام کو آرنلڈ کے گھر گئی تو لحظہ بھر کے لئے شاہ پور کو پہچان نہ پائی۔ نیلی جینز اور کریم کلر کی ٹی شرٹ میں وہ کسی بھرے پرے امریکی گھرانے کا غنی دل بیٹا نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔ اسے زبان اور آداب محفل دونوں ہی سکھائے جا رہے تھے۔ اسے اڈاپٹ کرنے کی کاغذی کارروائیاں مکمل ہو چکی تھیں۔

شاہ پور میرے سامنے بچھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا ہے۔ میں اسے یہ نہیں سمجھانا چاہتی تھی کہ انسانوں کے بس میں تو کچھ بھی نہیں۔ اس شام شاہ پور نے کمہار واڑے کے بانجھ جوڑے کا کئی بار ذکر کیا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ ان سے ملنے جا چکا ہے' لیکن اب اس ذکر میں وہ بیقراری و بے تابی نہیں تھی۔

دوسرے چوتھے روز شاہ پور سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ صبح و شام بدل رہا تھا' نئے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی زندگی پر غربت نے کبھی اپنا سایہ بھی کیا ہے۔

ستمبر کی آخری تاریخیں تھیں جب آرنلڈ نے بتایا کہ اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن' واشنگٹن سے اس کا دوست ہانس ولف آ رہا ہے۔ ہانس جرمن نژاد تھا اور اس نے اپنی زندگی ایرانی کوزہ گری کے اسرار و رموز سمجھنے میں بسر کی تھی اور اب وہ پاکستان آ رہا تھا۔ پنجاب اور

سندھ کی کوزہ گری سے اسے اچانک دلچسپی ہو گئی تھی۔ یوں بھی موئن جوڈرو سے ملنے والے سالم برتن اور ان کے ٹکڑے سندھ کا کوزہ گری کی قدیم روایت سے رشتہ جوڑتے تھے۔

امریکی حکومت کے اکاؤنٹ پی ایل480 کے تحت ایک طرف پاکستان میں گیہوں آ رہا تھا اور دوسری طرف اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن کے ''پاٹری پراجیکٹ'' کے لئے رقم فراہم کی جا رہی تھی۔

آرنلڈ نے ہانس اور اس کے ساتھیوں کو ٹھہرانے کا انتظام اپنے گھر میں کیا تھا۔ یوں بھی کراچی میں اسے ہم مذاق بھلا کہاں میسر تھے ...... پھر یہ بھی تھا کہ وہ شاہ پور کے لئے لمبے چوڑے منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہانس' شاہ پور سے قدرے مانوس ہو جائے۔ شاہ پور امریکہ جانے والا تھا اور وہاں ہانس اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔

ہانس آیا تو اس کے ساتھ اس کا نائب گورڈن اور فوٹوگرافر والٹن بھی تھا۔ ہانس' شاہ پور سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے عمر کا بیشتر حصہ ایران میں گزارا تھا اور فارسی روانی سے بولتا تھا۔ آرنلڈ نے ہانس کے پہنچنے کے دوسرے ہی دن ایک محفل کا اہتمام کیا جس میں وہ چند افراد بھی تھے جو آرنلڈ کی ہمت افزائی کے سبب کراچی میں کوزہ گری کی روایت کو نئے سرے سے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوئی اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن کی کسی اسکالر شپ کے تحت امریکہ جانے کو بے تاب تھا اور کسی کی خواہش تھی کہ یہ ادارہ کراچی میں کسی پراجیکٹ کا آغاز کرے' کوئی گرانٹ فراہم کرے۔

تیسرے دن ہانس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پنجاب کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ واپسی میں اسے سندھ کی بستیوں میں رکنا تھا اور وہاں کے کوزہ گروں سے ملاقات کرنی تھی۔ وہ پاکستانی کوزہ گری کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کر رہا تھا اور اسی لئے یہاں کے کوزہ گروں سے ملنا چاہتا تھا۔

مجھے اس کے سفر کی تفصیلات آرنلڈ سے معلوم ہوتی رہیں۔ کرسمس سے چند دنوں پہلے آرنلڈ نے بتایا کہ وہ کرسمس منانے سکھر جا رہا ہے کیونکہ ہانس اور اس کے ساتھی بھی کرسمس کے موقعہ پر سکھر میں موجود ہوں گے۔ وہ شاہ پور کو ساتھ لے جا رہا تھا اور شاہ پور کا

اصرار تھا کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ میں نے بہت انکار کیا لیکن شاہ پور نے میری ایک نہ سنی۔ ''خانم آپ کے بغیر مجھے گھبراہٹ ہو گی۔ آپ مجھے اپنے سر پر ہما کا سایہ لگتی ہیں۔''

سکھر میں لبِ مہران ہمارا ٹھکانہ تھا۔ ہمارے سامنے سندھ تھا۔ رات میں اس کے سینے پر سکھر بیراج کی روشنیاں اپنے رخسار رکھ دیتیں اور دن میں سورج اس کے خاکستری پانی میں سنہرا پن گھولتا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ ہوائیں کٹیلی تھیں۔ رات میں شاہ پور مجھے بہ اصرار دریا کے کنارے لے گیا۔ اس کا بچپن برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں گزرا تھا۔ وہ دریا کو چھو کر آتے والی خنک ہواؤں سے لطف اندوز ہوتا رہا اور میں گرم کوٹ میں ٹھنڈک محسوس کرتی رہی۔

پیڑوں کے سائے اور تاروں کی چھاؤں میں ٹہلتے ہوئے وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا ''کوزہ گری کے دن رخصت ہو چکے...... یہ امریکی جو اس پر اتنی رقم خرچ کر رہے ہیں یہ سب بیکار ہے۔ اب تو دیہاتوں میں بھی پلاسٹک اور المونیم کے برتن ملتے ہیں جو برسوں نہیں ٹوٹتے''

''لیکن شاہ پور یہی بات تو تمہارے چچا نے بھی کہی تھی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''بلے خانم...... لیکن میں تو کوزہ گری کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتا۔ میری نسلوں نے کوزہ گری سے نان ونمک کھایا ہے۔ ان امریکیوں پر کون سی افتاد پڑی ہے؟''

''لیکن تمہارے چچا نے تو اپنی بیکری تمہارے سپرد کرنی چاہی تھی۔ روزگار کا تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا تمہیں۔''

''بلے خانم، لیکن میرا عمو ظالم بھی تھا' اگر وہ رحمدل ہوتا تو......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی ''یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ تم ایک عام سے کوزہ گر نہیں ہو۔ ایک فنکار ہو اور فنکار اپنا راستہ کبھی ترک نہیں کرتے۔''

''شاید آپ درست کہہ رہی ہیں خانم' لیکن یہ جو لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے' یہ سب ولایتیوں کے شوق ہیں۔''

اس لمحے مجھ پر اس حقیقت کا نزول ہوا کہ تیسری دنیا میں زندگی کرنے والے تقدیر کی

مہربانی سے اگر پہلی دنیا کے باسی بن جائیں تب بھی یہ پہلی دنیا کو شک کی نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔

دوسرے دن کرسمس پارٹی تھی جس کا اہتمام سکھر کے ڈپٹی کمشنر نے اپنے گھر پر کیا تھا۔ عمائدین شہر کی اس دعوت میں شاہ پور گھبرایا سا پھرتا رہا۔ دعوت اپنے عروج پر پہنچی تو ایک مہمان اپنے تاخیر سے آنے کی معذرت کرتے ہوئے لوگوں سے چھلکتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ یہ حسن میاں تھے۔ پرانے وقتوں کا نمونہ، سکھر کے سب سے سرگرم مسلم لیگی رہنما۔ تن پر سفید شیروانی، بر میں بے داغ پاجامہ، سر پر جناح کیپ اور ہاتھ میں نازک سی بید۔ ڈپٹی کمشنر نے ان کا تعارف آرناڈ اور ہانس سے کرایا۔ تعارف میں ایران اور فارسی زبان سے ہانس کی شناسائی کا ذکر آیا تو حسن میاں نے آگے بڑھ کر ہانس کو مخاطب کیا۔ دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند، گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند۔ ہانس اس برمحل شعر پر پھڑک گیا اور ان کا ہاتھ تھام کر اس طرف چلا آیا جہاں شاہ پور اور میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں فارسی اور انگریزی میں ایک دوسرے سے کلام کرتے رہے۔ اس وقت ہانس کی رگوں میں شراب کی خاصی مقدار پہنچ چکی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حسن میاں نے اس کے وجود میں کسی تار کو چھیڑ دیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کون زیادہ بڑا حافظ حافظ ہے پھر ہانس نے حافظ کا وہ مرثیہ سنانا شروع کیا جو اس نے جواں مرگ بیٹے کی موت پر لکھا تھا۔ ''تا گبش سیل فن نقش امل باطل کرد'' ہانس مصرعہ اولی پڑھتا اور مصرعہ ثانی حسن میاں سناتے ''چہ کنم بازی ایام مرا غافل کرد''

شاہ پور کبھی ایک کو دیکھتا اور کبھی دوسرے کو۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی لیکن اس نے حافظ کا صرف نام ہی سنا تھا۔

''ایران میں حافظ کے کلام سے فال نکالی جاتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہاں بھی دیوان حافظ اسی کام آتا ہے۔ حسن میاں پرانا چاول ہیں اس لئے انہیں اس کے شعر ازبر ہیں'' میں نے اسے تسلی دی۔

''خانم ...... ایران کا میں ہوں اور شعر ان دونوں کو یاد ہیں حافظ کے۔ کاش میرے باپ نے مجھے مکتب میں بٹھایا ہوتا۔'' اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

''زندگی سے بڑا مکتب کوئی نہیں۔ تم اس مکتب میں بٹھا دیئے گئے ہو جلدی ہی سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔''

کچھ دیر میں محفل برخاست ہوگئی۔ ہانس، آرنلڈ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ سکھر کے قدیم چرچ جانے کے لئے پورچ میں آیا تو حافظ کا مصرعہ ''تا گہش سیل فنا نقش امل باطل کرد'' گنگنا رہا تھا۔ شاہ پور اور میں لینڈ روور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس نے ہمیں دیکھا تو مسکراتا ہوا آرنلڈ کی لیموزین کی طرف بڑھ گیا۔

شاہ پور اور میں لب مہران چلے آئے۔

''خانم آپ کے خیال میں میرا فیصلہ درست تھا؟'' گاڑی سے اترتے ہوئے شاہ پور نے اچانک مجھ سے پوچھا۔

''کون سا فیصلہ؟''

''مسٹر آرنلڈ کی سرپرستی میں آنے کا۔''

ہم دونوں اونگھتی ہوئی راہداری سے گزر رہے تھے۔ باہر دریا اسی طرح بہہ رہا تھا جیسے ابتدا سے بہہ رہا ہے اور اندر کرسی پر ایک ملازم اسی طور سو رہا تھا جس طور اس کے پرکھے جنگلوں اور غاروں میں نیند کرتے آئے تھے۔ کوئی شے، کوئی فیصلہ، کوئی واقعہ نیا بھی تھا؟

میں نے لمحے بھر کے لئے گردن موڑ کر اسے دیکھا ''یہ تمہارا نہیں وقت کا فیصلہ تھا۔''

''لیکن......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''وقت گونگا ہے جواب نہیں دیتا۔ اس سے گفتگو اور مباحثہ بیکار ہے چنانچہ تم بھی جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔''

اس نے فرمانبرداری سے شب بخیر کہا اور راہداری میں اس جانب گھوم گیا جدھر اس کا کمرہ تھا۔

دوسرے دن ہمیں صبح سویرے نکلنا تھا۔ ہم سب تیار ہو کر ناشتے کے لئے ڈائننگ

ردم میں پہنچے۔ چند منٹ تک ہانس کا انتظار ہوتا رہا پھر ہم نے ناشتہ شروع کر دیا۔ چند منٹ اور گزرے تو آرنلڈ نے ہانس کو بلانے کے لئے ایک ملازم کو بھیجا۔ کچھ دیر بعد ملازم یہ کہتا ہوا آیا کہ صاحب کے کمرے سے جواب نہیں آرہا۔

آرنلڈ کی پیشانی پر چند لکیریں ابھریں اور وہ کافی کی پیالی رکھ کر نیپکن سے منہ پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ چند منٹ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہانس نیند میں ہی ''ناگہش سیلِ فنا نقشِ امل باطل کرد'' کی تفسیر بن گیا۔

شاہ پور نے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا اسے شاید اپنا جملہ یاد آ گیا تھا ''ہمارے یہاں خواجہ کے کلام سے فال نکالی جاتی ہے۔''

حسن میاں کی دبنگ آواز میرے کانوں میں گونجی ''چہ کنم بازی ایام مرا غافل کرد''

تھوڑی ہی دیر میں ڈپٹی کمشنر ڈی ایس پی اور دوسرے لوگ آ پہنچے۔ ہانس کو کراچی لے جانے کا انتظام کہیں شام تک ہو سکا۔ موسم سرد تھا اس کے باوجود سفر اتنا لمبا تھا کہ ہانس کو برف کی سلوں پر رکھا گیا۔ آگے آگے آرنلڈ کی لیموزین تھی۔ درمیان میں ایمبولنس اور اس کے پیچھے لینڈ روور میں شاہ پور اور میں تھے۔ سکھر اور ہالہ کے کوزہ گر ہانس کا انتظار کرتے رہ گئے تھے۔

ایمبولنس کی چھت پر لگی سرخ روشنی رقص کرتی رہی۔ ریتیلے میدانوں میں اگیا بیتال ناچتے رہے۔ حسن میاں اور ہانس کی آوازیں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی رہیں ''ناگہش سیل فنا نقش امل باطل کرد'' ''گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند'' فرشتے ہانس کی مٹی سے کوئی کوزہ کوئی پیمانہ کہاں اور کس صدی میں بنائیں گے؟ کیا یہ وہی مشتِ خاک تھی جو دوسرے برس خاک گل ہوئی تھی چوتھے برس صلابہ چھٹے برس فخار اور آٹھویں برس اس نے آدم اور اس کے بعد آدم اور اس کے بعد بھی آدم کی صورت اختیار کی تھی؟

اونگھتا ہوا شاہ پور رات کے کسی پہر چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''خانم میں نے ابھی قزوین کے قصہ خواں کو دیکھا''

''کیسے دیکھا؟''

''ہمارے یہاں ایک قصہ خواں تھا۔ وہ ہر داستان ''یکے بود و یکے نبود'' سے شروع کرتا تھا اور میں اس سے ہمیشہ جھگڑا کرتا تھا۔ میرا کہنا تھا کہ جو نہیں تھا اس کی کہانی کیسے سنائی جا سکتی ہے''۔

''تو پھر؟''

''کچھ نہیں خانم اس نے آج بھی اپنی کہانی ''یکے بود و یکے نبود'' سے شروع کی لیکن آج میں نے اس سے جھگڑا نہیں کیا۔''

''لیکن کیوں؟''

''اس لئے خانم کہ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ داستان یا کہانی میں جو زندہ ہو یا زندہ رہ جائے اس کے لئے'' بود'' استعمال کرتے ہیں اور ختم ہونے والے کے لئے ''نبود'' کہا جاتا ہے۔'' اس نے گہری سانس لی اور ہچکولے لیتی ہوئی گاڑی کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک بار پھر اونگھنے لگا۔

ہانس کو ہم کراچی لائے پھر آرنلڈ نے اسے آسٹریلیا روانہ کیا جہاں اس کی بیوی اور بیٹیاں اس کی منتظر تھیں۔

اس سانحے کے چند ہی مہینوں بعد شاہ پور امریکہ چلا گیا۔ اب وہ فرانٹے سے انگریزی بولتا تھا۔ پاپ میوزک کے آہنگ پر تھرکتا تھا۔ جہاز کی رفتار سے گاڑی چلاتا تھا۔ زمانہ اس کے سامنے کسی قالین کی طرح بچھا ہوا تھا اور وہ اسے روندتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن وہ کمہار واڑے کو نہیں بھولا تھا۔ جاتے ہوئے وہ بوڑھی کمہارن اور کمہار سے مل کر روتا رہا۔ اس نے انہیں خط لکھنے اور روپے بھیجنے کی قسمیں کھائیں ...... ۔ آرنلڈ اس کے ساتھ گیا اور جب مہینے بعد واپس آیا تو خوش تھا۔ شاہ پور کا سیراکیوز میں داخلہ ہو گیا تھا۔

اس کے خط پابندی سے آرنلڈ کے پاس آتے رہے۔ مجھے بھی وہ لمبے لمبے خط لکھتا جو اس کی کامیابی کی خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے۔ کمہار واڑے کے اس بوڑھے جوڑے کو ہر ماہ میری وساطت سے روپے ملتے رہے۔ پھر آرنلڈ کا ٹرانسفر ہو گیا۔ آہستہ آہستہ شاہ پور کے خطوط میں کمی ہوتی گئی لیکن پھر بھی وہ مجھے نئے سال کی مبارکباد کے کارڈ

اور کمہار واڑے کے ایک تیرہ و تار گھر کو پیسے بھیجنا نہ بھولا۔

کئی برس گزر گئے۔ پہلے بوڑھا ختم ہوا پھر سال سوا سال بعد کمہارن بھی چل بسی۔ میں نے شاہ پور کو لکھا کہ وہ رقم بھیجنی بند کر دے۔ اس کے روپوں کی راہ دیکھنے والے اب نہیں رہے تھے۔

شاہ پور کا خط آیا جس میں اس نے کمہار واڑے میں گزرے ہوئے دنوں کو بہت یاد کیا تھا۔ اس کے بعد بھی بھولے بھٹکے اس کے خط آتے رہے۔ ان ہی دنوں میں کچھ عرصے کے لئے ملک سے باہر چلی گئی' واپس آئی تو وہ تعلق بھی ختم ہو چکا تھا۔ شاید ایک طویل مدت تک میرے جواب نہ دینے سے وہ مایوس ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں بھی اس کا نام کسی دور افتادہ گوشے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

اگست کی ایک حبس زدہ شام ہے ''بہائی ہال'' میں ایک مختصر سی محفل ہے۔ کرسیوں پر ایک معتوب و مقہور اقلیت کے کچھ افراد بیٹھے ہیں۔ اپنی ذات میں جزیرے۔ وجود کی سرائے میں تھکے ہوئے مسافر۔ ان کے بزرگ سالہا سال ناصر الدین شاہ قاچار کے ظلم کی چکی میں پستے رہے تھے اور عاجز آ کر ایران سے نکلے تھے اور مختلف زمینوں میں بکھر گئے تھے۔ یزد' زنجان' شیراز' تہران' بارفروش' بستیوں کی بستیاں تھیں جن میں لوگوں کے جسم کترے گئے' بے گناہ سولی چڑھے' انہیں خنجروں اور بھالوں سے زخمی کیا گیا۔ ان ہی بستیوں میں ایک قزوین بھی ہے۔ انیسویں صدی کی شاید سب سے ذہین مشرقی عورت کی جنم بھومی۔ یہ محفل قزوین کی اسی نادر و نامور بیٹی کی یاد میں ہے۔ طاہرہ جو قرۃ العین کہلائی' زریں تاج کے نام سے یاد کی گئی' جسے بہائی مذہب کا زندہ معجزہ قرار دیا گیا۔ شاعروں نے جس کے قصیدے لکھے' نثر نگاروں نے جسے خراج عقیدت پیش کیا' جس کے اشعار زبان زد خاص و عام ہیں اور جسے خاتون عجم کہا گیا۔

چھوٹے سے ہال کی دیواروں پر ''یا بہا الابہا'' اور ''الاعظم الابہا'' کے طغرے ہیں۔ خانم اسفندیاری' آقائے شیرازی اور آقائے انیس کے بعد مجھے بلایا جاتا ہے۔ قرۃ العین پر کچھ کہنے کے لئے' اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو یکے از حرف حیّ تھی' جناب

نقطہ تھی، ام العالم تھی، میں اسے قید خانے میں دیکھتی ہوں۔ وہ شہنشاہ ایران ناصر الدین شاہ قاچار کی طرف سے جاں بخشی کی پیشکش وصول کرتی ہے۔ یہ پیشکش شادی سے مشروط ہے۔ وہ اس شرط کو پڑھتی ہے، مسکراتی ہے، سامنے رکھے ہوئے قلمدان سے قلم اٹھاتی ہے اور اسے روشنائی میں ڈبو کر شاہی خط کے حاشیے پر لکھتی ہے...... تو و ملک و جاہ سکندری من ورسم وراہ قلندری اگر آں نکواست تو درخوری وگر آں بدست مراسزا...... اسی جواب کے چند دنوں بعد اسے جلاد کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ شاہی محل سے شہادت گاہ کا فاصلہ کتنا طویل کتنا مختصر ہے۔

یاد زریں تاج کی محفل ختم ہوئی۔ ہم سب چائے پینے میں مصروف ہیں۔ طاہرہ کی غزل بہائی لڑکیوں اور لڑکوں نے ساز پر کیا خوب گائی ہے۔ ''ی روداز فراق تو خون دل از دو دیدہ ام'' میں آقائے انیس اور آقائے شیرازی سے باتیں کر رہی ہوں'' از پے دیدن رخت ہم چو صبا فتادہ ام۔''

''خانم''...... کوئی مجھے مخاطب کرتا ہے۔

آواز جانی پہچانی ہے۔ میں چونک کر مڑتی ہوں اور لمحے بھر میں اسے پہچان لیتی ہوں۔ میرے سامنے شاہ پور کھڑا ہے، قزوین کا شاہ پور۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ واقعی شاہ پور تھا۔ وہ صرف دو دن پہلے کراچی آیا تھا۔ کلفٹن میں اپنے کسی عزیز کے گھر ٹھہرا تھا۔ مجھ سے ملنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن یہ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ بہائی ہال میں مجھ سے ملاقات ہو جائیگی جہاں وہ اپنے میزبان کے اصرار پر چلا آیا تھا۔

اس شام ہم دونوں تادیر ''ہالی ڈے ان'' کی کافی شاپ میں بیٹھے رہے اور آئینہ جڑی دیواروں پر ہنستے مسکراتے چلتے پھرتے لوگوں کے عکس دیکھتے رہے۔ وہ باتیں کرتے کرتے کبھی اداس ہو جاتا کبھی زور زور سے ہنسنے لگتا۔

''میں جب امریکہ گیا تھا تو کبھی کبھی ہفتوں کوئی ایرانی چہرہ نظر نہیں آتا تھا لیکن اب تو امریکی شہر ایرانیوں سے چھلک رہے ہیں۔ ان میں بہائی شاید سب سے زیادہ ہیں۔ ہم

پر زندگی کبھی مہربان نہیں رہی اور جن اقلیتوں پر زندگی مہربان نہ ہو وہ ایک شہر سے دوسرے شہر' ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر اختیار کرتی رہتی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں گہری تنہائی تھی۔

اس روز اتنے عرصے بعد مجھے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ بہائی ہے۔ اس کا دکھ سمجھ میں آتا تھا۔ ایران میں شہنشاہت ختم ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی بہائیوں پر ایران کی سرزمین ایک بار پھر تنگ ہو چکی تھی۔ ہجرت کی پرانی کہانیاں نئی سرزمینوں میں دہرائی جارہی تھیں اور متعدد بہائی خاندان پاکستان میں پناہ لئے ہوئے تھے۔

شاہ پور آرٹ ڈویژن آف امریکن سرامک سوسائٹی سے وابستہ تھا۔ اس کے بنائے ہوئے ظروف' آرائشی اشیاء اور ٹائلیں سیراکیوز میوزیم کی سالانہ روبینو یادگاری نمائش میں انعام حاصل کر چکی تھیں۔ شہرتوں کے کیسے انوکھے اور نامعلوم دائرے ہیں۔ سب اپنے اپنے دائروں میں ہیں۔ مطمئن' سرشار' دوسرے دائروں سے بے خبر۔

اپنی کامیابیوں کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اچانک وہ اداس ہوگیا۔ ''میری بنائی ہوئی چیزیں جب سینکڑوں ہزاروں ڈالر میں فروخت ہوتی ہیں تو مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ میرے باپ کے بنائے ہوئے برتن تومان یا درہم کے عوض فروخت نہیں ہوتے تھے۔ جب بھی کسی کو اس کے بنائے ہوئے برتنوں کی ضرورت ہوئی وہ اس برتن کے بدلے اسے اناج دے جاتا۔ برتن کی قیمت یوں لگتی کہ دینے والا اگر باجرہ دے رہا ہوتا تو برتن میں دو مرتبہ باجرہ بھرا جاتا۔ گیہوں ڈیڑھ برتن' جو تین اور دھان تین برتن۔ میرا باپ اس معاوضے کو بھی بہت جانتا تھا اور اس کے چہرے پر شکرگزاری پھیل جاتی تھی۔ اور مجھے ہزاروں ڈالر ملتے ہیں' تب بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خریدار فائدے میں رہا اور میں نقصان میں۔''

پھر وہ آرنلڈ کی باتیں کرنے لگا ''وہ اب فورڈ فاؤنڈیشن سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور سیراکیوز میں میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ہمارے گھر کے بیسمنٹ میں ان کی اور میری الگ الگ بھٹیاں ہیں۔''

مجھے وہ سہ پہر یاد آ گئی جب آرنلڈ اور شاہ پور نے پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اس وقت دونوں نے بھلا کیوں سوچا ہوگا کہ کچھ ہی دنوں میں تقدیر انہیں ایک ہی چھت کے نیچے یکجا کرنے والی ہے۔

''آپ نے مجھ سے ایک سوال نہیں کیا۔'' اس نے کہا۔

''کون سا سوال؟'' میں نے ذہن پر زور دیا۔

''چلیں آپ کے سوال کے بغیر ہی میں جواب دیئے دیتا ہوں۔ میں نے شادی کر لی ہے۔'' وہ ہنسا۔

''ہاں واقعی یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گئی۔''

''ابھی بہائی ہال میں جن صاحب سے میں نے آپ کو ملوایا تھا وہ میری سالی کے شوہر ہیں۔''

''خوب......وہ یہاں رہتے ہیں؟''

''جی خانم۔ میری شادی بھی انوکھا قصہ ہے۔ جس طرح کراچی کے کمہار واڑے کی ایک گندی گلی میں آپ نے مجھے دیکھا تھا اور میری زندگی بدل گئی تھی۔ اسی طرح روداب ایک نمائش میں میری بنائی ہوئی چیزیں دیکھنے اور خریدنے آئی تھی اور میں خود بے دام بک گیا۔'' اس نے اپنی ہتھیلیاں کھول کر انہیں غور سے دیکھا جیسے اس پہلی ملاقات کا منظر ان ہتھیلیوں پر کھنچا ہوا ہے۔

''روداب بہت خوبصورت نام ہے۔ تم لوگ شاہ نامے سے نام خوب نکالتے ہو۔''

''خانم اس کا صرف نام ہی روداب نہیں' وہ نوش دارو بھی رکھتی ہے۔ ہر دکھ کا مداوا اس کے پاس ہے۔ روح کی تشنگی کی سیرابی اس سے ہوتی ہے۔ میں اس کی زندگی جیتا ہوں اور اسی کی سانسوں سے زندہ ہوں۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔

''تم تو شاعری بھی کرنے لگے'' میں...... ہنسی۔

وہ جیسے نیند سے چونک گیا 'روداب سے ملنے سے پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ روح میں اتنی گہری اور شدید مقناطیست رکھنے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو دوسری روح کو

اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں، سمو لیتی ہیں۔ وہ چھنی ہوئی مٹی تھی اور میں پانی، اس نے مجھے اپنے میں جذب کر لیا۔ گندھی ہوئی مٹی سے پانی کی رہائی بھلا کہاں ممکن ہے۔ زائد پانی کو بھٹی بھاپ بنا کر اڑا دیتی ہے لیکن مرکب پانی تو کوزے میں ہی رہ جاتا ہے۔''

کیا یہ وہی شاہ پور تھا جس سے میں برسوں پہلے کمہار واڑے میں ملی تھی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ زندگی نے اسے فلسفہ بھی سکھا دیا تھا۔

اس نے کوٹ کی جیب سے والٹ نکال کر مجھے رودابہ کی تصویر دکھائی۔

''میں روزانہ اس سے کسی بہانے ملتا رہا پھر وہ چند ہفتوں کے لئے دوسرے شہر چلی گئی۔ اس نے مجھ سے خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ شدید انتظار کے عالم میں مجھے اس کا خط ملا تو وہ فارسی میں تھا، میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔''

وہ ہنسنے لگا ''آپ تو جانتی ہیں خانم فارسی میری مادری زبان ہے میں اسے بول سکتا تھا لیکن اس میں لکھنا پڑھنا مجھے کب آتا تھا۔ جب میں امریکہ گیا تو انگریزی اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ چنانچہ اس روز رودابہ کا خط لے کر پھرتا رہا۔ کسی دوسرے سے اسے پڑھوا نہیں سکتا تھا اور خود پڑھنے سے معذور تھا۔ عجب بے بسی کا عالم تھا۔ میں نے اسی رات رودابہ کو خط لکھا اور اپنی مشکل بھی لکھ دی۔ اس کے بعد اس کا خط انگریزی میں آیا اور جب وہ خود واپس آئی تو میں نے اس سے فارسی سیکھی۔'' وہ سانس لینے رکا ''آپ کو یاد ہے خانم جب سکھر میں مسٹر ہانس مجھے حافظ کے شعر سنا رہے تھے اور مجھ سے بھی توقع رکھتے تھے کچھ سنانے کی تو میں گھبرا گیا تھا...... لیکن اب میرے گھر میں دیوانِ حافظ ہے، گلستان بوستان ہے، شاہنامہ ہے، مثنوی ہے...... رودابہ کو شاعری سے عشق ہے...... جدید شاعروں کا بھی کلام ہے۔''

وہ اس طرح ڈوب کر باتیں کر رہا تھا کہ اس سے اجازت لینا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آخر کار میں نے اس سے پوچھ ہی لیا ''یہ تو بتاؤ تم یہاں کتنے دن رکو گے؟ میرے گھر کب آؤ گے؟''

''تین دن بعد میں چلا جاؤں گا۔ رودابہ کے بیشتر اہل خانہ ایران چھوڑ چکے ہیں، لیکن اس کی مادر ابھی تک وہیں تھیں۔ پچھلے دنوں جب زندگی بالکل ہی ناممکن ہوگئی تو وہ بھی

ترک وطن پر مجبور ہوئیں۔ ان کی ایک بیٹی کراچی میں رہتی ہے۔ اس کا شوہر ڈاکٹر ہے۔ ابھی میں نے اسی سے تو ملایا تھا آپ کو...... رودابہ کی مادر اپنے داماد کے گھر ٹھہری ہوئی ہیں' لیکن رودابہ اور میں چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ رہیں۔ ان کی صحت ٹھیک نہیں' صحت کی خرابی سے زیادہ انہیں ایران چھوڑنے کا غم ہے۔ میں ان ہی کو لے کر بانے کے لئے آیا ہوں۔''

میں اٹھنا چاہتی تھی' لیکن اس نے مجھے اٹھنے نہیں دیا۔ رودابہ کی باتیں کرتا رہا ''وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے اور ابھی تو اسے میرے بہت سے بچوں کی ماں بننا ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا خانم...... ہر بات اسے بتا دی۔ خودکشی کی کوشش سے لے کر چچا کی صندوقچی سے پیسے چرانے تک۔ میں نے اس سے آپ کی بہت سی باتیں کی ہیں۔ اسے بتایا ہے کہ یہ آپ تھیں جن کی وجہ سے میں اس گندی گلی سے نکلا تھا۔ وہ اکثر کہتی ہے کہ میری طرف تمہارے سفر کے آغاز کا وہ پہلا لمحہ تھا۔''

وہ بے تکان بول رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اس کی زندگی بھی ''مرزبان نامہ'' یا ''قابوس نامہ'' کی کوئی کہانی تھی۔ کوئی ایسی کہانی 'جو ''بے گزشت'' سے شروع ہوتی ہو۔

پھر اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور مجھ سے کہا کہ میں اس پر اپنے گھر کا نقشہ بنا دوں۔ ''آپ کا پرانا پتہ میں ساتھ لایا تھا' سوچا تھا کہ اگر آپ نے گھر بدل لیا ہوگا تو آس پاس کے کسی آدمی سے پتہ مل ہی جائے گا...... لیکن اب جب آپ خود مل گئی ہیں تو کسی اور سے کیوں پوچھوں؟'' میں اس کے لئے کاغذ پر لکیریں کھینچنے لگی۔

دو دن بعد وہ میرے گھر آیا تو ہاتھ میں گتے کا ایک ڈبہ تھا جس پر انگریزی میں ''نازک'' لکھا ہوا تھا۔

چائے کے دوران اس نے مجھ سے قینچی منگائی۔ ''اسے میں نے بطور خاص آپ کے لئے بنایا تھا اور اس امید پر ساتھ لایا تھا کہ آپ مجھے مل جائیں گی۔'' اس نے ڈبے کے گرد مضبوطی سے بندھی ہوئی پلاسٹک کی ڈوری کو قینچی سے کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ سفید رنگ کا پنج شاخہ شمع دان تھا اور اس پر بنفشی' طاؤسی' زعفرانی' لاجوردی اور

قرمزئی رنگ سے شجر کائنات کی شاخیں کڑھی ہوئی تھیں۔ بیچ رنگی روغنی کڑھت روشنی میں دھوپ چھاؤں کا سا منظر پیش کر رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رنگ اس شمع دان پر منجمد نہ ہوں' سفید روغن کے نیچے سانس لے رہے ہوں حرکت میں ہوں۔

''یہ ہم دونوں کی طرف سے آپ کے لئے ہے۔ آپ نے میری زندگی میں روشنی کر دی' اسی روشنی کے نام'' وہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ رکھ کر ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم نے بنایا ہے؟'' مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بلے خانم'' وہ ایک ادا سے ہنسا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شمعدان اٹھایا اور اس کا نچلا حصہ مجھے دکھانے لگا۔ وہاں طاؤسی رنگ میں اس کے دستخط تھے۔ فارسی رسم الخط میں ''شاہ پور قزوینی'' آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔

میری آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ بے پایاں حسن اور دور افتادہ محبت دل پر اسی طور اثر کرتی ہے۔

''میں جب اسے آپ کے لئے بنا رہا تھا' اسے جب منقش کر رہا تھا تو وہ سہ پہر ہر لمحہ نگاہوں میں قائم رہی تھی۔ یہ میں نے مسٹر آرنلڈ کو بھی دکھایا تھا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے کہ اسے میں نے آپ کے لئے بنایا ہے۔''

اس رات یادوں اور باتوں کے ہجوم میں اس نے بتایا کہ اپنے گھر کے لئے متعدد آرائشی اشیاء اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہیں۔ ان پر اپنے ہاتھوں سے بیل بوٹے کاڑھے ہیں۔ انہیں القلی' سنکھیا' نمک' جست' سیسے اور تانبے سے صیقل اور روغن کیا ہے۔

''میری بنائی ہوئی ٹائلیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ میں نے اپنے بیڈ روم کی چاروں دیواروں پر شاہنامے کو مصور کیا ہے۔''

آرنلڈ نے اسے دیکھ کر کہا تھا کہ اس کی انگلیاں گندھی ہوئی مٹی پر جادو کر دیتی ہیں۔ اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ وہ ایک ماہر نقاش بھی ہوگا۔ میں اس کی صاف ستھری اور حساس انگلیوں کو دیکھتی رہی۔

اس کی رخصت کا وقت ہوا تو میں نے رودابہ کے لئے ایک کشمیری شال اور اس کے ہونے والے بچے کے لئے چاندی کی چیزیں دیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر گلال بکھر گیا' پھر وہ کچھ ہنستے ہوئے کچھ روتے ہوئے چلا گیا۔

اس کی رخصت کے آٹھ مہینے بعد مجھے آرنلڈ کا خط ملا۔ خط سے معلوم ہوا کہ رودابہ بچے کی پیدائش میں ختم ہوگئی تھی اور بچہ بھی بچایا نہیں جاسکا تھا۔

''ہمارا گھر جنت تھا' لیکن جب وہ ختم ہوئی تو جہنم بن گیا۔ شاہ پور پہلے تو اس کی تدفین پر ہی تیار نہ تھا۔ بمشکل رودابہ کی نڈھال ماں نے اسے راضی کیا۔ پھر قبرستان سے واپس آیا تو اپنی بنائی ہوئی ہر چیز توڑ دی۔ وہ بیلچہ لے کر اپنے بیڈروم میں گھس گیا اور دیوار پر لگی ہوئی ٹائلوں میں سے کسی ایک کو سلامت نہیں چھوڑا۔ بڑی مشکلوں سے ہم نے اس پر قابو پایا۔ وہ ہفتوں اسپتال میں رہا۔ اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو میں اسے گھر لے آیا۔ وہ سارا سارا دن رودابہ کا چہرہ بناتا رہتا تھا۔ پھر ایک روز اچانک وہ غائب ہوگیا۔

''میں اس کے لئے زمین آسمان ایک کر چکا ہوں' لیکن اسے ڈھونڈھ نہیں پایا۔ تمہیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ شاید وہ کراچی چلا گیا ہو۔ وہاں خاصی تعداد میں بہائی ہیں' شاید ان میں سے کسی کو معلوم ہو اس کے بارے میں۔

''میرا زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جس کہانی کا آغاز اتنا شاندار ہے وہ اپنے انجام کو پہنچتے پہنچتے اتنی بھیانک ہو جائے گی۔''

میں نے آرنلڈ کا خط کئی بار پڑھا۔ ایسی باتوں پر یقین کہاں آتا ہے۔

کئی ہفتوں کی تگ و دو کے باوجود مجھے اس کے بارے میں کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ مجاہدین خلق کے ایک سرگرم کارکن فرہود ایرج زادہ نے میرے کہنے پر چند دوستوں کو جو کوئٹہ میں رہتے تھے خط بھی لکھا لیکن سب لاحاصل۔ بعض لوگ اس کے نام سے واقف تھے لیکن اس کے آگے انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ آخر کار مجھے آرنلڈ کو خط لکھ کر اپنی ناکامی سے آگاہ کرنا پڑا۔

شاہ پور سے پہلی اور آخری ملاقات آنکھوں کی پتلیوں پر جمی رہی۔ وہ یتیم ویسیر لڑکا

جو قزوین سے زندگی کے سفر پر نکلا تھا' جسے تقدیر کراچی کے کمہارواڑے کی گندی گلی سے اٹھا کر امریکہ کے ایوانوں میں لے گئی تھی' جس کی انگلیاں چاک پر خداوندی کرتی تھیں۔ وہ خدا جانے کہاں تھا اور کس حال میں تھا۔

دریا کو' ہریالی کو' خاک کے تودوں کو رات نے نگل لیا ہے۔ ہماری گاڑی روشنی کی لکیر کھینچتی ہوئی رات کے اندر سفر کر رہی ہے۔ حسن حمیدی میرے برابر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آنکھیں بند ہیں اور زیر لب گنگنا رہے ہیں۔ایک شعلۂ برق خرمن صد کوہ طور تھا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر فریدوں ایرج زادہ ہے۔ رات اسے حسن حمیدی کے گھر دیکھ کر میں حیران رہ گئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سے سکھر میں ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ بھی میری طرح سکھر میں ہونے والے جلسے میں شرکت کے لئے آیا ہوا تھا۔

میں کراچی لوٹ رہی ہوں۔ حسن حمیدی میری ساتھ ہیں۔ ان کا دل آہستہ آہستہ ان کا ساتھ چھوڑتا جا رہا ہے۔ شاید کراچی میں کوئی ڈاکٹر ان کے لئے نسخہ لکھ دے۔ فریدوں کو بھی ہم نے ساتھ لے لیا ہے۔

فریدوں ایرج زادہ بالکل خاموش ہے۔ بولنے کی اب ضرورت ہی کہاں رہی ہے۔ رات اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ چند ہفتوں پہلے قزوین میں چار بہائی مردوں اور عورتوں کو گولی ماردی گئی۔ پانچ کو بردہ فروشی اور منشیات کی اسمگلنگ کے الزام میں سزا ہوئی۔ چھٹا مجذوبوں کے حلیے میں رہتا تھا اور ایک عورت کے مجسمے بنا کر پوجتا تھا۔ اس مرتد کو شرک ایسے گناہ عظیم کے ارتکاب کی سزا ملی۔ فریدوں ایرج زادہ نے مجھے اس مجذوب کا نام بھی بتا دیا تھا۔

شاہ پور گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے۔ اس کی گہری بھوری آنکھیں گاڑی کے بند شیشے کے اس پار سے مجھے دیکھ رہی ہیں۔ ''خانم...... خانم'' وہ مجھے آواز دیتا ہے۔ میری آنکھوں میں یادوں کی کانچ چبھ رہی ہے۔ میں اس کی آواز کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہوں۔ میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا۔ حسن حمیدی گنگنا رہے ہیں۔

''خانم' قزوین کے قصہ خواں کو آپ نے کبھی خواب میں دیکھا؟'' اس کی آواز پوچھتی ہے' اس کا چہرہ میری طرف جھکتا ہے۔ میں اپنی آنکھیں' اپنے کان بند کر لیتی ہوں۔ کھڑکی کے شیشے پر اس کی ان انگلیوں کی دستک جاری رہتی ہے جو گندھی ہوئی مٹی پر جادو کر دیتی تھیں' پھر اس کی آواز میرے سینے پر دستک دینے لگتی ہے۔ ''میں کہانی تھا اور کہانیاں اسی طرح شروع ہوتی ہیں خانم کہ یکے بود یکے نبود...... ''

○○

تتلیاں ڈھونڈنے والی

نرجس نے سفید سر والی اماں کو دیکھا جو سلاخ دار دروازے کے دوسری طرف بیٹھی تھیں اور جن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بھیا سر جھکائے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ نرجس کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

مہدی تالی بجا کر زور سے ہنسا پھر اس نے سلاخوں کے درمیان سے اپنے دونوں ہاتھ باہر نکال دیئے۔ ''مما' میری تالی۔'' وہ چہکا۔ تب بھیا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور مہدی کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ نمکین پانی کے قطرے مہدی کے گرد آلود ہاتھوں کو دھونے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

نرجس نے دوسرے اچھے اور برے مناظر کی طرح اس منظر کو بھی اپنے اندر رکھ لیا۔ اس کے دل کو تسلی ہوئی۔ اماں نہیں رہیں گی' تب بھی مہدی کے سر پر ہاتھ رکھنے والا تو رہے گا۔ بھیا اسے جی جان سے چاہتا تھا۔ وہ یقیناً مہدی کو بہت عزیز رکھے گا۔ بھیا نے رحم کی اپیل پر دستخط کروانے کے لئے اس سے کیسی کیسی منتیں نہ کی تھیں' لیکن نرجس کے لئے بس یہی ممکن نہ تھا۔ اپیل کا وقت گزر گیا تھا اور اب وہ موت کے مقابل تھی۔

اماں اس کا ہاتھ یوں تھامے ہوئے تھیں جیسے تیرنے والے ڈوبنے والے کو تھامتے ہیں۔ اس لمس میں بے بسی تھی' جدائی تھی' بے پایاں اسم تھا۔ یہ لمس باہر کی دنیا سے اس کا آخری رابطہ تھا۔ وہ دنیا جو حسن اور بدصورتی سے' اچھوں اور بروں سے' محبت سے بھری

ہوئی تھی۔

مہدی کھلکھلاتا رہا...... بھیا سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی دو سلاخوں کے درمیان سے اپنا ننھا سا چہرہ آگے نکال کر ممتا کا چہرہ چومتا اور کبھی ہاتھ بڑھا کر نتا کے سفید بالوں سے الجھتا رہا۔

''اماں' اسی بات پر خوش ہو لیں کہ مہدی اب آزاد ہو جائے گا۔ اس نے سلاخوں' ہتھکڑیوں' زنجیروں اور سنگینوں کے سوا دیکھا بھی کیا ہے' وہ یہیں پیدا ہوا' یہی بیرکیں اس کی کل کائنات ہیں۔ اب وہ اسکول جائے گا' بازار جائیگا' باغ میں کھیلے گا' بھیا اسے جھولے پر ضرور بٹھانا۔''

''آپا تمہیں خدا رسول کا واسطہ' چپ رہو۔'' بھیا بلکنے لگا اور وہ خاموش ہو گئی۔ وہ اماں کی اور بھیا کی اذیت' ان کا عذاب سمجھتی تھی' لیکن انہیں یہ نہیں سمجھا سکتی تھی کہ کبھی انسان اپنے لئے موت منتخب کرتا ہے کہ دوسرے زندہ رہیں۔ موت کے پیالے میں جب تک زندگی کے سکّے نہ ڈالے جائیں' آدرش ہاتھ نہیں آتے۔

وہ اور حسین ایک ساتھ ہی گرفتار ہوئے تھے۔ پھر اطلاع آئی کہ تفتیش کے دوران حسین نے خودکشی کر لی۔ نرجس جانتی تھی کہ وہ قیدی جو فوجی حراست میں تشدد کی تاب نہ لاکر ہلاک ہو جائیں' ان کی لاشیں ان کے ورثاء کو نہیں ملتیں۔ وہ بے نشان قبروں میں سوتے ہیں اور ایسے مقتولوں کی ہلاکت کو قاتل 'خودکشی' کا ہی نام دیتے ہیں۔ حسین پر سے اس کا ایمان ایک لحظہ کے لئے متزلزل نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی اس کی طرح ضمیر کا قیدی تھا اور ضمیر کے قیدی خودکشی نہیں کرتے' رحم کی درخواستیں نہیں گزارتے۔

آخری ملاقات کا وقت ختم ہوا تو اماں غش کھا گئیں۔ بھیا سلاخوں سے چمٹ گیا۔ وہ اس کے ہاتھوں کو پیار کر رہا تھا' اس کے بالوں کو چھو رہا تھا۔ پھر وہ لوگ چلے گئے۔ نہیں' وہ لوگ گئے نہیں' لے جائے گئے۔ نرجس کا کیسا جی چاہا تھا کہ ایک بار' آخری بار بھیا کو سینے سے لگا لے لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ جیل کے آداب انسانوں نے بنائے تھے۔ ان سے انسانی رشتوں اور جذبوں کا خیال لاحاصل تھا۔

ممنا چلا گیا مہدی بلکنے لگا۔ وہ وہاں جانا چاہتا تھا جہاں کی کہانیاں امی نے سنائی تھیں‘ لیکن امی تو اسے کہیں بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔

”کل چلے جانا۔ ممنا تمہیں کل لے جائیں گے۔“ نرجس مہدی کے رخسار چومنے لگی۔

وارڈن مریم نے ماں اور بیٹے پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ یہ کیسی عورت تھی جس نے موت کی سزا کے خلاف رحم کی اپیل نہیں کی تھی‘ جس نے پھانسی گھر پہنچ کر ایک آنسو نہیں بہایا تھا‘ چیخیں نہیں ماری تھیں‘ خدا سے لے کر جیلر تک کسی کو بھی گالیاں نہیں دی تھیں۔

یہ عجیب عورت تھی کہ جب اسے قرآن دیا گیا تو اس نے اسے آنکھوں سے لگا کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے بیٹے کو چومتی رہی۔ مولوی صاحب نے آ کر اسے نماز پڑھنے کی‘ بارگاہ رب العزت میں توبہ استغفار کرنے کی ہدایت کی تو وہ مسکراتی رہی۔ مولوی صاحب کے جانے کے بعد اس نے جانماز اپنے تکئے کے نیچے رکھ دی۔ پھر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اپنے بیٹے کو کہانیاں سنانے لگی۔

زنانہ وارڈ کیسی کیسی عورتوں سے بھرا ہوا تھا‘ لیکن نرجس ان سب کو اپنے آپ میں سے نہیں لگتی تھی۔ گزشتہ چار برسوں میں ان بری عورتوں نے اسے بہت اچھی طرح رکھا تھا‘ وہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اسی لئے وہ اس سے محبت کرتی تھیں‘ اس کا احترام کرتی تھیں‘ اس سے خوف کھاتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اس نے کسی کی ناک‘ چٹیا نہیں کاٹی‘ کسی کے مویشی نہیں چرائے‘ کچی شراب اور چرس نہیں بیچی‘ کسی کو قتل نہیں کیا تو پھر اسے کن گناہوں کی اتنی بڑی سزا ملی ہے۔

”بی بی تمہیں ڈر نہیں لگتا؟“ پھانسی گھاٹ منتقل ہونے کے چند دن بعد وارڈن مریم نے اس سے پوچھا تھا۔

”کس بات سے ڈر؟“ نرجس کے لہجے میں سکون تھا۔

”موت سے۔“

”نہیں‘ موت پر جب اپنا اختیار ہو تو اس سے ڈر نہیں لگتا۔ پھر مہدی بھی تو ہے۔ وہ

میرے بعد رہے گا اور میں اس میں رہوں گی۔ پھر جب وہ چلا جائے گا تو میں اس کے بچوں میں زندہ رہوں گی۔''

مریم نے اس کے بعد نرجس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ہاں بیرکوں میں یہ بات ضرور گھوم گئی تھی کہ پھانسی گھر میں جو بی بی بند ہے' وہ بہت پہنچی ہوئی ہے۔ اسے بشارت ہوئی ہے کہ وہ اپنے بعد بھی رہے گی' ہاتھی کے کلیجے والی ہے۔

نرجس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے سامنے پہنچ کر لیڈی وارڈنوں کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اس کی کوٹھری سے جانے کی جلدی ہوتی ہے اور صبح و شام جب وہ اپنی کوٹھری سے باہر نکالی جاتی ہے تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ لڑتی ہوئی' شور مچاتی ہوئی عورتیں خاموش ہو جاتی ہیں اور سلاخ دار دروازوں کے پیچھے سے اسے یوں دیکھتی ہیں جیسے وہ ان میں سے نہیں ہے کہیں اور سے آئی ہے۔

وہ کھانا' وہ آخری کھانا کس اہتمام سے آیا تھا۔ THE LAST SUPPER اسے بڑے آرٹسٹوں کی تصویریں یاد آئیں۔ مہدی اس کھانے کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوا تھا۔ ''آج کھانا بہت مزے کا ہے امی۔'' اس نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں۔

''ہاں میری جان' سچ کہتے ہو۔'' نرجس نے اسے نوالہ بنا کر دیتے ہوئے نگاہیں جھکا لی تھیں کہ مہدی ان آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے جو پلکوں کی چلمن سے لگے بیٹھے تھے۔

پھر رات ہوگئی۔ مہدی اونگھنے لگا' لیکن نرجس اس سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز سننا چاہتی تھی' وہ اسے تا دیر جگانا چاہتی تھی تا کہ وہ لوگ پو پھٹنے سے پہلے جب اسے لینے آئیں تو وہ میٹھی نیند سو رہا ہو۔

نرجس نے اس کی روشن آنکھوں کو دیکھا' اس کے خوبصورت ماتھے کو دیکھا' یہ حسین کی آنکھیں تھیں' یہ حسین کا ماتھا تھا۔ اس بدن سے حسین کی خوشبو پھوٹتی تھی۔ حسن کی' زندگی کی' امید کی خوشبو' حسین اب جبکہ تم کہیں نہیں ہو تو کیا اب بھی تم کہیں رہتے ہو؟ زمین و آسمان کے درمیان' اس کے لہو میں بھنور پڑنے لگے۔ اس نے مہدی کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا۔

''بہت جور کی نیند آ رہی ہے امی۔'' مہدی نے فریاد کی۔

''میری جان' بس ابھی کچھ دیر میں سو جانا' مجھ سے تھوڑی سی باتیں اور کرلو۔'' نرجس کی آواز لرزنے لگی۔''کل صبح تمہیں ممّا اپنے گھر لے جائیں گے۔ وہ تمہیں کہانیاں سنائیں گے' بازار لے کر جائیں گے' جاؤ گے نا؟''

''سچ امی؟ ہمارے ساتھ آپ بھی بجار چلیں گی نا؟'' مہدی نیند کو بھول کر اٹھ بیٹھا۔

''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی بیٹے۔''

''تو کیا آپ اسی گھر میں رہیں گی؟''

''نہیں بیٹے' میں تمہارے لئے تتلیاں ڈھونڈنے جاؤں گی۔''

راہداری میں آہٹ ہوئی' نرجس نے سر اٹھا کر دیکھا' وارڈن مریم سلاخیں تھامے ان دونوں کو دیکھ رہ تھی۔

''امی کل تتلیاں ڈھونڈنے جائیں گی۔'' مہدی نے خوش ہوکر مریم کو بتایا۔ اس نے تتلیاں دیکھی نہیں تھیں لیکن امی نے اسے تتلیوں کی بہت سی کہانیاں سنائی تھیں۔

''ہاں راجا۔ امی سے خوب باتیں کرلو' خوب پیار کرلو۔'' مریم کی آواز ٹوٹنے لگی اور وہ جلدی سے مڑ گئی۔

''آپ شام تک تو آ جائیں گی نا؟''

''نہیں مہدی' تتلیاں بہت تیز اڑتی ہیں' میں انہیں ڈھونڈنے نکلوں گی تو بہت دور چلی جاؤں گی۔''

''آپ کون سی تتلی ڈھونڈیں گی؟''

نرجس ایک لمحے کے لئے رکی۔''آزادی کی تتلی میری جان۔'' اس نے بیٹے کے بال چوم لئے۔

''وہ کس رنگ کی ہوتی ہے؟''

''اس میں دھنک کے ساتوں رنگ ہوتے ہیں۔''

''دھنک کیسی ہوتی ہے؟''

''اس بار جب مینہ برسے تو مما سے کہنا وہ تمہیں دھنک دکھا دیں گے۔''
''پھر میں بھی دھنک تتلیاں ڈھونڈوں گا۔''
نہیں میری جان' دھنک تتلیاں تمہارے پاس آپ سے آپ آ جائیں گی۔ ہم اسی لئے تو انہیں ڈھونڈنے نکلے ہیں کہ تمہیں ہماری طرح سفر نہ کرنا پڑے۔'' نرجس کا بدن لرزنے لگا۔ وہ دیوانہ وار اس کی بے داغ گردن چومنے لگی۔ اس ایک ہفتے کے دوران اس کی آنکھوں سے پہلی مرتبہ آنسو گر رہے تھے۔

مہدی سو گیا تو نرجس نے اسے اٹھا کر اپنے سینے پر لٹا لیا۔ مہدی کے وجود میں امید کا پودا نمو پا رہا تھا اور اسی امید نے اس کے سینے میں حوصلے کے پہاڑ رکھ دیئے تھے۔ اسے آنے والے زمانوں میں زندہ رہنے کی بشارت دی تھی۔

آس پاس کی بیرکوں سے آیتیں پڑھنے اور کلمہ دہرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی عورت بڑی خوش الحانی سے سورۃ رحمٰن کی تلاوت کر رہی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ آج بی بی رخصت ہونے والی ہے اور یہ اسی کی رخصت کی تیاریاں تھیں۔

اس کے سینے میں کسی نے برچھی ماری۔ بھیا جیل کے صدر دروازے کے سامنے خاک پر بیٹھا ہوگا۔ اس نے جب شماریات میں ایم ایس کیا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کبھی وہ آپا کی زندگی کی ساعتوں کو شمار کرے گا اور بالکل تنہا ہوگا۔

چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے چک پھیریاں کھانے لگے۔ مہربان اور نامہربان چہرے۔ اجنبی اور آشنا آوازیں۔ نرجس کو ان آوازوں پر بے ساختہ پیار آیا جو اس کا آخری سفر آسان کرنے کے لئے اپنی نیندیں قربان کر رہی تھیں۔ ایک ہفتہ پہلے تک وہ ان آوازوں کے ساتھ تھی لیکن یہ آوازیں اسے ذرا بھی نہیں سمجھتی تھیں۔ اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھیں۔

جس دن رحم کی اپیل کی مدت ختم ہوئی اور اطلاع آئی کہ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل اسے بیرک سے پھانسی گھر منتقل کرنے کے لئے آ رہے ہیں تو ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ اور مہدی بیرک سے رخصت ہوئے تو اس نے بعض عورتوں کو چپکے چپکے آنسو

پونچھتے اور چہرے جھکاتے دیکھا۔ یہ وہ عورتیں تھیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو گالیاں دیتی تھیں۔ گریبان تار تار کرتی تھیں اور جنہیں علیحدہ کرنے کے لئے میٹرن اور وارڈن کو بید کا آزادانہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔

نرجس کو نیند کا جھونکا چھو کر گزرا۔ اس کا دل اینٹھنے لگا۔ مہدی کا دل اس کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اس ننھے سے دل کا دھڑکتے رہنا ہی موت کے سامنے اس کی سب سے بڑی جیت تھی۔ وہ اپنے بعد بھی رہے گی' لیکن روح کیا تھی اور اگر تھی تو بدن سے نکل کر کہاں قیام کرتی تھی؟ حسین کہاں تھا؟ کہیں بھی نہیں۔ سب کچھ فنا ہو گیا تھا۔ فنا کا مطلب کیا ہے؟ لغوی طور پر اسے معلوم تھا' لیکن حواس خمسہ کی سطح پر بس معلوم ہونے ہی والا تھا۔

''بی بی۔'' مریم نے سلاخوں کے پاس آکر دھیرے سے اسے آواز دی۔

''ہاں مریم؟''

''راجا کو بستر پر لٹا دو بی بی۔' وہ لوگ آ رہے ہیں۔'' مریم کی آواز تڑخنے لگی۔

ایک لمحے کے لئے نرجس کو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر سنبھل کر اس نے کروٹ لی اور سینے سے لپٹے ہوئے مہدی کو بستر پر لٹا دیا۔ اسے بھلا میری صورت کیا یاد رہے گی۔ اس کے لئے تو میں محض ایک نام' ایک خیال رہوں گی۔

''ساری خطائیں معاف کر دینا بی بی' ہم روٹی اسی کی کھاتے ہیں' پیٹ بڑا بدکار ہے بی بی۔'' مریم سلاخوں سے سر ٹکا کر بلکنے لگی۔ نرجس نے چارپائی سے اتر کر دونوں ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالے اور اور مریم کا شانہ تھام لیا۔ لفظ بیکار تھے۔ بھاری قدموں کی چاپ قریب آئی تو نرجس نے مریم کا بازو تھپ تھپایا۔ اس نے سر اٹھا کر لبریز آنکھوں سے نرجس کو دیکھا۔ سفید ململ کے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور اٹن شن کھڑی ہو گئی۔

مریم نے تالے میں چابی گھمائی اور پھر جس قدر آہستگی سے ممکن تھا دروازہ کھول دیا۔

آہنی دروازے کو سپرنٹنڈنٹ جیل نے دھکا دیا تو دیوار سے ٹکرا کر آواز ہوئی۔

''صاحب جی بچہ سو رہا ہے' جگ نہ جائے۔'' وارڈن مریم نے حدِ ادب کو عبور کرتے ہوئے آنے والوں کو لجاجت سے یاد دلایا۔

''اچھا بک بک مت کرو بڑی آئی بچے کی گی۔'' سپرنٹنڈنٹ نے اس کو تیز آواز میں جھڑکا۔

"SIR. I REQUEST YOU NOT TO TALK LOUDLY"

نوجوان مجسٹریٹ نے ایک نظر سوئے ہوئے مہدی پر ڈالی اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

سپرنٹنڈنٹ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ یہ نوجوان افسر اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا منہ کڑوا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے ضابطے کی کارروائی شروع کر دی۔ اس نے پہلے نرجس کو شناخت کیا پھر ایک کاغذ کھول کر دفتری لہجے میں اس کی عبارت بہ آواز بلند پڑھنے لگا۔ یہ کاغذ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہو کر اس مفہوم پر ختم ہوا۔ ''مجرمہ کے گلے میں پھانسی کا پھندا اس وقت تک پڑا رہے جب تک کہ اس کا دم نہ نکل جائے۔''

میڈیکل افسر نے آگے بڑھ کر نرجس کی نبض دیکھی' دل کی دھڑکن سنی اور آہستہ سے سر ہلا دیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے اس سے چند کاغذوں پر دستخط کرائے۔ نوجوان مجسٹریٹ نے ان دستخطوں کی تصدیق کی اور سپرنٹنڈنٹ کوٹھڑی سے نکل گیا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے وارڈن مریم کو اشارہ کیا۔ وہ اندر آئی۔ اس کا چہرہ جیسے کانسی میں ڈھل گیا تھا۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ نرجس کے دونوں ہاتھ تھام کر پشت پر لے گئی اور انہیں چمڑے کے تسمے سے باندھنے لگی۔ نرجس نے اس کی انگلیوں کی لرزش اور نرمی کو محسوس کیا۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ باہر بہت سے لوگ تھے' اندر بھی بہت سے لوگ تھے۔ تمام بیرکوں پر اس وقت رائفل برداروں کا پہرہ ہوگا۔ صدر دروازے پر بارہ وارڈنوں کی ایک پلٹن تعینات ہو چکی ہوگی۔ ان سب کی رائفلوں میں دس دس گولیاں ہوں گی اور انہی کے مقابل خاک پر بھیا بیٹھا ہوگا۔

مہدی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ میٹرن کے اشارے پر مریم نے اس کا بازو تھاما۔ ''چلو بی بی۔''

وہ ایک قدم بڑھی' پھر پلٹ کر اس نے مہدی کو دیکھا۔ وہ کلبلا رہا تھا۔ سسکیاں لے رہا تھا۔ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ نرجس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ آنکھوں کی دہلیز تک آنے والے آنسوؤں کو اس نے بہ جبر دھکیلا۔ وہ ان لوگوں کے سامنے تھی جنہوں نے اس کے اور اس جیسے دوسروں کے حوصلوں کو شکست دینے کی تمام کوششیں کی تھیں' لیکن وہ ان سے ہاری نہیں تھی تو اب آخری لمحوں میں انہیں فتح مندی کے ذائقے سے آشنا کیوں کرے؟

نوجوان مجسٹریٹ کی نگاہوں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ''بچہ کہاں رہے گا؟'' اس نے میٹرن سے پوچھا۔

نرجس کے سینے پر گھونسا لگا۔ بھیا کو اس نے کس امتحان میں ڈال دیا تھا۔

مجسٹریٹ کی پیشانی پر شکن تھی۔ اس نے نرجس پر ایک گہری نظر ڈالی پھر راہداری میں کھڑی ہوئی ایک وارڈن کو آواز دی۔

''جی صاحب۔'' وارڈن اندر آ گئی۔

''بچے کو گود میں اٹھا لو۔ ذرا احتیاط سے''

''صاحب جی' میں اٹھالوں۔'' مریم کی آواز سراپا التجا تھی۔

''چلو تم ہی سہی' اس بی بی کے ساتھ لے کر چلو۔''

''لیکن یہ تو جیل مینول کے......'' ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے مداخلت کرنی چاہی۔

"TO HELL WITH THE JAIL MANNUAL"

نوجوان مجسٹریٹ نے کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ مریم نے آگے بڑھ کر مہدی کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ وہ کلبلایا اور پھر گہری نیند میں چلا گیا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی سرکردگی میں قافلہ روانہ ہوا۔ دو سپاہی آگے چل رہے تھے اور دو پیچھے۔ درمیان میں وہ تھی اور اس کے دائیں مریم اور بائیں دوسری وارڈن چل رہی تھی۔ چلتے ہوئے نرجس کی نگاہیں مہدی پر جمی ہوئی تھیں۔

باہر مئی کے مہینے کی رات میں پو پھٹنے سے پہلے کی خوشگوار خنکی رچی ہوئی تھی۔ ڈھ بجے

ہوئے چاند کی روشنی میں اس نے تختہ دار کو دیکھا۔ سیڑھیاں اسے نظر آ رہی تھیں۔ موت پاتال میں اترنے کا نام ہے۔ اس پاتال میں اترنے کے لئے سیڑھیاں کیوں چڑھنی پڑتی ہیں؟ اسے جلاد نظر آیا۔ آج اس کے بچے کتنے خوش ہوں گے' باپ کو آج پھانسی بھتہ ملے گا۔ دس روپے' دس روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ ان روپوں سے کئی چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔ نرجس کا ذہن بھٹک رہا تھا۔ لیکن اس کے پیروں میں کوئی لرزش نہ تھی۔ اچانک وہ رک گئی۔ ''مریم۔'' اس کی آواز سناٹے میں بجلی کی طرح چمکی۔

''حکم بی بی۔'' وارڈن مریم کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ جانے کون حاکم تھا اور کون محکوم۔ اس نے مریم کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ مریم اس کے سامنے جھک گئی۔ پشت پر بندھے ہوئے نرجس کے دونوں ہاتھ مہدی کو چھونے کے لئے پھڑ کے پھر اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ مہدی نیند میں ہنس رہا تھا۔ شاید پریوں سے کھیل رہا تھا۔ نرجس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے زندگی کو دیکھا پھر آہستہ سے جھک کر اس کا ماتھا چوما۔ رخسار چومے' زندگی' زندگی سے رخصت ہو رہی تھی۔

وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تختۂ دار پر پہنچی تو سرکاری جلاد اس کے قدموں میں جھکا اور تسمے سے پیر باندھنے لگا۔ نرجس نے اوجھل ہوتے منظر پر ایک نظر ڈالی پھر اسے بھی اپنے اندر رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور منظر اس کے اندر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چاند ڈوب رہا ہے۔ صبح کا ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔ مہدی پریوں سے کھیل رہا ہے۔ سورج کا ظہور ہونے والا ہے اور اللہ کے بابرکت نام سے شروع ہونے والے حکم نامے پر عملدرآمد کا وقت آ پہنچا ہے۔

○○

جسم و زباں کی موت سے پہلے

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اندھیرے ڈھول کے اندر تھا اور ڈھول بے طرح پیٹا جا رہا تھا۔

کیا آنکھ واقعی کھل گئی تھی؟

آنکھ کھلتے ہی روشنی بھی ساتھ چلی آتی ہے جبکہ وہاں روشنی کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس کی کنپٹیاں ڈھول کی آواز کے ساتھ ساتھ پھڑکنے لگیں۔ تیز اور تیز۔ اس نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونسنا چاہیں' لیکن کانوں کے سوراخ چھوٹے ہو گئے تھے۔ انگلیاں لکڑیوں میں بدل گئی تھیں۔

اس نے سر کو جھٹکا۔ ''نہیں...... یہ انگلیاں ہیں۔ میری انگلیاں۔''

کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ''انگلیاں تو لکھتی ہیں' رنگ بھرتی ہیں۔ یہ لکڑیاں ہیں جو کاٹی جاتی ہیں' کھائی جاتی ہیں۔''

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ لکڑیاں ہوتیں تو کب کی کھائی جاتیں۔ یہ انگلیاں ہیں۔'' اس نے اپنی انگلیوں کو لہرایا۔ پھر بے تابی سے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلوں سے ٹٹولا اور خود کو تسلی دی۔ وہ لرز رہی تھیں۔ اس نے ان کی لرزش کو محسوس کیا۔

گھر کے پچھواڑے جو باڑی تھی' اس میں لکڑیوں کی ایک بیل تھی۔ گرمیوں کی دوپہروں میں جب وہ گھونسلوں سے انڈے نکالنے کے لئے اور انہیں رنگ کر پھر سے

گھونسلوں میں رکھنے کے لئے پیڑوں پر چڑھتا اور اس کی نظر ککڑیوں کی بیل پر پڑتی تو اس سے لٹکتی ہوئی ککڑیاں ہوا سے ہولے ہولے لرزتی ہوئی نظر آتیں۔ سینکڑوں انگلیاں جو اسے اشارے سے منع کرتیں۔ ''یہ نہ کرنا' یہ نہ کرنا۔''

اماں کی آواز کانوں تک آئی۔ ''میاں ہم نے تو تمہیں بہت سمجھایا تھا۔'' اس کی آنکھوں میں سائے سے لہرائے۔ اس نے سسکی لی۔ ''آپ یقین کریں اماں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو بس پیڑ پر چڑھا تھا۔''

وہ پیڑ پر کیوں چڑھا تھا؟ وہاں کوئی گھونسلا تو نہ تھا۔ گھونسلے میں انڈے نہ تھے' وہاں تو بس سر تھے اور سروں میں سفید و سیاہ خواب تھے۔ اڑے اڑے سے مٹے مٹے سے۔ اس نے انہیں امید کے رنگوں میں رنگنا چاہا تھا۔ بلیک اینڈ وائٹ کی نسبت رنگین تصویریں تو سب ہی کو اچھی لگتی ہیں۔ تو پھر رنگین خواب کیوں اچھے نہیں لگیں گے؟

تیز ہوا شور مچاتی ہوئی چلتی ہے۔ اسی لئے ککڑیاں لرزتی ہیں۔ سیکڑوں' ہزاروں ککڑیاں' ان کی ہلتی ہوئی انگلیاں مجھے منع کرتی ہیں۔ ''یہ مت کرو۔ یہ مت کرو۔'' لیکن نہیں۔ وہ انگلیاں نہیں ککڑیاں ہوتی ہیں۔ RAW VEGETABLE۔ جو کھانے کے ساتھ ہی نہیں' کھانے کے بغیر بھی کھائی جاتی ہیں۔

"BUT WHEN PEOPLE BECOME VEGETABLE"

کس قدر فضول بات ہے۔ جب آلو' بینگن یا ٹماٹر انسان نہیں ہو سکتے تو انسان سبزی میں کیسے بدل سکتے ہیں؟

سر ہنڈولے میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ رہٹ میں بٹھا دیا گیا۔ رہٹ تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ اوپر آ رہا تھا لیکن کنواں خالی تھا۔ اور ڈھول کی آواز کنویں کے اندر بھی آ رہی تھی۔

ہنڈولے میں بیٹھے ہوئے سر کو اس نے اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔ انگلیاں چپچپانے لگیں۔ ایک دوسرے سے چپکنے لگیں' اس نے حیرت سے اپنی انگلیوں کو چکھا۔ وہ شاید نمک کی بنی ہوئی تھیں۔

''لیکن نمک میں چپچپاہٹ تو نہیں ہوتی؟'' اس کے ذہن نے ایک دم سوال کیا۔

سوال...... !

گھنٹوں' دنوں یا صدیوں بعد اس کا ذہن کوئی سوال قائم کر سکا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ابھی وہ زندہ تھا' گردن پر رکھے ہوئے سر میں ذہن ابھی دھڑک رہا تھا وہ سوچ سکتا تھا۔ ڈھول کی آواز پور پور میں چیخ رہی تھی۔ پھر بھی ذہن سوال کر سکتا تھا۔

سوال کر سکنا؟

"TO QUESTION"

ذہن کا وہ ستون جس پر انسان اور انسانیت قائم ہے۔

اب وہ ڈھول کے اندر لیٹا نہیں' بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کان ڈھول کے فرش سے دور تھے۔ شور اس سے ایک یا دو سینٹی میٹر دور ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی چپچی انگلیوں کو منہ میں لیا تو شدید بھوک کا احساس ہوا۔ چاول اور دال کا آخری لقمہ...... کھانے کے بعد وہ اسی طرح انگلیاں چاٹتا تھا۔

اور تب سچ اس پر صبح کی طرح طلوع ہوا۔

اس کی انگلیاں خون آلود تھیں۔

شور پر خون کا ذائقہ غالب آ گیا۔ یہ اس کا اپنا خون تھا۔ اس نے اپنے خون کا نمک چکھ لیا تھا۔

''تو کیا میں سلجوقیوں کے عہد کا ''چاشنا گیر باشی'' ہوں؟ پھر مجھ سے بڑا چکھنے والا کون ہو گا کہ جس نے اپنے خون کا نمک چکھا۔'' اس کے سوئے ہوئے حواس آنکھیں ملنے لگے۔

''ارے کم بخت اتنا نمک کیوں جھونک دیا ہے؟'' اماں انجم کو پھنکار رہی تھیں۔

ان کی آواز سنتے ہی بھوک نے اس کی انتڑیوں کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔

''اماں بہت زور کی بھوک لگی ہے۔'' اس نے انہیں آواز دی۔ ''دال چاول پر اچار کی پھانک رکھ دیں۔ چاول گرم ہوں تو ذرا سا گھی بھی......'' تاریک اندھیرے میں ذائقے

لہرائے اور منہ ان سے بھر گیا۔
''کس قدر نیند آ رہی ہے۔'' اس نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی۔
''جانے انجم کہاں رہ گئی۔ شاید میرے اونگھتے ہی وہ سینی رکھ گئی۔'' اس نے اپنی کپکپاتی ہوئی نمکین انگلیوں سے فرش پر سینی کو ٹٹولا۔
فرش کھردرا تھا۔ سیلن زدہ تھا اور خالی تھا۔
خالی فرش۔ نے اسے سب کچھ یاد دلا دیا جیسے تاریک کمرے میں کوئی ماچس کی تیلی جلائے اور لمحے بھر کے لئے سارا کمرہ روشن ہو جائے۔
اماں نہیں تھیں' انجم نہیں تھیں ...... گرم چاولوں کے اوپر رکھا نرمی سے پگھلتا ہوا زرد اور دانے دار گھی' آم کے اچار کی سیاہی مائل پھانک اور ٹھنڈے پانی سے چھلکتا ہوا چاندی کا کٹورا نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ سراب دھوپ سے تپتے ہوئے صحرا میں ہی نہیں' اندھی کوٹھریوں میں بھی نظر آتے ہیں۔
یہ اس کی کوٹھری تھی۔
وہ اس میں تنہا تھا۔
نہیں' تنہا کیوں تھا۔؟
اس کے ساتھ اس کی پیاس تھی' بھوک تھی' اس کا بدن تھا جس میں اب اس کی بجائے درد رہتا تھا۔ وہ سمٹ سمٹا کر بس سر میں چلا گیا تھا اور کبھی کبھی تو اسے گمان گزرتا تھا کہ شاید وہ اپنے سر میں بھی نہیں رہتا۔
وہ تنہا تو نہ تھا' ایک ہجوم میں تھا' اپنے سنگی ساتھیوں میں گھرا ہوا' یہ زخم ہے۔ یہ جلن ہے۔ یہ خراش ہے۔ یہ سوجن ہے اور سب سے آگے درد ہے۔
نفیری بجاتا ہوا' اپنے ہونے کا اعلان کرتا ہوا۔
وہ اسے ایک بار پھر کوٹھری میں پھینک گئے تھے اور اب اپنے بھاری بوٹوں سے کوٹھری کی کھوکھلی چھت پر کود رہے تھے۔ نچلی منزل سے کوٹھری کے کھوکھلے فرش پر ڈنڈے مار رہے تھے۔ دھپ دھپ' ٹھک ٹھک' ناقابل برداشت شور چھت سے برس رہا تھا۔ فرش سے ابل

رہا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سمیٹا اور گٹھری بن گیا۔ سوچے ہوئے گھٹنوں نے اس کے کانوں کو ڈھانپ لیا۔ شور اب ایک اور سینٹی میٹر دور ہو گیا تھا۔

بدن کا ہر مسام کان بن جائے اور آواز کا مطلب ہی صرف شور ہو تو ایک سینٹی میٹر کی دوری بھی بہت ہوتی ہے۔ آرام' درد' سناٹا' شور۔ یہ سب اضافی ہیں۔ چھت پر کودنے والے اگر دو منٹ کے لئے اپنے کودنے کی رفتار دھیمی کر دیں تو شور کے تسلسل میں دو منٹ کی یہ کمی' سکون کی دو صدیاں ہیں۔

دونوں ہاتھوں کو موڑ کر پشت پر باندھ دیا گیا ہو اور بدن پر چلتے ہوئے کاکروچ کو ہٹانا ممکن نہ ہو۔ ہونٹوں کے کناروں سے بہہ نکلنے والی رال اور خون کو چاٹنے والی مکھیاں اڑائی نہ جا سکتی ہوں۔ پھر چوبیس گھنٹوں بعد مڑے ہوئے ہاتھ کھول کر انہیں سامنے کی طرف کر کے ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں تو کتنا بڑا عیش ہے۔ بغلوں کے نرم گوشت میں پاروؤں کی مچھلیوں میں رہ رہ کر کیسا آرام بچھتا ہے۔ مکھیاں اڑائی جا سکتی ہیں۔ لمبی لمبی مونچھوں اور بڑے بڑے ٹانگروں والے کاکروچ کو انگوٹھے اور مشتری کی انگلی کی ہلکی سی چوٹ سے جھٹکا جا سکتا ہے۔

جانے کتنی صدیاں وہ گھٹنوں سے اپنے کان ڈھانپے بیٹھا رہا۔ ریڑھ کی ہڈی کمان ہو گئی تھی۔ پھر اچانک ہی شور مچاتا ہوا ڈھول صرف اندھیری کوٹھری رہ گیا۔ کھوکھلی چھت پر کودنے والے اور کھوکھلے فرش کو ڈنڈوں سے پیٹنے والے چلے گئے تھے۔ ہر طرف وہ مہیب سناٹا تھا جو کائنات کی تخلیق سے پہلے رہا ہو گا۔

وہ اب ٹھیک تھا۔ مربوط انداز میں سوچ سکتا تھا۔ شور نہ ہو تو بھوک' پیاس اور درد سب سے نمٹا جا سکتا ہے۔

''یہ جو چلے گئے ہیں' تو ان کی ڈیوٹی ختم ہو گئی ہو گی۔ تھک گئے ہونگے۔ کود کود کر' اب اپنے گھروں میں جا کر آرام کریں گے۔''

اسے اپنا گھر یاد آیا۔ نیم کے پیڑ کی چھاؤں سے بھرا ہوا آنگن' موگرے' بیلے' مدھومالتی

اور چمپا سے مہکتی ہوئی کیاریاں۔

ذہن پر اپنی یادوں کے رنگ چھوڑ کر' گھر کسی تتلی کی طرح اس کی پہنچ سے دور ہو گیا تھا۔ جو چیزیں پہنچ میں نہ رہیں وہ کس قدر قیمتی ہو جاتی ہیں۔ اس نے گہری سانس لی اور مسکرانا چاہا' لیکن کٹی ہوئی باچھوں میں چرچراہٹ ہونے لگی۔

کچھ دیر بعد دوسرے آ جائیں گے۔ وہ تازہ دم ہوں گے۔ شور بھی تازہ دم ہو جائے گا۔ مجھے سوچنا چاہئے' ذہن کو کام کرنا چاہئے۔ وہ کہیں سوچنا بھول نہ جائے' مجھے مربوط باتیں سوچنا چاہئیں۔ ایک خیال دوسرے خیال سے جڑا ہوا۔ ایک یاد' دوسری یاد سے لپٹی ہوئی۔

وہ ہمت کر کے اٹھا تو پیروں کی بیڑیاں بج اٹھیں۔ اس نے سنبھل سنبھل کر چلنا شروع کیا۔ چار قدم چوڑائی' چھ قدم لمبائی' اندھیرے میں چلتے ہوئے قدم گننا ضروری ہے ورنہ سر دیوار سے ٹکرا جاتا ہے۔

بدن کا ایک ایک جوڑ اور گوشت کا ایک ایک ریزہ فریاد کر رہا تھا۔ وہ چند ہی منٹ میں تھک گیا اور پہلو کے بل دراز ہو گیا۔ بدن لیٹ گیا اور ذہن نے یوگیوں کی طرح آسن جمایا۔

وہ بدن کے راستے ذہن کو توڑنا چاہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ جس ذہن میں یقین اور ارادہ رہتا ہو وہ ذہن' بدن سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس کا راستہ الگ ہوتا ہے' بدن کی اپنی محدودات ہوتی ہیں۔ ون' ٹو' تھری...... ون' ٹو' تھری..... بدن کو حرکت دیتے رہو' ذہن سے سوچتے رہو' زندہ رہنے کے لئے' معاملات پر ذہن مرتکز کرنے کے لئے۔

وہ مجھے یہاں لائے تھے۔

جانے کب لائے تھے۔

اسے یاد رہتا بھی تو کیسے؟

وہ کہاں کہاں نہیں پھرایا گیا تھا۔ ایک حوالات سے دوسری حوالات۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری۔ ایک کوٹھری وہ تھی جو دائرہ نما تھی اور جس میں

رہنے کے چند دنوں بعد ہی وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ سیدھا کھڑا ہو سکے۔ کھڑے ہوتے ہی اسے چکر آنے لگتے اور ایک کوٹھری وہ تھی جو اس کے قد سے آدھی تھی۔ جیسے کوئی سگ خانہ ہو۔ اس میں وہ ہفتوں چاروں ہاتھ پیروں پر چند قدم چلتا تھا اور پھر دیواریں اس کا راستہ روک لیتی تھیں جو اتنی تنگ تھی کہ اس میں پیر پھیلا کر سویا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

وہ اسے کہاں کہاں نہیں لے گئے تھے؟

یہ بات تو ان کی سمجھ میں بہت دیر سے آئی تھی کہ وہ ''شہزادہ'' ہے اور شہزادے محلوں اور قلعوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ محل اب نہیں رہے تھے۔ سو وہ اسے ''شاہی قلعے'' میں لے آئے تھے کہ یہی اس کے شایان شان تھا۔

انہوں نے جب اسے اپنی تحویل میں لیا تو سب سے پہلے اس کی گھڑی اتار لی تھی۔ گھڑی چلتی بھی رہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آمروں کے بنوائے ہوئے قید خانے ہوں یا بادشاہوں کے تعمیر کروائے ہوئے قلعے اور ان قلعوں کے تہہ خانے ہوں جن میں ہوا تک نہ آتی ہو تو روشنی کی کرن کہاں سے آئے گی کہ دن اور رات کا حساب رکھا جا سکے۔ صبح کے پانچ بجے اور شام کے چھ بجے میں فرق کیا جا سکے۔

اس قلعے میں خواب نہیں دیکھے جا سکتے تھے۔ یہاں وہ شہزادیاں حاشیہ خیال میں نہیں آتی تھیں جن کے اشارۂ ابرو سے ہر زنجیر پگھل جائے۔ اور زیرِ زمین غلام گردشوں میں لگے ہوئے میخوں جڑے دروازے اور آہنی قفل خوابوں میں کھل جائیں۔

یہاں وہ غلام تھے جو آقا بن بیٹھے تھے۔ وہ خواجہ سرا تھے، جنہیں اس بات پر اصرار تھا کہ وہ آختہ نہیں کیے گئے اور جو کہانیوں کے دم کٹے لومڑ کی طرح ہر وقت اس تاک میں رہتے تھے کہ ان ایسوں کی تعداد میں اضافہ کیسے ہو۔

بدیسی آقا رخصت ہو چکے تھے اور یہ خواجہ سرا ان کی کمال نیابت کر رہے تھے۔ یہ ان بستیوں کے فاتح تھے جن کی حفاظت ان کا روزگار تھی۔ یہ ان نہتوں کے قاتل تھے جن کا یہ نمک کھاتے تھے۔ نوآبادیات کی تجربہ گاہ میں انہیں سکھایا گیا تھا کہ قوموں کے ساتھ زنا بالجبر کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی قوم کو آختہ کرنا ہو تو اس کے بازو،

اس کی پنڈلیاں' اس کے شانے کن مفادات کے تسموں سے باندھے جاتے ہیں۔

بدن پر کاکروچ چلا تو اس نے چٹکی مار کر اسے دوڑا دیا۔ تسموں کے خیال پر اسے یاد آیا کہ کتنے دنوں سے اس نے تسمے نہیں باندھے تھے۔ کس چیز کے تسمے باندھتا؟ اس نے تو جانے کب سے جوتے نہیں پہنے تھے۔ جوتوں کے خیال پر اسے ہنسی آئی اور اس نے پیروں کو جنبش دی۔

اندھیری کوٹھری میں بیڑیوں کی کسمساہٹ گونج گئی۔ بیڑیاں پہننے والے پیروں کو جوتوں کی کیا ضرورت تھی؟

انہوں نے جب اسے پکڑا تب بھی وہ ننگے پیر تھا۔ اس کی آنکھ کسی آواز سے کھلی تھی۔ کوئی بری طرح دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ وہ نیند کا ماتا بوکھلایا ہوا بستر سے اٹھا تھا اور ننگے پیر دروازہ کھولنے چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس آئے تھے۔

وہ اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے' رائفل کے کندوں سے پسلیوں' کمر کے نچلے حصے اور پیٹ پر مارتے ہوئے لے گئے تھے۔ اس کی چپلیں وہیں پلنگ کے نیچے رہ گئی تھیں۔ جوتے بھی کمرے میں ہی چھوٹ گئے تھے۔ جیسے سان تیاگو کے نیشنل اسٹیڈیم میں اسٹوڈیو ناسیونول میں ہزاروں جوتے رہ گئے تھے۔ ان کے پہننے والے چلے گئے تھے۔ ہر سائز کے ہر رنگ کے جوتے' ان کے پہننے والوں میں آٹھ اور نو سال کے بچے تھے' بوڑھے کلرک تھے' مزدور اور شاعر تھے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے کارکن تھے' صحافی اور ادیب اور ان میں وکٹر جارا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اپنی زخمی اور ٹھٹھری ہوئی انگلیوں کا لمس اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ وہ ان انگلیوں سے لکھتا تھا اور وکٹر کی انگلیاں گٹار کے تاروں کو زندہ کرتی تھیں۔ انہیں آواز بخشتی تھیں۔

بستیوں اور شہروں کی حفاظت کرنے والوں اور اس حفاظت کی کمائی کھانے والوں نے اپنے ہی شہروں اور نہتے شہریوں کو جب فتح کیا تو وہ ہزاروں کو کھدیڑ کر اسٹیڈیم میں لے آئے۔ وہ اسٹیڈیم جس میں کھلاڑیوں کی ہنرمندی دیکھی جاتی تھی اور جہاں فاتحوں پر

پھول پھینکے جاتے تھے' اسی میں نہتوں کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا۔ پھر وہ وکٹر جارا کو گھسیٹتے ہوئے اور سنگینیں چبھوتے ہوئے لائے۔

وکٹر کو لانے والے اپنی مدح سننا چاہتے تھے تاکہ اسے معاف کر سکیں۔ لیکن جب اس کے گلے سے ان کے لئے کوئی آواز نہ نکلی تو انہوں نے اسے مارا' اس پر تھوکا' اس کی انگلیاں توڑیں اور پھر بھی جب وہ گونگا رہا تو ایک میز لائی گئی جس پر سفید میز پوش پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میز پر رکھے گئے اور ان ٹوٹی ہوئی انگلیوں کو چاپڑ کی ایک ضرب سے کاٹ دیا گیا۔ جیسے بڑے ہوٹلوں کے باورچی خانوں میں گاجریں' مولیاں اور ککڑیاں کاٹی جاتی ہیں۔ وہ ککڑیاں نہیں انگلیاں تھیں۔ خون بہتا رہا ... سپاہی ہنستے رہے ..... وکٹر جارا ہماری منصف مزاجی کی تم داد کیوں نہیں دیتے ..... ہم نے صرف انگلیاں تراشی ہیں تمہاری ..... ترشی ترشائی ہتھیلیوں سے تالی بجاؤ ..... انگلیاں صرف ان ہاتھوں میں ہونی چاہئیں جو اپنے آقاؤں کو سلامی دیتے ہیں یا ان ہاتھوں پر جو حکمرانوں کی مدح سرائی کرتے ہیں ..... باقی تمام انگلیاں بیکار ہیں ..... انہیں کٹ جانا چاہئے' انہیں کاٹ دیا جانا چاہئے .....

خون بہتا رہا اور وکٹر کی اذیت سے مجروح آواز لبوں سے بہہ کر لوگوں تک پہنچتی رہی ..... آخری نغمہ ..... آخری آواز .....

سب کی نظروں میں موت منجمد ہے۔
فوج اپنا کام بہت سلیقے سے کرتی ہے۔
خون ان کے لئے تمغہ ہے۔
اور قتل عام'
مردانگی اور بہادری کا نشان'

اس نے جلدی سے اپنی انگلیوں کو ٹٹولا۔ وہ موجود تھیں۔ ابھی انہوں نے اس کی انگلیاں نہیں کاٹی تھیں' لیکن کتنے ہی دنوں سے انہوں نے قلم نہیں پکڑا تھا۔
وہ کاٹی نہیں گئی تھیں پھر بھی کٹ گئی تھیں۔

"کہیں میں لکھنا ہی نہ بھول جاؤں۔" اسے خیال آیا اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی بھوکی انتڑیوں میں گرہ لگ گئی۔ اس نے مشتری کی انگلی سے فرش پر اپنا نام لکھنا چاہا۔ لیکن کھردرا فرش اس کی انگلیوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ تب اس نے ہوا میں انگلی گھمائی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اور وہ اپنی انگلی کو ہوا میں حرکت کرتے اور اپنے نام کے دائرے بناتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ناہید نے اپنی چھنگلیا سے اس کے آنسو پونچھے۔ "چھی...... مرد کہیں روتے ہیں۔"

"میں کب رو رہا ہوں۔" اس نے پلکیں پٹپٹائیں۔

"تو کیا ہنس رہے ہو......؟ اچھا آؤ میرا ہاتھ تھام لو۔ میں تمہیں لئے چلتی ہوں۔"

"لیکن یہاں تو آہنی دروازے ہیں۔ دروازوں پر قفل ہیں اور مقفل دروازوں کے باہر پہرے دار ہیں۔" اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ "میں اس اندھیرے گھر میں ہوں جس میں داخل ہونے والا کبھی باہر نہیں نکلتا۔ وہ راستہ جس سے لوٹنے کی کوئی راہ نہیں، وہ مکان جس میں روشنی کا گزر نہیں ہو سکتا اور جہاں دروازوں اور تالوں پر گرد جمی رہتی ہے۔"

وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی کے شیرازی کبوتر اندھیری کوٹھری میں پر مارنے لگے۔ وہ مصریوں کے لئے پرندہ تھی، بونو۔ یونانیوں کے لئے وینس تھی۔ سمیریوں کے لئے عشتار اور فنیقیوں کے لئے عشتروت، اہل فارس اسے ناہید پکارتے تھے۔

"میں عشتار ہوں، تم تموز ہو۔ تم پاتال میں قید ہو اور میں تمہیں لینے کے لئے آئی ہوں۔" ایک روشن ہاتھ اندھیرے میں تیرتا ہوا اس تک آیا اور اس نے روشنی کو تھام لیا۔

ہاں وہ ناہید تھی، زہرہ تھی، شام کا پہلا تارا تھی، ستارۂ سحر تھی۔ وہ سمیری میں زب اور اکادی میں دلبت تھی۔ آسمانوں کی ملکہ تھی، اوشا تھی، اناہیت تھی، افزائش کی دیوی تھی۔ اشور و عشتر تھی...... وہ زندگی تھی، وہ صبح کا اجالا تھی۔

اس کی پرجلال آواز اندھیرے میں مشعل کی طرح بھڑکی۔ وہ پہرے داروں اور ان کے آقاؤں سے مخاطب تھی۔

"پھاٹک کھولو ورنہ میں دروازوں کو توڑ دوں گی۔

ان کی چولیں اکھاڑ دوں گی۔
اور مردوں کو زندہ کر دوں گی۔
یہاں تک کہ ان کی تعداد زندوں سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔''
وہ اسے لے کر تیرتی ہوئی چلی۔ بند دروازہ موم کی طرح پگھلنے لگا۔ پگھلتے ہوئے موم کو دیکھ کر وہ لحظے بھر کے لئے ٹھٹکا اور اسی لحظے روشنی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ ناہید غروب ہوگئی۔ وہ دیوار سے سر ٹکرانے لگا' ہچکیوں سے رونے لگا۔
کوٹھری کی دیواروں سے شور پھوٹنے لگا۔ اس مرتبہ شور مچانے والے انسان نہیں تھے۔ ان کی بنائی ہوئی مشینیں تھیں' دیواریں چیخ رہی تھیں۔ ہذیانی انداز میں ان سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کراہنے والوں کی' مرنے والوں کی' عالم وحشت میں ہنسنے والوں کی' اذیت کی شدت سے حیوان بن جانے والوں کی۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا چاہیں لیکن انگلیاں کہاں تھیں؟ اس کے پاس تو بس لکڑیاں تھیں۔ شیطان اس کے کانوں کے راستے اس کے ذہن میں ہنس رہا تھا۔ سوچنے کے عمل کو اپنی ایڑیوں سے کچل رہا تھا۔
وہ شور کے سمندر میں مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔'' میں تم سے اونچی آواز میں چیخ سکتا ہوں۔ شور مچا سکتا ہوں'' وہ زور زور سے چیخنے لگا' قہقہے مارنے لگا۔ اس کا سوکھا ہوا حلق' ہرن کی دھوپ کھائی ہوئی کچی کھال کی طرح تڑخنے لگا۔
پہلی ٹھوکر اس کی دائیں پسلی پر پڑی اور دوسری اس کی بائیں پنڈلی پر' وہ چونک گیا۔ دیواریں خاموش تھیں اور جانے کب سے خاموش تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کوٹھری میں اس قدر تیز روشنی تھی کہ اس کی آنکھیں جو اب اندھیرے میں رہتی تھیں اس روشنی میں چندھیانے لگیں۔
''اسے اٹھاؤ'' ایک تحکمانہ آواز گونجی۔ یہ ان مہیب سایوں میں سے کسی ایک کی تھی جو دیوار پر بن اور بگڑ رہے تھے۔
اسے اٹھا لیا گیا۔ وہ اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹ رہے تھے۔ پیروں میں پڑا ہوا ڈنڈا جو بیڑیوں سے منسلک تھا۔ اس کے گھسیٹے جانے میں آڑے آ رہا

تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے سننے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آیا۔ وہ اتنے دنوں سے ڈھول کے اندر تھا کہ اس کے کان کند ہو گئے تھے۔

اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ ''صبح جب آئے گی، جب بھی آئے تو کیا میں ناہید کی سرگوشیاں سن سکوں گا؟'' ناہید کے نام نے بے پناہ تنہائی اور خوف کے عالم میں کتنی ہی مرتبہ اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس وقت بھی وہ ذہن کے افق پر ستارے کی طرح دمک رہی تھی۔

وہ اسے گھسیٹتے ہوئے چلتے رہے۔ ان دنوں وہ ایک چھوٹی سی عمارت میں تھا جو حال ہی میں تعمیر کی گئی تھی۔ اور جس میں اذیت رسانوں کو وہ تمام جدید سہولتیں فراہم کی گئی تھیں جن سے پرانے شہنشاہ ناواقف تھے۔

وہ چلتا رہا۔ تازہ ہوا کی خوشبو آہستہ آہستہ قریب آتی رہی۔ اس نے کسی بھڑکے ہوئے جانور کی طرح چہرہ قدرے اوپر اٹھا کر گہری سانسیں لیں۔ نتھنوں پر ہوا کی خنکی اور سرسراہٹ کو محسوس کیا۔ پو پھٹنے والی تھی۔ ہوا کے بہنے کا یہ انداز اور یہ خنکی پو پھٹنے سے ذرا ہی پہلے کی تھی۔

انہوں نے اسے ایک بڑے ٹھنڈے، روشن اور پُر آسائش کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ سامنے ایک بڑی میز بچھی تھی۔ جس پر سبز کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ اسے وہ میز یاد آئی جو وکٹر جارا کی انگلیوں کے لئے لائی گئی تھی۔ اس پر سفید میز پوش تھا۔

اس نے سبز میز کو غور سے دیکھا۔ اس پر چند فائلیں تھیں۔ تھرماس تھا، روشنی میں ہیرے کی طرح جگمگاتا ہوا گلاس تھا۔ پیاس اس گلاس میں رہتی تھی یا اس کے حلق میں؟ ذہن میں ہر چیز گڈمڈ ہونے لگی۔

ہیرے کی طرح دمکتے ہوئے گلاس پر سے اس نے اپنی نگاہوں کو نوچا، ذہن کو سمیٹنے کی کوشش کی اور سامنے دیکھا۔

میز کے پیچھے ایک اونچی کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ اس کے نام سے واقف نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے کہ آج اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے شانے اس کا عہدہ بتا

رہے تھے۔ اماں کہتی تھیں کہ کراماً کاتبین زندگی بھر شانوں پر بیٹھے رہتے ہیں اور انسانی اعمال لکھتے رہتے ہیں۔ کراماً کاتبین تو اسے آج تک نظر نہیں آئے تھے لیکن شانوں پر کڑھے ہوئے اعمال اس نے پہلے بھی بہت دیکھے تھے۔

اسے لے کر آنے والوں نے ایڑی سے ایڑی بجائی اور سامنے والے کو سلامی دی۔ اس نے رعونت سے سر ہلایا اور اپنے قیدی کو دیکھنے لگا۔ وہ اسے نگاہوں میں تول رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے' جیسے ایک دوسرے کے مقابل آنے والے مکہ باز ایک دوسرے کے بارے میں اندازے لگاتے ہیں' پھر وہ کرسی کھسکاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''پانی پیو گے؟'' اس کی آواز ریشم کا لچھا تھی۔

''نہیں۔'' اس کے سوکھے ہوئے' تڑخنے ہوئے' ترسے ہوئے حلق سے اور پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلی' بھاری' پھنسی ہوئی۔

وہ مسکرایا'' ایسی بھی ضد کیا' پانی نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔ تھوڑا سا پی لو۔''

وہ خاموش کھڑا رہا۔

''یقین کرو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تھوڑا سا پانی پی لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو۔

''نہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے تم کب سے پیاسے ہو؟ کتنے وقت سے تم نے کھانا نہیں کھایا؟'' وہ اب میز پر سے اپنا بید اٹھا کر ہتھیلی پر آہستہ آہستہ مار رہا تھا۔ آنکھیں روح کی کھڑکیاں ہوتی ہیں اور ان تمام لوگوں کی روح کی کھڑکیوں سے چھوٹے اور بڑے شیطان جھانکتے تھے۔

''نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔''

''48 گھنٹوں سے تم نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ کچھ نہیں پیا ہے۔ اس طرح تم مر جاؤ گے۔ چند گھونٹ پی لو۔'' اس نے اپنے ماتحتوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔

جسے اشارہ کیا گیا تھا' وہ آگے بڑھا۔ اس نے تھرماس کھولا اور صاف شفاف گلاس قلقل کرتے ہوئے پانی سے بھرنے لگا۔

پانی کی یہ آواز کس قدر شیطانی تھی۔ وہ لرز گیا۔ اس نے دیکھا کہ لمحے بھر کے اندر ہی گلاس کی سطح پر خنکی کی نمی ابھر آئی ہے۔ گرمیوں میں اماں صراحی میں کیوڑا ڈالتی تھیں۔ رات بھر کا اوس کھایا ہوا اور خوشبو دار ٹھنڈا پانی پینے میں سکون بچھا دیتا تھا۔ پیاس اس کے اندر کسی دیوپیکر لہر کی طرح اٹھی۔ وہ TITANIC تھا۔ نہیں! وہ TITANIC نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ گلیوں میں اور کھیتوں میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ سر پر اڑتے ہوئے بادل تھے۔ پیروں کے نیچے دھوپ سے جھلسی ہوئی بھوری زمین تھی۔

''میگھامیا پانی دو۔''

''سیر سوئیا پانی دو۔''

''میگھامیا پانی دو۔''

وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ گلا ملا کر چیخ رہا تھا۔ اس کے حلق میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ گرد اڑ رہی تھی۔ گرد میں آواز کا گرداب تھا۔ تانہر کسی پیاسے کو جانا نہیں ملتا۔

''شاباش۔ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پی لو عباس۔''

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ آج کتنے دنوں کے بعد اس نے اپنا نام سنا تھا۔ ورنہ سب ہی اسے ''تم'' اور ''تو'' کہہ کر پکارتے تھے اور کبھی کبھی تو اسے شک ہونے لگا تھا کہ اس کا پیدائشی نام حرام زادہ ہے۔ انہوں نے اسے ''عباس'' سے THIRD PERSON SINGULAR بنا دیا تھا۔ کوئی اس کے اندر ''ہمکنے'' لگا۔ ''میں ہوں۔ میں موجود ہوں''۔

پانی انڈیلنے والا حکم کی تعمیل میں گلاس اس کی طرف لے کر بڑھا۔ عباس نے سر بلند کیا اور کناروں سے چھلکتے ہوئے پانی کو دیکھا' اس کی نگاہوں میں دریا لہریں مارنے لگا۔ آنکھیں سایوں سے اور سرابوں سے کھیلنے لگیں۔ آوازیں کانوں میں نوحہ خوانی کرنے

لگیں۔ پانی کے لئے خون میں تر ہو گئے عباس   تلوار جب آئی تو سپر ہو گئے عباس ...
BE A GOOD FELLOW AND DRINK IT ایک غلیظ آواز کا ٹکڑا
اسے دریاؤں سے، سیرابیوں سے، تشنہ کامیوں اور نوحہ خوانیوں سے باہر کھینچ لایا۔
عباس نے کپکپا کر اپنی طرف بڑھتے ہوئے گلاس کو دیکھا' پانی کی سطح پر کینچوے تیر رہے تھے۔ کانٹے میں پھنسے ہوئے کینچوے۔ مچھلیوں کو اپنی طرف بلانے کے لئے' اس کے کسی ساتھی نے کینچوے نہیں نگلے تھے۔ اسے ابکائی آنے لگی۔ اس نے گلاس بڑھانے والے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ گلاس فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور پانی فرش پر بہنے لگا۔ ناہید کی آواز کے پرندے اپنے پر کھولنے لگے۔ پیاسے گئے اور نہر سے پیاسے نکل آئے۔
زخموں سے بھری ہوئی پیٹھ پر بید پڑا تو وہ دہرا ہو گیا۔ وہ اپنی حیوانی چیخیں اور کراہیں سنتا رہا۔
''کتے تو ہمیں بھوکانا چاہتا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ تیرا مقدمہ کھلی عدالت میں چلایا جائے۔ تجھے جیل منتقل کیا جائے۔ تجھے اخبار دیئے جائیں۔ وکیل فراہم کئے جائیں۔ تو ہمارا قیدی ہے اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے؟'' وہ حلق کے بل دھاڑ رہا تھا۔
عباس کراہتا رہا اور گنتا رہا۔ اکیس بائیس' تئیس۔ جب وہ اسے مارتے تو وہ ہر ضرب کو گنتا تھا۔ چیخیں مارتے ہوئے گنتی بھول جاتا تو پھر سے شروع کر دیتا۔
ذہن ایک مرکز پر رہے۔ بکھرنے نہ پائے۔
مارنے والا ہاتھ رک گیا۔ اس کی حیوانی آواز شہد میں لتھڑ گئی۔ ''دیکھو عباس' ہم نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ تم لکھنے والے تھے' عزت دار تھے' سفید پوش تھے' باذوق تھے تمہاری ضد نے کہاں پہنچایا ہے۔ ہم نے تمہیں تمہاری ہی غلاظت میں سلایا ہے۔ ہم نے تمہیں چاروں ہاتھ پیروں پر چلایا ہے۔ ابھی تم کسی جانور کی طرح چیخ رہے تھے۔ کہاں گئی تمہاری وہ سحر انگیز آواز جس سے تم لوگوں پر جادو کیا کرتے تھے؟'' اس کی آنکھوں میں رحم تھا' عباس اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔
چند لمحوں بعد اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ بید سے اپنی ہتھیلی تھپ تھپائی۔ ''تم اب

ایک چیونٹی مسلنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ تمہارے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ میں تمہارے پیر کھلوا دوں، تب بھی تم میری طرف ایک قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ تم ویجی ٹیبل ہو اور ویجی ٹیبل کسی کا کچھ نہیں لگاڑتی۔ تازہ ہو تو کھا لی جاتی ہے اور تمہاری طرح باسی ہو جائے تو پھینک دی جاتی ہے۔'' وہ ہنسا۔

عباس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کیسا تڑخا ہوا، ٹوٹا ہوا اور مضحکہ خیز چہرہ تھا۔

بچپن میں وہ ایک مرتبہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ وہاں ایک آئینہ خانہ تھا۔ لکڑی کے چھوٹے سے کمرے میں ہر طرف بہت سے چھوٹے اور بڑے آئینے لگے ہوئے تھے۔ اس نے جب ایک میں اپنا چہرہ دیکھا تو ڈر گیا تھا۔ وہاں لگا ہوا ہر آئینہ ایسا ہی تھا۔ خوبصورت سے خوبصورت چہرہ ان میں اس طرح مسخ ہو جاتا تھا کہ شدید خوف کا احساس ہوتا تھا یا پھر چہرے کی مضحکہ خیزی پر ہنسی آنے لگتی تھی۔

اس کے سامنے والے کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔ شیطانی، مسخ، برباد شدہ، مضحکہ خیز، شدید اذیت کے عالم میں بھی اسے ہنسی آ گئی۔ اسے DICTIONARY OF DEVILS یاد آئی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ سرکس وہ جگہ ہے جہاں گھوڑوں، خچروں اور ہاتھیوں کو اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو احمقوں کا کردار ادا کرتے ہوئے دیکھ سکیں، لیکن یہ تو CIRCUS OF TERROR تھا۔

''تُو اس عالم میں بھی ہنستا ہے۔'' سامنے والا چیخا۔ ''میں ابھی بتاتا ہوں کہ مجھ پر ہنسنے کا، میرے دیئے ہوئے پانی کو گرا دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'' وہ مڑا پھر اس نے اپنے ماتحتوں میں سے ایک کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

''یس سر۔'' ماتحت چند قدم آگے بڑھ آیا۔

''لٹا دو حرام زادے کو۔'' کمرے میں ایک غیر انسانی آواز گونجی اور عباس کا سارا بدن تن گیا۔

اس نے مزاحمت کرنی چاہی لیکن انہوں نے اسے پلک جھپکتے میں زمین پر گرا لیا۔ وہ

اس کا منہ چیرنا چاہ رہے تھے اور وہ ان کی انگلیوں کو' ان کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

''یہ ہمارا دیا ہوا پانی نہیں پیتا۔'' عباس کے کانوں میں تحقیر آمیز آواز آئی۔ پھر ایک کم منصب والے خواجہ سرا کے بدن کا گرم گندا پانی' اس کے چہرے پر اس کی گردن پر' اس کے سینے پر گرنے لگا۔ اسے پکڑنے والے بدک کر دور ہٹ گئے۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ سوکھے ہوئے ہونٹ بھینچ لئے اور سانس روک لی۔

''میں ویجی ٹیبل ہوں۔ کوڑے پر پڑی ہوئی سڑی ہوئی سبزی۔ کتے اپنی ٹانگ اٹھا کر مجھ پر پیشاب کرتے ہیں۔'' اس کے ذہن میں فلیتے سلگ رہے تھے۔ اس کے پکڑنے والے اب اس سے دور تھے' لیکن پھر بھی اس نے حرکت نہیں کی' وہ کسی بے جان شے کی طرح پڑا رہا۔ بدن نے اس کا منہ چڑایا'' تم ویجی ٹیبل ہو سڑی ہوئی سبزی''۔

انہوں نے اسے اٹھایا تو وہ لڑکھڑاتا اور جھومتا ہوا اٹھا۔ فرش پر بہنے والے صاف پانی اور پیشاب نے ایک بڑا سا دھبہ بنا دیا تھا۔ عباس نے اس دھبے کو غور سے دیکھنا چاہا لیکن آنکھوں میں لہریں تھیں۔ بڑے خواجہ سرا کی نظریں لحظہ بھر کے لئے ان لہروں میں ڈوبیں' پھر اس نے غرور سے سر اٹھا کر اپنے ماتحتوں کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ان سب کے لئے تحقیر تھی۔

''SHIT تمہیں لوگوں کو توڑنا نہیں آتا۔ مڈل کلاس کے یہ خود ساختہ انقلابی سزاؤں اور بھوک پیاس سے نہیں ٹوٹتے۔ ان کی عزت نفس پر چوٹ لگاؤ۔ یہ تنکے کی طرح دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔'' وہ ہنسا اور عباس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اتنا قریب کہ اس کی سانس عباس کے چہرے کو چھونے لگیں۔

''تم سب ٹوٹ جاتے ہو۔ پھر لونڈیوں کی طرح اتنے نخرے کیوں دکھاتے ہو؟'' اس کے بید نے عباس کے ناف سے نچلے حصے کو چھیڑا پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

عباس نے بڑے خواجہ سرا کی بید کو اپنی رانوں کے درمیان محسوس کیا اور اس کے قہقہہ مارتے ہوئے چہرے پر تھوک دیا۔

○○

تنہائی کے مکان میں

ہم جو چار پہر کے دن کے عادی ہیں، ہمارے حسابوں سے پہر ہوگئی ہے۔ لیکن یہاں سہ پہر میں ہی رات کا سماں ہے اور ہم روشنیوں، خوشبوؤں اور آوازوں کے درمیان ہیں اور ان آوازوں میں سب سے غالب آواز بن بری کی ہے۔

مہاتما بدھ نے کہا تھا کہ ''وہ ایک لفظ جسے سن کر انسان خاموش ہو جائے اور اس کی جہتوں میں ڈوب جائے، وہ ان ہزار لفظوں سے بہتر ہے جو کوئی مفہوم و معنی نہ رکھتے ہوں۔'' بن بری کو خاصے عرصے سے مہاتما بدھ کی کہی ہوئی باتیں دہرانے کا شوق ہے۔ اس نے یہ اشلوک مجھے کئی مرتبہ سنایا ہے لیکن اداکاری کرتے کرتے وہ شاید لفظوں اور جملوں کو محض دہرانے کا عادی ہوگیا ہے۔

وہ میز پر دونوں کہنیاں رکھ کر آگے کی طرف جھکتا ہے۔ ''خواہشوں اور خوابوں کی دہلیز پر کھڑی ہوئی رات، ایک آنکھ سے روتی اور ایک آنکھ سے ہنستی ہے۔ وہ روتی ہے اور ہم غم کے سمندر میں اترتے ہیں۔ وہ ہنستی ہے اور ہم لذت کے بادلوں کو اوڑھ لیتے ہیں۔''

ماسوی سر جھکائے اپنے لبریز پیالے کی سطح پر بنتے اور بگڑتے ہوئے عکس دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے میں اور مہاتما بدھ کے اس مجسمے میں کوئی فرق نہیں جو ہمارے اپارٹمنٹ کے سب سے اونچے طاق پر رکھا ہے اور جس کے قدموں میں کبھی ماسوی اور کبھی میں، تازہ پھول رکھ دیتے ہیں۔

ہمارے برابر کی میز پر بیٹھا ہوا ایرانی لڑکا جو براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی میوزک لائبریری کا انچارج ہے اور اکثر یہاں نظر آتا ہے' اچانک کھڑا ہو جاتا ہے' اس کا ساتھی اسے بٹھانے کی کوشش کرتا ہے' لیکن وہ اس کا ہاتھ جھٹک دیتا ہے اور اونچی آواز میں ایک نظم سنانے لگتا ہے۔

کوچوں میں لہو
اور غیظ و غضب گھروں کے اندر
انہوں نے پرانی قبروں میں
نوجوان کنواریوں کو دفنایا ہے۔
اور عشق سے پُر' خوش نما سینوں میں
گولی اترتی ہے
دہشت برسرِ بام گنگناتی ہے
اور موت جشن مناتی ہے

لڑکا آخری دو سطروں کو دہراتا ہے اور چہرے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے پونچھتا ہے۔ اس کا ساتھی ابھی ہوش میں ہے' اس لئے جھینپ رہا ہے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک دو سر ہلا کر داد دیتے ہیں۔

بن بری گردن گھما کر اس لڑکے کو دیکھتا رہتا ہے پھر ہماری طرف رخ کرتا ہے اور اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں اپنا چہرہ رکھ لیتا ہے۔ ''جشن میں تو روشنیاں ہوتی ہیں' رنگ ہوتے ہیں' موت بھلا کیسے جشن مناتی ہے؟ کون سا رنگ پہنتی ہے۔ اور کون سی خوشبو لگاتی ہے؟''

''یہ مشکل مسئلے ہیں' تم نہیں سمجھو گے۔ ان مسئلوں کو ایرانیوں' ویت نامیوں اور افریقیوں کے لئے چھوڑ دو۔'' ماسوی کے لہجے میں ہلکی سی چبھن ہے۔

بن بری اس کی بات یوں سنتا ہے جیسے سنی ہی نہ ہو۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''سنو! کیا روشنی اب بھی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل کی رفتار سے

سفر کرتی ہے؟"

"ہاں' اسکول میں تو یہی پڑھا تھا' ہوسکتا ہے اب اس کی رفتار میں کچھ اضافہ ہوگیا ہو۔" میں اپنے شک کا اظہار کرتی ہوں۔

"کبھی تم نے سوچا کہ رفتار کے ساتھ تصادم کا تصور ابھرتا ہے تو پھر اس رفتار سے سفر کرتی ہوئی روشنی آس پاس کی چیزوں کو تہس نہس کیوں نہیں کر دیتی؟ اچھا چلو مانے لیتا ہوں کہ اس میں رفتار ہے' طاقت نہیں تو پھر یہ گلیوں اور بازاروں میں' گھروں میں اور ماسومی کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی کیوں رہتی ہے؟ سفر کرنے والی چیزیں قیام تو نہیں کرتیں' نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔"

بن بری کا سوال مجھے بھی الجھا دیتا ہے۔ یہ شاید فزکس کا مسئلہ ہے یا شاید میتھمیٹکس کا؟...... میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اس لئے خاموش رہتی ہوں۔ ماسومی نگاہیں اٹھا کر بن بری کو دیکھتی ہے' لیکن وہ بھی کچھ نہیں کہتی۔ بن بری تیسرے پیگ کے بعد جب کلام کرتا ہے تو ہم میں سے کوئی بھی اس کی بات کو دھیان سے نہیں سنتا۔ اس وقت یوں بھی سب اپنے خوابوں کو اپنے پیالوں میں ڈبو رہے ہیں۔ سب انہیں چھو رہے ہیں' چکھ رہے ہیں اور خواب' شراب کے گھونٹ کی طرح زندگی کے معدے میں اتر رہے ہیں اور معدوم ہو رہے ہیں۔

میں پیالے کے لب پر لپ اسٹک کے مدھم سے نشان کو دیکھتی ہوں اور ماسومی تو آج جانے کہاں ہے؟ اپنے آپ میں اس قدر گم تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ یوں بھی آج وہ آئی کب ہے' زبردستی لائی گئی ہے۔

نیشنل تھیٹر بار میں اس وقت غضب کی ہماہمی ہے۔ لوگ کرسیوں پر اور صوفوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جنہیں کوئی نشست نہیں ملی وہ آلتی پالتی مار کر اپنے پیالے سامنے رکھ کر قالین پر ہی بیٹھ گئے ہیں اور بے تکان بول رہے ہیں۔ ان کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے لفظ سگریٹ کے دھوئیں اور تنفس کی گرمی پر ٹکے ہوئے ہیں اور ہر طرف نیلگوں دھند ہے۔

اس شور اور دھند سے گھبرا کر میں باہر دیکھتی ہوں۔ شیشے کی دیوار کے ادھر لکڑی کی بنچیں اور مستطیل میزیں خالی پڑی ہیں۔ پھر ہم تینوں اپنے اپنے پیالے اٹھا کر کر فلیچو بار میڈ سے اجازت لیتے ہیں اور باہر چلے جاتے ہیں۔

ہوا دریا میں نہا کر آئی ہے اور اس کا پنڈا ٹھنڈا ہے۔ وہ بدن سے لپٹتی ہے اور لحظہ بھر کے لئے کپکپی سی دوڑ جاتی ہے۔ ہم لکڑی کی بنچوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ دریا کے اس پار سینٹ پال ہے جس کا گنبد اور کلس نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرنے والی روشنیوں میں ڈوب کر چاندی میں ڈھل گیا ہے۔

ماسومی اپنے گلے میں پڑی ہوئی طلائی زنجیر میں پروئی ہوئی چھوٹی سی گھڑی کو جھلاتی ہے اور وہ پنڈولم کی طرح حرکت کرنے لگتی ہے۔ میں خاموشی سے اس کی حرکت کو دیکھتی رہتی ہوں۔ ایک گھڑی اس کی کلائی پر ہے جو چلتی رہتی ہے اور ایک گھڑی اس کے گلے کی طلائی زنجیر میں ہے جس کے ننھے سے ڈائل پر رومن ہندسے ہیں۔ اس کا رنگ اڑا ہوا ہے اور اسے میں نے آج تک چلتے نہیں دیکھا۔

ہم تھوڑی دیر لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے رہتے ہیں پھر بن بری اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ "دریا تو اب بھی دور ہے وہ ہمیں آوازیں دے رہا ہے۔ آؤ ہم چل کر اس تک جائیں اور اسے سلام کریں۔"

بن بری کی باتیں اسی وضع کی ہوتی ہیں۔ کوئی اجنبی اسے کلام کرتے ہوئے سن لے تو مجذوب جانے۔ اسٹیج پر غیر اہم کردار ادا کرتے ہوئے وہ اہم کردار ادا کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی باتیں بھی گویا مکالمے ہیں جن کی ادائیگی میں وہ آواز کے زیر و بم کا خیال رکھتا ہے۔ اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دکھانے والوں کو ان کے ناظرین نہیں ٹوکتے ورنہ وہ مکالمے بھول جائیں۔ اسی لئے ماسومی اور میں ہم دونوں اس سے بحث نہیں کرتے۔ اس وقت بھی ہم کچھ کہے بغیر اپنی نشستوں سے اٹھ کر پختہ فرش پر چلتے ہوئے اس دیوار تک جاتے ہیں جس کے سائے میں دریا آرام کرتا ہے۔

میں جھک کر نیچے دیکھتی ہوں ٹیمز کے چوڑے سینے میں رات ٹھہری ہوئی ہے اور اس

کے حاشیوں پر دودھیا اور عنبریں روشنیاں ہیں۔ دریا کے تنفس کے ساتھ ہی روشنیاں بھی سانس لے رہی ہیں اور ہماری آنکھوں کی پتلیوں میں پگھلتی ہوئی چاندی اور گھلتے ہوئے سونے کے رنگ اتر رہے ہیں۔

بن بری دیوار کی منڈیر پر جھک جاتا ہے۔ پھر وہ ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بناتا ہے اور بلند آواز سے دریا کو سلام کرتا ہے۔ اس کی آواز کچھ دور جا کر کھو جاتی ہے' بس کنارے سے دریا کی لہروں کے ٹکرانے کی مدھم آواز رہ جاتی ہے۔

''سنو' دریا ہم سے کلام کرتا ہے۔'' بن بری مڑ کر ماسومی سے مخاطب ہوتا ہے۔

''درست کہتے ہو' دریا ہم سے کلام کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے میرا پانی گیہوں کی بالیوں میں' سنگتروں کی قاشوں میں اور بادلوں کے ٹکڑوں میں رہتا ہے۔ تمہاری پیاس مجھ سے بجھتی ہے' تمہاری غلاظت مجھ سے دھلتی ہے اور اس کے عوض تم مجھے برباد کرتے ہو' مجھ میں زہر انڈیلتے ہو' مجھے لاشوں سے بھر دیتے ہو۔''

ماسومی کے جملوں سے شہد ٹپکتا ہے' لیکن آج اس کی آواز حنظل کا پکا ہوا پھل ہے۔ میں اور بن بری چونک کر اسے دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی طبیعت شاید زیادہ ہی خراب ہے۔ تب ہی آج شام وہ ہمارے ساتھ آنے کے لئے رضامند بھی نہ تھی' لیکن بن بری کے آگے کسی کی ایک نہیں چلتی اور ماسومی پر تو یوں بھی ڈرامائی انداز میں فدا ہے۔ ماسومی پر ابھی تک اس کی وارفتگی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اس کے لئے دل میں ایک گوشۂ رعایت رکھتی ہے۔

بن بری اور ماسومی کے درمیان اکثر میں بھی خود کو کسی ڈرامے کا کردار محسوس کرتی ہوں۔ کسی وکٹورین ڈرامے کی ''شیپر آن'' جو اس کے ساتھ ریستورانوں میں جاتی ہے' ڈرامے دیکھتی ہے' چہل قدمی اور شراب نوشی کے لئے نکلتی ہے۔ ان تمام محفلوں اور یکجائیوں میں' میرا ساتھ ایک ایسی شرط ہے جس پر میں شرمسار رہتی ہوں اور بن بری مطمئن۔ میں نے کئی مرتبہ اس مثلث کا ایک ضلع بننے سے انکار کیا لیکن ماسومی اس کے لئے تیار نہیں اور بن بری کو بھی بظاہر اس صورتحال پر کوئی اعتراض نہیں' شاید وہ جانتا ہے کہ ان محفلوں کا

میرے بغیر ہونا ممکن نہیں' چنانچہ یہ تکون تقریباً سال بھر سے نہایت استقامت سے قائم ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ماسوی اور میں' دونوں ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہیں اور ایک ہی ادارے میں کام کرتے ہیں۔

اس وقت ماسوی کی آواز کا حنظل ہم چپ چاپ کھا لیتے ہیں اور شاید ہماری خاموشی اس سے بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔ تب ہی چند لمحوں کے بعد وہ ہم سے معذرت کرتی ہے اور ہم اس کی معذرت کو خاموشی کی چادر میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔

ہم تینوں اپنے اپنے خیالوں میں گم ہیں اور دریا کی لہروں کو' روشنیوں اور سایوں کو دیکھ رہے ہیں' پھر ہم وہاں سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ بن بری نے ہمارے لئے کسی فلم کی بکنگ کروا رکھی ہے۔ یہ تو ہمیں لیسٹر اسکوائر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ بکنگ FULL METAL JACKET کی ہے جس کی سارے شہر میں دھوم ہے اور جس کے ٹکٹ دگنے اور تگنے داموں میں مل رہے ہیں۔

ہم سیڑھیاں اتر کر پکچر ہال میں داخل ہوتے ہیں تو فلم شروع ہو چکی ہے اور اسکرین پر قدم سے قدم ملا کر بہت سے نوجوان چل رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کی ابھی مونچھیں بھی ڈھنگ سے نہیں نکلیں۔ ہم اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ لڑکے جن کی انگلیاں زندگی لکھنے کے لئے تھیں۔ ان کی وہی انگلیاں رائفل کی لبلبی پر ہیں اور موت سے کھیلنے کے لئے بیتاب ہیں۔ وہ کوئی رومانی گیت گنگنانے کے بجائے میکانکی آواز میں چیختے ہوئے باغ سے گزر رہے ہیں۔ ان کی کھوکھلی آوازیں سارے ہال میں گونج رہی ہیں۔

دنیا میں یوں تو اور بھی بہت سی رائفلیں ہیں
لیکن یہ میری رائفل ہے
یہ میری اپنی ہے
یہ میری زندگی ہے
یہ میرے دشمن کو ہلاک کرے گی

میں اس کے عشق میں گرفتار ہوں
اس کے ساتھ میں شب بسری کرتا ہوں

ہم تینوں زومبیوں کی طرح اسکرین کو دیکھ رہے ہیں جہاں شہر جل رہے ہیں' انسانوں کے چیتھڑے اڑ رہے ہیں' آٹھ اور نو برس کے بچے فوجیوں سے اپنی بہنوں' ماؤں اور بیوہ بھاوجوں کا سودا کر رہے ہیں اور انسان کسی کونے میں گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھا ہے اور غیر انسانی آواز میں رو رہا ہے۔

انٹرول ہوتا ہے لیکن ہم تینوں میں سے کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ ہم نے لاشوں کے جتنے عکس دیکھے ہیں' اس کے بعد کھانا محال ہے۔ ہم نے جتنی چیخیں سنی ہیں اس کے بعد بولنا ممکن نہیں۔ کچھ منظر آپ سے کلام کی صلاحیت چھین لیتے ہیں۔ کیا کلام کریں؟ کس سے کلام کریں؟ کلام انسانوں سے کیا جاتا ہے اور یہاں چلتی پھرتی لاشیں ہیں' بولتے ہوئے مردے ہیں۔ باتیں انسانوں سے کی جاتی ہیں اور یہاں زومبیوں کی قطاریں ہیں۔ ہم ہر چہرے کو دیکھتے ہیں اور اس کے پیچھے اصل چہرے ڈھونڈتے ہیں۔ بھیڑیوں' لکڑ بگھوں' شیروں' چیتوں اور گھڑیالوں کے چہرے۔

فلم انسان کی موت پر ختم ہو جاتی ہے۔ ہم ہال سے باہر آتے ہیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ کی دیوار آئینوں سے ڈھکی ہے۔ ہم ان آئینوں کی طرف نہیں دیکھتے۔ کہیں ہم سے اپنا آپ نہ پہچانا جائے۔ ہم چپ چاپ چلتے رہتے ہیں۔ ماسومی گھر واپس جانا چاہتی ہے لیکن بن بری کا کہنا ہے کہ اس نے ہمارے لئے کھانے کا اہتمام کیا ہے' سو ہم اس کے فلیٹ چلیں۔ آخر کار ہم دونوں ہار جاتے ہیں اور لیسٹر اسکوائر سے ناردرن لائن میں سوار ہو جاتے ہیں' مارنگٹن کریسنٹ کے لئے' جہاں سے بن بری کا فلیٹ چند قدم کے فاصلے پر ہے۔

یہاں ہم اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکے ہیں' اس لئے فلیٹ کی وہ دیوار ہمارے لئے اجنبی نہیں جس پر طرح طرح کے مکھوٹے آویزاں ہیں۔ میں دو قدم آگے بڑھ کر دیکھتی ہوں تو میری نظر اس دائرہ نما ڈائننگ ٹیبل پر پڑتی ہے جو چار افراد کے لئے ہے اور

جس کے گرد بیٹھ کر ہم نے کئی مرتبہ بن بری کے پکائے ہوئے کھانے کھائے ہیں آج اس ڈائننگ ٹیبل پر سفید لیس کا بہت خوبصورت میز پوش بچھا ہے۔ ایک طرف سیلوفین میں لپٹا ہوا نرگس کے پھولوں کا ایک بڑا گلدستہ ہے۔ اس تمام سفیدی کے درمیان گلابی آئسنگ کا ایک کیک ہے جس پر گہرے گلابی رنگ سے کچھ لکھا ہوا ہے۔

میں ذرا حیرت سے آگے بڑھ کر شکر کی اس تحریر کو پڑھتی ہوں اور ہنستے ہوئے بن بری کی طرف دیکھتی ہوں۔

''کمال ہے' تم دونوں نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ یہ تو زیادتی کی بات ہے'' میرا لہجہ شکایت آمیز ہے اور پھر میں سوالیہ انداز میں ماسوی کو دیکھتی ہوں۔

ماسوی کی آنکھوں میں الجھن تیر جاتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر سفید میز پر رکھے ہوئے گلابی کیک اور سفید پھولوں کو دیکھتی ہے۔ اچانک اس کا چہرہ سفید پڑ جاتا ہے۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ بتاؤ کیسے معلوم ہوا تمہیں؟'' ماسوی ایک جھٹکے سے بن بری کی طرف مڑ جاتی ہے اور اس وقت اس کی آواز قطعاً غیر انسانی ہے۔

''میں نے تمہارا پاسپورٹ دیکھا تھا ماسوی! لیکن ڈیر......'' بن بری اس کی آواز کی اجنبیت سے گھبرا جاتا ہے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ سفید لیس سے ڈھکی ہوئی میز پر رکھا ہوا گلابی کیک بتاتا ہے کہ آج ماسوی کا جنم دن ہے۔ میں اس کی طرف دیکھتی ہوں۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی ہیں اور وہ کیک کو عجیب انداز سے دیکھتی ہے۔

اس لمحے مجھے احساس ہوتا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ ماسوی کو میں بازو سے تھام کر صوفے کی طرف لے چلتی ہوں۔ ''آؤ پہلے یہاں بیٹھ تو جاؤ۔''

بن بری میری طرف شکر گزار نظروں سے دیکھتا ہے اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر' ہماری طرف پیٹھ کر کے دیوار گیر کیبنٹ سے وائن کی بوتل اور پیالے نکالنے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد وہ سرخ وائن کے پیالے بڑھاتا ہے۔ ماسوی پیالہ تھام لیتی ہے اس کی مرتعش سطح کو غور سے دیکھتی ہے۔ پھر سر اٹھا کر بن بری پر نظر ڈالتی ہے۔'' میں تمہیں اس قدر بے حس

اور سنگدل نہیں سمجھتی تھی'' اس کا لہجہ ٹھنڈا اور اجنبی ہے۔

بن بری گڑ بڑا کر اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن ماسوی اس کا جملہ کاٹ دیتی ہے ''تمہیں میرے پاسپورٹ پر لکھی ہوئی تاریخ پیدائش تو یاد رہی لیکن اس میں دوسری باتیں بھی تو لکھی ہوئی تھیں'' اس کا لہجہ کٹیلا ہے۔

کٹہرے میں کھڑے ہوئے مجرم کی سی کیفیت بن بری کے چہرے پر ہے۔ میں قدرے جھنجھلا جاتی ہوں۔ ''تم نہ جانے کن پہیلیوں میں بات کر رہی ہو۔ آخر بن بری سے ایسا کون سا جرم سرزد ہو گیا ہے؟''

''اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو سامنے کی باتیں بھی پہیلیاں بن جاتی ہیں۔''

ماسوی کا لہجہ کڑوا ہے اور اس کی انگلیاں گلے کی زنجیر میں پڑی ہوئی گھڑی کو ہلا رہی ہیں اور وہ پرانی اور بند گھڑی کسی پنڈولم کی طرح حرکت کر رہی ہے۔

''اس گھڑی کو دیکھ رہی ہو؟ یہ ایک بند گھڑی ہے۔ بہت پرانی' میری سالگرہ کا آخری تحفہ۔ اس میں ہمیشہ سوا آٹھ بجتے ہیں۔ رات کے نہیں' صبح کے سوا آٹھ۔'' اس کی آواز ہر کیفیت اور ہر جذبے سے عاری ہے۔

''میں نے اس کے بارے میں کئی مرتبہ پوچھنا چاہا' لیکن پھر اچھا نہیں لگا۔'' میں اس گھڑی کو غور سے دیکھتی ہوں' وقت جس میں ٹھہرا ہوا ہے۔

''بن بری آؤ میرے سامنے بیٹھ جاؤ' تم ڈرامے کے عاشق ہو' سو آج میں تمہیں ایک ڈرامہ سناتی ہوں۔ تاریخ کی راہداری میں کھیلے جانے والی ایک ٹریجڈی۔'' وہ بن بری کو اشارہ کرتی ہے اور وہ کسی معمول کی طرح اس کے سامنے جا بیٹھتا ہے۔

''نہیں شاید میں نے غلط کہا۔ میں تمہیں ڈراما نہیں' زندگی سنانا چاہتی ہوں۔ کہانیاں یا ڈرامے' زندگی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کے رنگ' ان میں سانس لیتا ہوا خوف اور ان کا ڈرامائی عنصر سب پھیکا نظر آتا ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا ڈراما تو آج تک تحریر ہی نہیں ہوا۔'' وہ جیسے خود کلامی کر رہی ہے۔

''اس روز صبح سے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام کو میری سالگرہ تھی' اس لئے

میں منہ اندھیرے اٹھ گئی تھی۔ ماں نے گزشتہ رات میرے گلابی لباس پر گہرے گلابی پھول ٹانکے تھے اور اب منہ اندھیرے سے وہ کیک بنانے میں مصروف تھی۔ باپ نے دفتر جانے سے پہلے مجھے پیار کیا تھا اور میرے گلے میں ایک زنجیر پہنا دی تھی جس میں ایک چھوٹی سی گھڑی تھی۔ بڑے بھائی بہن اسکول چلے گئے تھے لیکن میری طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لئے میں گھر پر تھی۔ سب کے جانے کے بعد گھر پر گہرا سناٹا چھا گیا۔ میں آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر نکالے ہوئے پچھواڑے کے باغ میں جھانک رہی تھی کہ اچانک بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے آواز دے کر ماں کو یہ بات بتائی تو وہ الگنی پر پڑے ہوئے کپڑے اتارنے کے لئے باہر چلی گئی۔

''میں نے ماں کو جلدی جلدی کپڑے سمیٹتے ہوئے دیکھا' پھر میں نے سر اٹھا کر بادلوں کو دیکھنا چاہا۔ وہاں بادلوں کے ساتھ ساتھ تین بڑے غبارے تیر رہے تھے۔ اچانک سارا آسمان گلابی روشنی سے بھر گیا اور روشنی رنگ بدلنے لگی۔ نیلا' گلابی' سرخ' بھورا' زرد اور کاسنی۔ اسی لمحے میں نے ماں کی چیخ سنی۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں سمٹے ہوئے کپڑے جانے کہاں چلے گئے تھے اور وہ خود سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح جل رہی تھی۔ میں نے چیخنا چاہا' لیکن میرے اندر آواز نہیں رہی تھی۔ میری کہنیوں کے نیچے سے کھڑکی کی چوکھٹ کہیں چلی گئی تھی اور میں اڑ رہی تھی۔ پھر میں سبزے پر ماں کے قریب جا گری۔ آگ میرے بدن کے اندر سے گزر رہی تھی۔''

ماسومی اپنی ماں کے اور اپنے بارے میں لاتعلقی سے باتیں کر رہی ہے جیسے کسی اور پر گزرے ہوئے واقعات دہرا رہی ہو۔ سچ کا سورج ہم پر طلوع ہو رہا ہے اور ہماری آنکھوں کی بینائی چھین رہا ہے۔ میرے ہاتھ میں پیالہ کانپنے لگتا ہے۔ میں اسے غور سے دیکھتی ہوں۔ اس میں خون چھلک رہا ہے۔ میرے ہاتھوں کی لرزش بڑھ جاتی ہے اور اس میں سے چند قطرے قالین پر گر جاتے ہیں۔

ایک گہری سانس لینے کے بعد ماسومی کہتی ہے۔ ''میری آنکھ کھلی تو میں سیاہ سبزے پر تھی۔ میرے گھر کی دیواریں نہیں تھیں۔ چھت نہیں تھی۔ ماں نہیں تھی۔ آس پاس کچھ بھی

نہیں تھا۔ بس آگ تھی' دھواں تھا۔ میں نے اٹھ کر چلنا چاہا تو میرے پاؤں جلے ہوئے تھے اور آنکھیں سوج کر آدھی بند ہو گئی تھیں۔ گلی جانے کہاں چلی گئی تھی۔ راستے بھی نہیں رہے تھے۔ لوگ بے نور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اور جھلسے ہوئے پیروں سے چلتے ہوئے سر جھکائے کسی ایک طرف جا رہے تھے۔ شاید وہی راستہ تھا۔ ان لوگوں کے بدن پر کپڑے نہیں چیتھڑے تھے۔ لاوے کی طرح ابلتا ہوا گوشت' چہروں' ہاتھوں اور پیروں سے لٹکتی ہوئی کھال۔ میرے بدن پر بھی کچھ نہ تھا' بس یہ گھڑی تھی جو میری گردن سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں اپنے باپ کے ہاتھ کی طرح' اپنی ماں کی انگلی کی طرح اسے اپنی مٹھی میں دبائے اندھوں کی طرح چلتی رہی۔ میں پیاس سے مر رہی تھی' سب ہی پیاس سے مر رہے تھے۔ میں پانی کے لئے رو رہی تھی۔ سب ہی پانی کے لئے رو رہے تھے اور اندھوں کی طرح بغیر دیکھے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میرے شہر میں سات دریا بہتے تھے لیکن ہمارے اندر ایسی پیاس بھڑکتی تھی کہ ان کا پانی بھی اسے بجھانے کے لئے کافی نہ تھا۔ تمہارے لئے ٹیمز میں روشنیاں اور خوشیاں تیرتی ہیں اور میں نے پانی کے لئے ترستے ہوئے اور تپش سے جھلستے ہوئے لوگوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے دریا دیکھے ہیں۔'' ماسوی کی آواز بھرّا رہی ہے اور آنکھیں خشک ہیں۔ اس کے آنسو بن بری کی اور میری آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔

وہ اٹھتی ہے اور اس گول میز تک جاتی ہے جس پر گلابی کیک ہے اور جس کے چہرے پر گلابی شکر سے ماسوی کا نام اور ''سالگرہ مبارک'' کڑھا ہوا ہے۔

بن بری اسے وہاں کھڑا دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔ اس کے شانے لرز رہے ہیں اور میری آنکھوں کی دھندلاہٹ گہری ہو جاتی ہے۔ اس دھند میں لفظ تیرنے لگتے ہیں۔

ماں! میں بن شعلوں کی آگ میں جلی
میں نے ایک ایسے زخم کا درد سہا
جس سے خون نہیں بہتا

ماں! میرا کھانا اور پینا
ذائقوں سے نا آشنا تھا
اور میری شب بسری
لذتوں سے ہمکنار نہ تھی
اور ماں! میری زندگی
زندہ تو تھی لیکن مکمل موت تھی

یہ نظم ماسومی کے کمرے کی دیوار پر آویزاں ہے اور میں نے اسے اتنی مرتبہ پڑھا ہے کہ مجھے از بر ہو گئی ہے۔

ماسومی ہماری طرف مڑتی ہے۔ ''جب میں ٹوکیو میں تھی تو مجھ سے پہلی بار محبت کی گئی۔ اس شام ہم دونوں چہل قدمی کے لئے نکلے تھے۔ شام ہو رہی تھی اور ہم سبزے پر چل رہے تھے جس پر پیڑوں سے گرے ہوئے سفید پھول بچھے ہوئے تھے' اچانک اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر میرا بوسہ لیا۔ ہم اس بوسے کی گہرائی میں ڈوب گئے' پھر اچانک ایک جھٹکے سے وہ مجھ سے الگ ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ میری نظر اس کے ہونٹوں پر پڑی' وہ سرخ تھے۔ ان میں خون لگا ہوا تھا۔

''میں ٹھنڈی پڑ گئی' مجھے اپنے منہ میں نمکین ذائقے کا احساس ہوا۔ بوسے کی شدت نے میرے مسوڑھوں کے زخم کھول دیئے تھے۔ مجھے ڈاکٹر کی ہدایات یاد آ گئیں۔ میں نے بے اختیار زمین پر تھوک دیا اور سبز گھاس پر سفید پھولوں کے درمیان میرا خون پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وہ چند لمحوں تک مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے اس نے کسی چڑیل کو دیکھ لیا ہو۔ اس پر لرزہ طاری تھا' پھر وہ ''ہبا کوشا...... ہبا کوشا'' کہتا ہوا وہاں سے بھاگتا چلا گیا اور میں مسوڑھوں سے بہتے ہوئے خون اور سبزے پر تھوکے جانے والے بوسے کے ساتھ تنہا رہ گئی''

تنہائی کے مکان میں رہنے والی ماسومی ہنستی ہے اور میرے کانوں میں آگ ٹپکنے لگتی ہے۔ ''جانتے ہو بن بری جاپانی زبان میں ایٹمی حملے سے متاثر ہونے والوں کو ''ہبا کوشا''

کہا جاتا ہے۔ مجھ میں زہر گھلا ہوا ہے۔ میں اپنے بعد کی نسلوں کو بھی زہر بانٹوں گی۔"

میں بن بری کو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھتی ہوں، وہ شاید ہم سے اپنی ابکائیاں چھپانا چاہتا ہے۔ اس کے سٹنگ روم کی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی کھڑکی کھلتی ہے۔ کھڑکی میں سے ایک ننھی سی چڑیا سر نکالتی ہے۔ میں پنڈولم کی زنجیر کو ہلتے ہوئے اور چڑیا کو چہکتے ہوئے سنتی ہوں۔ 6 اگست کے ختم ہونے میں بس ایک گھنٹہ رہ گیا ہے، لیکن یہ دن زندہ کہاں رہا ہے، یہ تو برسوں پہلے قتل کیا جا چکا۔ اس کی ٹھٹھری ہوئی لاش اس وقت بھی ماسوئی کے گلے میں جھول رہی ہے اور اس کی کھلی ہوئی آنکھیں مجھے تک رہی ہیں۔ میں گھبرا کر اپنی آنکھیں موند لیتی ہوں۔ اس مقتول دن کی کھلی ہوئی آنکھوں سے کوئی نگاہیں کیسے چار کر سکتا ہے؟

○○

آخری بوند کی خوشبو

پرندوں کی واپسی شروع ہو چکی تھی۔ ان کی اڑان سے آسمان پر آڑی ترچھی لکیریں کھنچ رہی تھیں جو آہستہ آہستہ چندن' پیپل اور نیم کے پیڑوں میں غروب ہو رہی تھیں۔ واپس ہونے والوں کی آوازوں، کے گھنگھرو' بستی کے تمام آنگنوں میں بج رہے تھے اور اڑان سے تھک کر ٹوٹ جانے والے ان کے گرم پر ہوا میں دائرے بناتے ہوئے زمین پر گر رہے تھے۔

تجل فقیر کی آواز دو چار گلیوں پرے سے آئی۔" دل مورے موں دوست کا ڈیرا' سائیں کا ڈیرا' قلب کے بیچ ہے کعبہ جو قبلہ' بیچ بہے گنگا' بیچ بہے دجلہ' من ماہیں تیرتھ میرا' دوست کا ڈیرا' سائیں کا ڈیرا۔"

اس کی پرسوز اور پاٹ دار آواز اکتارے کی ٹن ٹن پر چھائی ہوئی تھی اور ریگستانی ہوا کے آہنگ کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

یہ آہنگ سائیں فیض بخش کے سینے میں نیزے کی انی کی طرح اترا تو انہوں نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ سیاہ لفظوں والے زردی مائل کاغذ پر دھندلاہٹ کی راکھ جمنے لگی ہے اور وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دمشق کے بازار سے واپسی پر خوش ادا کنیزوں اور دانش جو غلاموں کی کچہری سے اٹھنے پر آمادہ کریں۔

تجل فقیر کی آواز دور جانے لگی ہنس کی ڈوبتی ہوئی آواز کی طرح۔ وہ نواب لغاری کا

عاشق تھا اور عموماً انہی کا کلام گاتا تھا۔ کبھی سندھی میں کبھی ہندی میں ''دل مورے موں دوست کا ڈیرا' سائیں کا ڈیرا۔'' انہیں پھریری سی آئی اور انہوں نے سر جھٹک کر گردوپیش پر نظر کی۔ باہر کی شام کا نارنجی پن ان کی اوطاق تک پہنچتے پہنچتے سرمئی غبار بن گیا تھا اور ہر چیز اسے اوڑھتی جا رہی تھی۔

روز کی طرح انہیں اس وقت بھی حیرت ہوئی۔ اتنی جلدی...... ؟ یہ اندھیرا پھر اتنی جلدی اتر آیا؟ انہوں نے ایک آہ بھری' چراغ کے انتظار میں تکئے کے نیچے سے مور کا چھوٹا سا پر نکالا اور اسے مثنوی کے چوتھے دفتر میں رکھ دیا۔ دن کی روشنی میں اس کا طاؤسی رنگ کیسی چھب دکھاتا تھا لیکن اس وقت تو وہ بھی سیاہ نظر آ رہا تھا' پھر حقیقت کیا ہے؟ دن کی روشنی میں اس کے سارے رنگ یا جھٹ پٹے کے سمے اس کی سیاہی؟ لیکن شاید حقیقت کہیں تھی ہی نہیں......!

انہوں نے مثنوی کے چوتھے دفتر کو اپنے پلنگ کے برابر رکھے ہوئے صندوق پر رکھا تو ان کا ہاتھ ایک اور کتاب سے چھو گیا۔ یہ ''شاہ جو رسالو'' تھی۔ گویا ان کے ہاتھ نے اپنی گزشتہ اور آئندہ صبحوں کو چھو لیا۔ یہ ان کا پرانا معمول تھا کہ صبح کا آغاز وہ ''شاہ جو رسالو'' سے کرتے اور ان کا سینہ اپنے پن سے بھر جاتا۔ پھر دوپہر ڈھل جاتی اور ان کا دل عشق' جبر و قدر' وحدت الوجود اور وحی و الہام کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے بیتاب ہو جاتا اور سائیں فیض بخش ایک ایسے شکاری بن جاتے جو پہلے تو ہرن کے نقش قدم دیکھتا ہوا اس کے تعاقب میں چلتا چلا جاتا ہے اور جب اس کے نقش قدم دھندلا جاتے ہیں' نظر نہیں آتے تو نافۂ آہو کی خوشبو کا دامن تھام کر اس کی سمت بڑھتا رہتا ہے۔ ''ہمچو صیادے سوئے اشکار شد' در گامِ آہو دید و بر آثار شد' چند گاہش گامِ آہو درخوراست' بعد ازاں خود نافہ آہو رہبر است'' وہ ان اشعار کو سینکڑوں بار پڑھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ وہ آج بھی حقیقت و معرفت کے ہرن کی تلاش میں چلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سفر کا خاتمہ نہیں تھا اور یہی اس کا حاصل تھا۔

دہلیز پر چوڑیاں بجیں اور روشنی کی لکیر کھنچ گئی۔ انہوں نے اپنی چہیتی بیٹی کو دیکھا' ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ طاق چراغ کی روشنی سے بھر گیا ہے یا نوری کے چہرے کی دمک سے۔

وہ طاق میں چراغ رکھ کر ان کے پاس آئی اور انہوں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔ بیٹی کا باپ ہونا کیسی نعمت تھی' کیسا عذاب تھا۔

اچانک سارا گردو پیش اونٹوں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازوں سے چھلکنے لگا۔

''بابا یہ اس سمے کون سا قافلہ ہے؟'' نوری نے قدرے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

''ہمیں کیا بیٹا کہیں سے آئے ہوں گے' کہیں چلے جائیں گے۔ ہمیں نہ ان لوگوں کے آنے سے غرض' نہ ان کے جانے سے علاقہ۔'' انہوں نے چراغ کی تھرکتی لو پر پتنگوں کا رقص دیکھا۔

نوری ان کے نزدیک پلنگ پر بیٹھ گئی اور بستر پر بچھی ہوئی چادر کی سلوٹوں کو اپنی انگلیوں سے نکالنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ جانتے تھے کہ نوری اس لمحے اس طرح کیوں بیٹھی ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ جب انسان کچھ بھی نہ کر سکتا ہو تو خاموش رہنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے؟ آٹا کل رات ختم ہو گیا تھا۔ صبح اور دوپہر کو ان دونوں نے مٹھی بھر کھجور اور مکئی کے بھنے ہوئے دانوں پر گزارا تھا۔ نوری کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اب گھر میں کچھ بھی نہیں رہا ہے۔

نوری بیٹھی رہی۔ وہ بیٹھے رہے۔ ان کے درمیان خاموشی کی الگنی کھنچی رہی اور اس پر نہ بولے جا سکنے والے جملوں کے کٹے پھٹے ٹکڑے پھڑ پھڑاتے رہے۔ چراغ کی لو پر پتنگوں کا رقص جاری رہا۔ یہ روشنی دیکھتے ہی جانے کہاں سے چلے آتے ہیں اور اتنے ذوق شوق سے مرتے چلے جاتے ہیں جیسے مر جانے میں ہی ان کی زندگی ہو۔ اپنے خیال پر انہیں جھرجھری سی آئی۔

انہیں وہ دن یاد آئے جب وہ ماسٹر فیض بخش کہلاتے تھے اور جوانی کے منہ زور گھوڑے پر ان کی سواری نئی نئی تھی۔ بہت سے دوسرے سر پھرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی آزادی کی پری پر فدا تھے اور یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کا جانا اور اس پری کا ہاتھ آنا بس مہینوں اور دنوں کی بات ہے۔ ان دنوں وہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد سکھر کے ایک سکول

میں تاریخ پڑھاتے تھے اور شاگردوں کو صحیح تاریخ پڑھا کر ہندوستان کی تقدیر بدل دینا چاہتے تھے۔

وہ جب کلاس روم میں کھڑے ہوتے اور شاگردوں کی متجسس، ذہین اور حیران نگاہیں ان پر جمی ہوئی ہوتیں تو نصاب کی کتاب میں لکھے ہوئے لفظ ان کی نگاہوں کے سامنے سے چڑیا بن کر اڑ جاتے۔ فتحِ سندھ پڑھاتے ہوئے ان کا دل باڑھ پر آئے ہوئے سندھو کی طرح کناروں سے چھلک پڑتا اور وہ بھول جاتے کہ نصابی کتابوں کے صفحوں پر انگریز فاتحین کے بارے میں کیا کیا قصیدے لکھے ہیں۔ قلعہ امام گڑھ کی فتح، جنگ میانی اور دوسری جنگیں پڑھاتے ہوئے وہ کرنل سر الیگزنڈر برنس، سر چارلس نیپئیر اور سر ہنری بارٹل ایڈورڈ فریئر کی بدعہدیاں، سازشیں اور محلاتی ریشہ دوانیاں بیان کرنے لگتے۔

میران سندھ کی شکست کا داغ ان کا سینہ جلاتا تھا۔ بیگماتِ میرانِ حیدر آباد کی عرضداشت انہیں نوک بر زبان تھی جو انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کو ارسال کی تھی۔ اپنے شاگردوں کو یہ عرضداشت سناتے ہوئے جب وہ ان سطروں پر پہنچتے کہ:

"ہم لاچار خواتین زور و قوت سے محروم، سر چارلس جیمز نیپیئر کی آمد کے وقت اپنے محلات میں مقیم تھیں کہ وہ ہماری رہائش گاہوں میں داخل ہو گیا اور ہمیں اس طرح لوٹا کہ زندہ رہنے کے لئے ایک تنکا نہ چھوڑا۔ پورے دو سال گزر چکے ہیں کہ جب اس نے ہم کو اپنے مکانات اور آبائی شہر سے بے گھر کیا اور مجبور کیا کہ ہم حیدر آباد سے باہر جھونپڑوں میں مثل خانہ بدوش کے رہیں....."

تو ان کی آواز گلوگیر ہو جاتی اور اپنے آنسو وہ بمشکل ہی پیتے۔

اسی طرح حکومت انگلشیہ کا وہ اشتہار جو میر علی مراد خان کی معزولی کے لئے جاری کیا گیا تھا اور جسے ان کی رعایا میں تقسیم کیا گیا تھا۔ جس کی اختتامی سطریں انہیں آج بھی یاد تھیں کہ:

"لہٰذا حکومت انگلشیہ اعلان کرتی ہے کہ میر مراد علی خان کو ان کے عہدۂ ریاست سے برطرف کیا جاتا ہے اور تمام ملک سوائے اس علاقے کے جو میر سہراب خان سے انہیں

وراثت میں ملے ہیں، انگریزی علاقے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ پس تمام رعایا جو ان علاقوں میں رہتی ہے، وہ آئندہ سے اپنے آپ کو انگریزی حکومت کی رعایا سمجھے اور اس کے احکام و قانون کی پابندی کرے تو اسے کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا۔''

یہ اور اسی قسم کی توہین آمیز دوسری دستاویزات کا ایک ایک لفظ انہیں ڈستا تھا اور اس قلبی اذیت اور کرب کا اظہار وہ اپنے شاگردوں کے سامنے اور ساتھی استادوں کے درمیان بیٹھ کر کرتے تھے۔ یہ باتیں بھلا کس کی چھپی ہیں جو ان کی ڈھکی چھپی رہتیں۔ چند سال اسی طرح گزر گئے، لیکن پھر باتیں اسکول کے احاطے سے باہر نکلنے لگیں۔ انہیں دنوں ان کا اٹھنا بیٹھنا بھی ان لوگوں میں زیادہ ہونے لگا جو انگریزی حکومت کے دشمنِ جانی تھے اور کھلم کھلا اسے برا کہتے تھے۔

بات اڑتی اڑتی محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ افسروں تک پہنچی اور پھر ایک روز ڈائریکٹر تعلیمات کے دفتر میں ان کی طلبی ہوئی۔ ماسٹر فیض بخش جوانی کے جوش میں بھرے ہوئے اور مصلحت کی رسیوں سے بندھے ہوئے وہاں پہنچے۔ سوال شروع ہوئے تو انہوں نے بہت گھما پھرا کر جواب دیئے، لیکن انگریز ڈائریکٹر جب اس حقیقت کو پا گیا کہ بات وہی درست ہے جو اس تک پہنچی ہے تو دھیمے لہجے میں باتیں کر کے اس نے انہیں رخصت کر دیا۔

ماسٹر فیض بخش انگریز کی رگ رگ سے واقفیت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اسے نہیں جانتے تھے۔ وہ اس ملاقات سے خاصے مطمئن ہو کر گھر کو آئے۔ اس رات گھر کے آنگن میں لیٹ کر وہ دیر تک سات ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے رہے اور

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں

شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

گنگناتے رہے۔ ستاروں کا غبار جب ان کی آنکھوں میں خوابوں کی دھند بن کر اترنے لگا تو انہوں نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا جس کا سنولایا ہوا نمکین بدن ان کی خواہشوں کا رمنا تھا اور وہ اس کی سیر کو نکل گئے۔

کئی دن گزر گئے۔ انگریز ڈائریکٹر کی طلبی نے جو خلش پیدا کی تھی؛ وہ ذہن کے کسی دورافتادہ گوشے میں جاسوئی۔ اس روز جب وہ آٹھویں جماعت کے طالبعلم کو کلکتہ کے ''بلیک ہول'' کے بارے میں پڑھا کر اس ''افسانے'' کی ''حقیقت'' انہیں سمجھا کر نمٹے تو اسکول کی چھت پر چلے گئے کیونکہ ان کا اگلا گھنٹہ خالی تھا۔ چھت سے انہیں قدرے دوری پر بہتا ہوا سندھو نظر آرہا تھا۔ سنہری دھوپ سندھ کی لہروں میں رل مل گئی تھی۔ شہر کے درودیوار سے لپٹی ہوئی تھی اور ہواؤں میں دوپہر کے تپتے ہوئے پنڈے کی نمکین خوشبو تھی۔ زندگی خوبصورت تھی اور آئندہ بھی خوبصورت رہنے کے تمام امکانات رکھتی تھی۔

تب پٹے والا انہیں ڈھونڈتا ہوا چھت پر چلا آیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں بلایا تھا۔ وہ بوسکی کی قمیص کے ان دو اوپری بٹنوں کو بند کرتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگے جنہیں انہوں نے گرمی کے سبب چھت پر پہنچ کر کھول دیا تھا۔ وہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں پہنچے تو خاکستری رنگ کا ایک لفافہ ان کا منتظر تھا۔ اس لفافے میں ان کی برطرفی کا پروانہ تھا۔

انگریزی میں ٹائپ شدہ چند سطروں نے ماسٹر فیض بخش کی زندگی کے زمین و آسمان بدل دیئے۔ شروع شروع میں تو انہیں یہی خیال رہا کہ خدا کا شکر ہے انگریز کی غلامی سے نجات ملی' لیکن غلامی سے نجات پانے کی جو قیمت انہوں نے ادا کی تھی؛ وہ جلد ہی ان کی استطاعت سے زیادہ ثابت ہونے لگی۔ وہ تنہا ہوتے تو انہیں ذرا سی بھی الجھن نہ ہوتی' لیکن دو برس کی بیاہی ہوئی بیوی اور چند مہینوں کی نوری ان کے لئے سزا بن گئیں۔ پیڑھیوں کی غربت نے قناعت پسندی کو لوگوں کے مزاج کا حصہ بنا دیا تھا' لیکن مشکل یہ تھی کہ ماسٹر فیض بخش کے پاس تھوڑی سی زمین بھی نہ تھی کہ جس پر ہل بیل لے کر کھڑے ہو جاتے اور سال بھر کا اناج اگا لیتے۔

انہوں نے سکھر سے حیدر آباد تک بہت بھاگ دوڑ کی۔ پرائیویٹ ہائی اسکول تو ایک طرف رہے' پرائمری اسکولوں کی دہلیز کی بھی دھول لے ڈالی' لیکن ملازمت ان کے لئے مینہ سے بھرا ہوا وہ بادل بن گئی جو بھولے سے بھی صحرا پر سے نہیں گزرتا۔

ان کا اٹھنا بیٹھنا عبیداللہ سندھی کے چند معتقدوں میں بھی تھا۔ یہ لوگ دوسروں کے لئے عجوبہ تھے کیونکہ جب دیکھو نین کا بکس اٹھائے اور دری میں تکیہ لپیٹے ہوئے سفر کے لئے تیار رہتے تھے۔ انہی میں سے ایک شیخ عبدالقدوس تھے۔ وہ ''ریشمی رومال'' تحریک سے وابستہ رہے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ماسٹر فیض بخش کو بتایا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس زعفرانی ریشمی رومال کو دیکھ چکے ہیں جو بطور خط بھیجا جانے والا تھا۔ جس پر عربی عبارت مولوی عبیداللہ سندھی نے خود اپنے ہاتھوں سے کاڑھی تھی اور جسے انہوں نے اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی اور اپنے معتمد خاص شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی کے سپرد کیا تھا۔ شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی اس رومال نما خط کو کسی معتبر حاجی کے ذریعے شیخ الہند کو حجاز بھجوانے والے تھے کہ اپنوں نے مخبری کی' رومال فوج کے ہاتھ لگا' اور اس پر کڑھی ہوئی کابل کے راستے 19 فروری 1917ء کو ہندوستان پر حملے کے منصوبے کی تفصیلات کو کیڑوں نے کھایا۔

شیخ عبدالقدوس سے ماسٹر فیض بخش کو ربط خاص تھا' جب انہوں نے اپنی پریشانی کئی بار شیخ عبدالقدوس سے بیان کی تو انہوں نے ماسٹر فیض بخش کو سمجھایا کہ سرکاری نوکری سے برطرفی کا مطلب یہ ہے کہ سرکار تم سے ناراض ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں جان پہچان کے لوگوں میں تو نوکری ملنے سے رہی' تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ کچھ دنوں کے لئے سکھر چھوڑ دو اور کسی دور دراز علاقے میں اپنی قسمت آزماؤ۔

سکھر چھوڑنے کا مشورہ سن کر ہی ماسٹر فیض بخش کو جھمیریاں سے آ گئیں۔ اب یہ پیمبری وقت بھی ان پر پڑنا تھا کہ روزی روٹی کے لئے اپنی مٹی چھوڑ دیں' اپنا گھر در ترک کریں اور کسی پرائی زمین پر کسی نئے آسمان کے نیچے جا کر رہیں۔ انہوں نے اس مشورے سے گھبرا کر ہفتوں شیخ عبدالقدوس کے گھر کا رخ ہی نہیں کیا لیکن مانگے تانگے کی روٹی پر بھلا کب کسی کی زندگی گزری ہے' جو ماسٹر فیض بخش کی گزرتی۔ چند ہی دنوں میں گھر کے درودیوار سے بھوک کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ سفید لٹھے کی شلوار پر ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیص اور اس پر زین کا کوٹ پہننے والے خوددار اور خودشناس ماسٹر فیض بخش کا سارا وجود ان لپٹوں سے جھلسنے لگا۔

آخر کار اک شام جب دوسرے گھروں میں چراغ جل اٹھے تو وہ سر جھکائے ہوئے اپنے گھر سے نکلے اور شیخ عبدالقدوس کے پاس جا پہنچے۔ شیخ عبدالقدوس نے بتایا کہ وہ دو دن بعد سفر پر نکل رہے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو ان کے ساتھ چل نکلیں۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے، کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔

''لیکن شیخ صاحب، آخر کچھ تو پتا چلے کہ جانا کہاں ہے؟'' ماسٹر فیض بخش نے گھبرا کر شیخ عبدالقدوس کی شکل دیکھی۔

''گھبراتے کیوں ہو، جب یہاں سے چلو گے تب ہی تو کہیں پہنچو گے۔''

انہوں نے فلسفیانہ انداز میں کہا اور اپنے قلم میں قط لگانے میں مصروف ہو گئے۔

ماسٹر فیض بخش تھوڑی دیر سر جھکائے ان کے پاس بیٹھے رہے، پھر منہ لٹکائے ہوئے گھر واپس آ گئے۔ وہ تمام رات انہوں نے جاگتے ہوئے اور اپنے گھر کے آنگن میں ٹہلتے ہوئے گزار دی۔ یہ مکان بھی اب انہیں جلد ہی خالی کر دینا تھا کیونکہ کئی مہینے سے وہ اس کا کرایہ نہیں دے پائے تھے۔ اس رات سات ستاروں کا جھمکا آسمان پر چمکتا رہا اور منتظر رہا کہ وہ اسے نگاہ اٹھا کر دیکھیں، لیکن نہ انہوں نے بنات النعش گردوں کی طرف دیکھا اور نہ ان کے قدم اس ہرے بھرے جنگل کی طرف اٹھے جو ان کا رمنا تھا۔

صبح ہوئی تو وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ بیوی کو جب انہوں نے اپنا فیصلہ سنایا تو پہلے تو وہ بڑبڑاتی رہی پھر بیزاری سے سامان سمیٹنے لگی۔ سکھر کے اس گھر میں اس نے چودھرانیوں والی زندگی گزاری تھی اور اب اس سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے۔

دوپہر تک گھر کا سارا اسباب بندھ گیا۔ ماسٹر فیض بخش نے وہ سامان دو بیل گاڑیوں پر لدوایا اور بیوی اور بیٹی سمیت اپنے گاؤں کا رخ کیا جو سکھر سے کچھ فاصلے پر تھا اور جہاں دو کمروں کا ایک آبائی گھر ان کا منتظر تھا۔ رات گئے وہ گاؤں پہنچے جیسے تیسے سامان گھر میں اتارا، بیوی کے ہاتھ پر چند روپے رکھے جو کسی دوست سے ادھار مانگ کر لائے تھے۔ اس سے جلد ہی منی آرڈر بھیجنے کا وعدہ کیا اور منہ اندھیرے ایک بیل گاڑی میں اپنا بکس اور بستر

رکھ کر واپس سکھر کا رخ کیا۔

بیل گاڑی سکھر شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو سورج سوا نیزے پر تھا۔ انہوں نے بیل گاڑی والے کو شیخ عبدالقدوس کے گھر کا پتا بتایا۔ اور جب گاڑی ان کے دروازے کے سامنے رک گئی تو ماسٹر فیض بخش نے گاڑی سے اتر کر اپنا مختصر سا سامان اتار کر گلی میں رکھا' بیل گاڑی والے کو محنتانہ دیا اور جب وہ رخصت ہو گیا تو شیخ عبدالقدوس کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

دروازہ کھٹکا تو بنیان اور شلوار پہنے ہوئے مسواک کرتے ہوئے شیخ عبدالقدوس ان کے سامنے کھڑے تھے اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''میں آ گیا ہوں ....'' ماسٹر فیض بخش نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ شیخ عبدالقدوس نے سر ہلایا اور گھر کا دروازہ کھول دیا۔ ماسٹر فیض بخش نے اپنا سامان اٹھا کر گھر کے آنگن میں رکھا اور خود بھی اندر آ گئے۔

اس روز بعد دوپہر دونوں ریل سے روانہ ہوئے۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس کا شاید کوئی انت نہ تھا۔ کم از کم ماسٹر فیض بخش کو تو یہی محسوس ہونے لگا تھا۔ شیخ عبدالقدوس مختلف شہروں میں رکتے رکاتے' مسجدوں کے حجروں میں ٹھہرتے ہوئے' سراؤں میں قیام کرتے ہوئے تقریباً ایک مہینے بعد دلّی پہنچے۔ دلّی پہنچ کر شیخ عبدالقدوس نے محلہ سوئی والاں کا رخ کیا اور وہاں محنتی پرائیویٹ اسکول میں جا اترے۔ مولانا حالی کے بیٹے ماسٹر احمد علی خان اس کے روح رواں تھے۔ کئی دن تک شیخ عبدالقدوس ان کے ساتھ جانے کہاں کہاں آتے جاتے رہے۔ ماسٹر فیض بخش' درگاہ نظام الدین اور دوسرے مزاروں پر حاضری دیتے رہے۔ ہر جگہ گریہ کیا' ہر مقام پر دست بہ دعا ہوئے' گھر کی' بیوی اور نوری کی یاد سینے میں برما چلاتی رہتی تھی۔ جو روپے بیوی کے ہاتھ پر رکھ کر چلے تھے وہ کب کے ختم ہو چکے ہوں گے۔ وہ نیک بخت کیا کر رہی ہو گی۔ گزر گزران کیسے ہو رہی ہو گی۔ یہی خیالات انہیں ہر وقت بکل رکھتے' لیکن دلّی پہنچ کر انہیں قدرے اطمینان ہو گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ محنتی پرائیویٹ اسکول میں مدرس ہو جائیں گے۔ لیکن جب شیخ عبدالقدوس

صاحب نے وہاں سے بھی رختِ سفر باندھا تو فیض بخش گھبرا گئے۔
''شیخ سائیں اب کہاں کا ارادہ ہے؟''
''ہم کیا اور ہمارا ارادہ کیا' اللہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ ہماری ایک ایک حرکت اسی کے تابع ہے۔ ہم تو بس چلتے رہیں گے پھر اشارہ جہاں کا ہوگا وہیں ٹھہر جائیں گے۔''
ماسٹر فیض بخش نے یہ سن کر سر جھکا دیا۔ انگریزی تعلیم ان کے اندر کے صوفی کو ختم نہیں کرسکی تھی اور اب چند مہینوں سے وہ جس ابتلا میں گرفتار تھے' اس نے انہیں تصوف کی طرف کچھ اور بھی زیادہ مائل کر دیا تھا۔
اسٹیشن پر پہنچ کر شیخ صاحب نے ماسٹر فیض بخش کو مختصر سے سامان کے پاس کھڑا کیا اور لپک کر جانے کہاں کے دو ٹکٹ بنوائے اور اپنی جیب میں رکھ لئے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگی تو دونوں تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں براجمان ہوگئے۔ ریل چلی اور چلتی ہی چلی گئی۔ اسٹیشن آتے رہے' ریل رکتی رہی' لیکن شیخ صاحب نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔ ماسٹر فیض بخش کا دل ہر کوس پر ڈوبتا رہا۔ شاید انہوں نے شیخ صاحب کا ساتھ پکڑ کر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ اجنبی ماحول' اجنبی لباس' اجنبی زبان' ہر لحہ وہ اپنے گھر سے اپنی زمین سے دور ہوتے چلے جارہے تھے۔
گاڑی لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ماسٹر فیض بخش نے اسٹیشن کی عمارت کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہ اسٹیشن کی عمارت کاہے کو تھی راجہ کا محل تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر ٹہل ٹہل کر عمارت کو مختلف زاویوں سے دیکھتے رہے۔ لوگوں کے مترنم لہجے کو سنتے رہے اور لوگ انہیں دیکھتے رہے۔
لکھنؤ سے گاڑی روانہ ہوئی تو شیخ عبدالقدوس نے بتایا کہ ان کی منزل کانپور ہے اور دو اسٹیشنوں بعد کانپور آجائے گا۔ ماسٹر فیض بخش نے کانپور کا نام تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ یہ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ جنگ آزادی کے دوران یہ شہر نانا صاحب نے بڑے زبردست معرکے کے بعد فتح کیا تھا۔ انگریزی قبضے سے چھڑوایا تھا۔ یہ بھی وہ جانتے تھے کہ وہاں اسلحہ بنانے کی فیکٹری ہے۔ اس کے آگے ان کی معلومات کا خزانہ خالی ہو جاتا

تھا۔

وہ کھڑکی سے گردن نکال کر بیٹھ گئے۔ سرسبز منظر ان کی نگاہوں کے صحرا میں اڑتے ہوئے تیتر کی طرح لحظہ بھر کے لئے نمودار ہوتے اور پھر کہیں دور نکل جاتے۔ اناؤ کا اسٹیشن آیا اور پھر مگروارے کا۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ مگروارے ہی سے پرانے کانپور کے آثار شروع ہو جاتے ہیں اور یہ بھی کہ عوام الناس کانپور کو 'کمپو' کہتے ہیں۔ ریل پل پر سے گزرنے لگی تو ماسٹر فیض بخش نے گنگا کے پاٹ کو دیکھا جو دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور بہت ہی چوڑا تھا۔

اسٹیشن پر اتر کر شیخ صاحب نے تانگہ کیا اور تانگے والے کو گوال ٹولی چلنے کو کہا۔ گوال ٹولی میں وہ جن صاحب کے ہاں اترے ان کا نام حمید الدین تھا۔ وکیل تھے۔ دیوانی مقدمات لڑتے تھے اور شیخ عبدالقدوس کے معتقد تھے۔

شیخ صاحب گوال ٹولی میں وکیل صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ اور دوسرے ہی دن سے ماسٹر فیض بخش کو ساتھ لے کر روزانہ حلیم ہائی اسکول کا چکر لگانے لگے۔ وہاں انہوں نے جادو کی جانے کون سی ایسی چھڑی گھمائی کہ کانپور پہنچنے کے چھٹے دن ماسٹر فیض بخش حلیم ہائی اسکول میں تاریخ اور فارسی پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ جس روز تقرری کا پروانہ ملا ہے شیخ صاحب نے اس روز ماسٹر فیض بخش کو تنہا اسکول بھیجا تھا۔ تقرری کا پروانہ ماسٹر فیض بخش کے ہاتھ میں آیا تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا پھر جب یقین آیا تو انہوں نے گھر پہنچ کر شیخ عبدالقدوس کے قدم چھونے چاہے۔

''اللہ کے ایک گنہگار بندے کو مزید گنہگار کیوں کرتے ہو۔'' شیخ صاحب نے یہ کہتے ہوئے اپنے پیر پلنگ سے اتارے کھڑاؤں میں ڈالے اور سر پر زرد رنگ کا چارخانہ رومال لپیٹتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ذرا ایک تانگہ تو پکڑنا''

ماسٹر فیض بخش لپک کر تانگہ لائے تو دیکھا کہ شیخ عبدالقدوس کا ٹین کا بکس اور بستر گلی میں رکھا ہے اور وہ اپنا تن و توش سنبھالتے ہوئے وکیل صاحب کے گھر سے نکل رہے ہیں۔

''خیریت سائیں؟'' ماسٹر فیض بخش نے گھبرا کر پوچھا۔
''بس اب ہم چلے' آب و دانہ اٹھ گیا یہاں سے۔''
''لیکن کہاں شیخ سائیں؟''
''یہ ''کہاں'' کون سا مقام ہے نقشے میں دیکھ کر رکھنا''۔ شیخ صاحب نے اپنا ٹین کا بکس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ماسٹر فیض بخش نے اسے ان کے ہاتھ سے لے لیا اور تانگے میں رکھ دیا۔
''وکیل صاحب کا انتظار تو کر لیتے سائیں۔''
''فقیر صرف موت کا انتظار کرتے ہیں' آدمیوں کا نہیں۔'' انہوں نے تانگے کے پائیدان پر پیر جمایا اور سنبھل کر چڑھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی تانگے والے نے تانگہ بڑھایا۔ آن کی آن میں تانگہ گلی سے نکل گیا' بس گھوڑے کے سموں سے اڑنے والی دھول رہ گئی۔
ماسٹر فیض بخش کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ شیخ عبدالقدوس تھے تو جیسے گھر ساتھ ساتھ چل رہا تھا اپنی زمین پیروں کے نیچے تھی اور اپنا آسمان سر کے اوپر تھا۔ انہیں کپکپی سی چڑھنے لگی۔
وکیل صاحب کچہری سے آئے تو ماسٹر فیض بخش نے انہیں شیخ صاحب کے جانے کی خبر سنائی۔ حمیدالدین وکیل سر ہلا کر رہ گئے۔ وہ شاید شیخ صاحب کی اچانک آمد اور اس سے بھی زیادہ فوری رخصت کے عادی تھے۔ پھر ماسٹر فیض بخش نے اپنا تقرری کا پروانہ وکیل صاحب کو دکھایا اور عرض کی کہ اگر مستقل رہائش کا بھی کوئی بندوبست ان کے توسط سے ہو جائے تو...... وکیل صاحب نے یہ سن کر بھی اسی طرح سر ہلایا جس طرح شیخ صاحب کے جانے کی خبر پر ہلایا تھا اور خاموشی سے اٹھ کر زنان خانے میں چلے گئے۔
دوسرے روز وکیل صاحب کچہری میں جاتے ہوئے انہیں بھی ساتھ لے گئے۔ دوپہر تک ماسٹر فیض بخش کے لئے پھول باغ میں رہائش کا انتظام ہو چکا تھا۔ یہ بھی ایک وکیل صاحب کا گھر تھا گھر کے پچھواڑے ایک کمرا اور بیت الخلا تھا۔ اظہار الحق صاحب وکیل نے یہ حصہ ماسٹر فیض بخش کو چند روپوں میں کرائے پر دے دیا۔ وہ اسی شام اپنے

''گھر'' میں منتقل ہو گئے اور دو دن بعد انہوں نے حلیم ہائی اسکول میں مدرسی شروع کر دی۔
روٹی انسان کو اس قدر ذلیل کرتی ہے اور اپنے پیاروں سے اس طرح دور پھینک دیتی ہے' اس حقیقت کا صحیح اندازہ انہیں اب ہو رہا تھا۔ وہ پابندی سے اسکول جاتے' جی لگا کر بچوں کو پڑھاتے' لیکن جب ان کا لب و لہجہ اور ان کی وضع قطع کبھی کسی شاگرد کی زیرلب مسکراہٹ اور کبھی کسی ساتھی استاد کے پُرلطف جملے کا سبب بن جاتی تو سینے میں ایک نشتر سا ٹوٹ جاتا۔

شام ہوتی تو گھر کا خیال ان کی نس نس میں کھٹکنے لگتا اور وہ بے تاب ہو کر گلیوں میں چکراتے پھرتے۔ گنگا کے کنارے پر آباد یہ شہر ان کے لئے ولایت سے کم نہ تھا۔ کہاں کچھ سوتے اور کچھ جاگتے ہوئے سکھر کی ندی کی طرح دھیمے دھیمے بہتی ہوئی زندگی اور کہاں بھنور ڈالتے ہوئے پُرشور دریا ایسا کانپور۔ ٹینریاں' اسلحے کی فیکٹری' کپڑے' تیل' بسکٹ' شکر' صابن اور کیمیکلز کے کارخانے' ریلوے کالونیاں' فوجی ہوائی اڈہ' جرنیلی سڑک پر دلّی سے کلکتہ اور کلکتہ سے دلّی کے مسافروں اور سواریوں کی ریل پیل' بازاروں میں انسانوں کا اژدہام اور دکانوں میں سامان کی بہتات۔ آہستہ آہستہ وہ اس نئے شہر کے اسیر ہوتے گئے۔ اور پھر ایک دن ان کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی جو آرڈننس فیکٹری میں ملازم تھا اور انقلابی شاعری کرتا تھا۔ چند ہی دنوں کی ملاقاتوں میں دونوں ایک دوسرے سے یوں شیر و شکر ہو گئے جیسے برسوں پرانے دوست ہوں۔

اس کا اصل نام تو نہ جانے کیا تھا شعلہ کانپوری کے نام سے مشہور تھا۔ ''الٰہی وہ بھی دن ہو گا جب اپنا راج دیکھیں گے۔ جب اپنی ہی زمیں ہو گی اور اپنا آسماں ہو گا'' ہر وقت اس کے وردِ زباں رہتا۔ شعلہ نے ان کی ملاقات خوشی رام سے کروائی۔ خوشی رام' حیدر آباد کا رہنے والا تھا اور روزگار کی تلاش میں انہی کی طرح بہتا بہاتا کانپور آ پہنچا تھا اور ایک دکان پر بہی کھاتہ لکھتا تھا۔

خوشی رام نے چھوٹتے ہی ان سے سندھی میں کلام کیا تو ماسٹر فیض بخش باؤلے ہو ''ارے میرے سوہنے سائیں' تُو تو واقعی خوشی رام ہے'' انہوں نے اسے سینے سے لگایا'

اس کے رخسار چومے اور خلاف عادت اس کے کندھوں پر ہاتھ مار کر بہ آواز بلند ہنستے چلے گئے۔ خوشی رام سے ملاقات کے بعد ان کے سر پر پھر اپنا آسمان چھا گیا اور پیروں کے نیچے اپنی زمین بچھ گئی۔

شعلہ کانپوری اور خوشی رام ایک دوسرے کے یار غار تھے۔ پہلے تو ماسٹر فیض بخش کی سمجھ میں دونوں کی اتنی گہری دوستی کا سبب نہ آیا لیکن جب وہ ان دونوں کے قریب آتے گئے' ان کے دوسرے دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا بڑھا تو آہستہ آہستہ ایک نیا منظر نامہ ان کی نگاہوں کے سامنے کھلتا چلا گیا۔ اس منظر نامے کے کرداروں میں بنگالی بھی تھے بہاری بھی' پنجابی بھی تھے اور تامل بھی' کچھ نوجوان کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ گوا کے عیسائی تھے۔ ان سرپھروں سے مل کر ماسٹر فیض بخش کو یوں محسوس ہوا جیسے مختلف علاقوں سے آنے والے یہ سب لوگ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر جلد ہی وہ خود بھی اس خاندان کا ایک فرد بن گئے۔ یہ اتر پردیشی انقلابیوں کی بنائی ہوئی ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن تھی۔ اس میں کیسے کیسے نام تھے' وہ نام جو تاریخ کا حصہ بن گئے۔

گزرے ہوئے زمانے کے بارے میں سوچتے ہوئے سائیں فیض بخش کے خون میں بھنور سا پڑا۔ ان کا نام بھی ان ناموں کے ساتھ تاریخ کا حصہ بن سکتا تھا لیکن تاریخ اپنے صفحوں پر نام لکھوانے والوں سے دان مانگتی ہے۔ جسم وجاں کا دان' رشتوں اور جذبوں کا دان۔

ان دنوں اکثر وہ اپنے بارے میں سوچتے۔ فرنگی سے انہیں بھی دلی نفرت تھی' اتنی نفرت کہ وہ اپنی سرکاری ملازمت سے برطرف ہوئے تھے اور وطن سے سینکڑوں میل دور دو روٹیاں کمانے کی خاطر پڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی آزادی کے خواب دیکھتے تھے پھر وہ کیا بات تھی کہ جس نے ان نوجوانوں کی طرح انہیں انقلابی نہ بننے دیا۔ بہت غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ شاید انقلاب کی آگ ابھی ان کے اندر اتنی نہیں دہکی کہ اس بھٹی میں پرانے رشتے پگھل کر نئے رشتوں میں ڈھل جائیں۔ اور شاید یہ بھی تھا کہ وہ اپنے اندرون میں صوفی تھے۔ وہ حضرت ابوالحسن نوری کے معتقد تھے اور اس قول پر ان کا

ایمان تھا کہ تصوف' ایک ایسی آزادی ہے کہ بندہ قید حرص سے آزاد ہو جاتا ہے اور تصوف' تکلفات کا ایسا ترک کر دینا ہے کہ بندہ ہر تعلق اور مقسوم کے اندر خوش رہتا ہے اور تصوف ایک ایسی سخاوت کا نام ہے کہ دنیا اہل دنیا پر چھوڑ دیتا ہے اور خود بے تعلق ہو جاتا ہے۔ اس قول پر ایمان رکھنے کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی قوت نہیں پاتے تھے کہ اس قول کی تصویر بن جائیں اور ترک کی منزلوں سے گزر جائیں۔ جب وہ اپنے آپ کو نہ مکمل انقلابی پاتے اور نہ پور پور صوفی تو ان پر جھنجھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ ایسے عالم میں وہ گنگا کے کنارے گھنٹوں تنہا ٹہلتے جاتے اور بھاون علی شاہ ساقی کا مصرع'

بتا اے مرغ دل تُو نے کہاں اپنا وطن چھوڑا

گنگناتے جاتے۔ دل کی اداسی کا رنگ جب گہرا سرمئی ہو جاتا تو کپڑے کنارے پر رکھ کر دریا میں اتر جاتے اور سرمئی اداسی کو گنگا کے پوتر پانی سے دھونے کی کوشش کرتے۔ خواہش کے باوجود وہ نہ کھرے انقلابی بن پائے تھے اور نہ سچے صوفی۔ وہ ہر مہینے پابندی سے بیوی کے نام منی آرڈر بھیجتے' ہفتے دو ہفتے میں اسے خط لکھتے جو محض خیریت ہی پر مشتمل ہوتا تھا کیونکہ ان کا بھیجا ہوا پوسٹ کارڈ ان کی بیوی خود نہیں پڑھ سکتی تھی' ان دو ذمہ داریوں سے نمٹ کر باقی وقت وہ ان نوجوانوں کے ساتھ گزارتے تھے جنہیں پارٹی فنڈ سے روزانہ کے اخراجات کے لئے صرف ایک چونی ملتی تھی اور جن پر انہیں رشک آتا تھا۔ یہ لڑکے اپنے گھر در چھوڑ کر خان بہادروں اور رائے بہادروں اور انگریز کے پروردہ منصب داروں کی ناک کے نیچے پمفلٹ بانٹتے' تھانوں پر بم مارتے' ریل کی پٹڑیاں اکھاڑتے' کندھوں پر لئی کا کنستر رکھے' ہاتھوں میں قلعی گروں والی کونچی لئے دیواروں پر پوسٹر چپکاتے پھرتے اور جب موج میلے کا جی چاہتا تو رکشے والوں اور تانگے والوں کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں دیکھتے۔ بھنے ہوئے چنے کی پھنکی مارتے' میونسپلٹی کے نل سے پانی پیتے اور پھٹپھٹیا پر کوئی فرنگی گزرتا ہوا نظر آتا تو میرا رنگ دے بسنتی چولا' اسی رنگ میں رنگ کے شیوا نے ماں کا بندھن کھولا' گاتے ہوئے اور اینڈتے ہوئے گزر جاتے۔

یہ لمڈے راجپوت نہ تھے' لیکن ان کی طرح کیسری بانا پہنے' جوہر کے لئے تیار رہتے

تھے۔ ان دنوں کاکوری کیس کا شہرہ تھا۔ اشفاق اللہ خان' رام پرساد بسمل' روشن سنگھ لاہڑی' پھانسی کے تختے پر دولہا بننے والوں کے ناموں کی ایک کہکشاں تھی جس کی چھوٹ سے تمام ہندوستان جگمگا رہا تھا۔

ان کے صوفیانہ مزاج کے باوجود خوشی رام نے انہیں اس حد تک سرگرم تو کر ہی دیا تھا کہ اب وہ کانپوری کلرکوں اور پیشہ وروں کے بچوں کو تاریخ اور فارسی پڑھانے کے ساتھ ہی چندر شیکھر آزاد' وجے کمار سنہا' سکھ دیو اور درگا دیوی کے پیغامات متعلقہ لوگوں کو پہنچاتے تھے اور نہایت کامیاب ''کوریئر'' ثابت ہوئے تھے۔

وہ عجب دن اور عجب راتیں تھیں' دن اسکول میں کتابوں' کاپیوں' ذہین اور کند ذہن شاگردوں اور غبی ساتھیوں کے درمیان گزرتا' شام ہوتی تو خوشی رام اپنا بہی کھاتہ نمٹا کر ان کے پاس آ جاتا پھر وہ دونوں دوسرے دوستوں سے ملنے کے لئے چل دیتے۔ خوشی رام کی آواز بہت دلکش اور پُرسوز تھی۔ آسمان جب نارنجی سے سرمئی ہونے لگتا اور ہواؤں میں جب پھولوں کی خوشبو کھلنے لگتی تو وہ مست ہو کر بہ آواز بلند گانا شروع کر دیتا۔ شاہ کی کافیاں' سچل کا کلام' سوبھا فقیر کی ایک کافی اسے بہت محبوب تھی جس کا تھلہ نظیر اکبر آبادی کے مشہور مصرعے کی تضمین تھی' ''سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ'' سب غمزے رمزے چل گئے اٹھڑے راجل کون رجھاوے گا۔ آوت جاوت چل گئے راگت' بینت کون بجاوے گا۔ دھانت خیانت چل گئی امانت سوبھل کون سیڈاوے گا۔

اس کی آواز کا پکھیرو جب ماسٹر فیض بخش کی سماعت میں اڑان بھرتا تو ان کی نس نس جانے کس کے ہجر میں ہرن کی بچی اور دھوپ کھائی ہوئی کھال کی طرح تڑخنے لگتی۔ تنانا ھویاھو۔ تنانا ھویاھو۔ اور کبھی تو ہجر کا پرندہ سینے میں اس بے قراری سے گنگتا جیسے ہڈیوں کا پنجرا توڑ کر ابھی باہر آ جائے گا۔ تب وہ کسی درگاہ کسی تکیے میں جا بیٹھتے اور محفل سماع میں شریک ہو کر گھنٹوں ایک ہی مصرعے کے مفاہیم کی شناوری کرتے۔

خوشی رام' شعلہ کانپوری اور بعض دوسرے انقلابی دوست ان کی اس روش پر شور مچاتے' انہیں ''مولوی فیض بخش قدس سرہ'' اور ''حضرت مولانا فیض بخش نور اللہ'' کے ناموں

سے پکارتے اور وہ دوستوں کی اس چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہوتے۔

ان کا کہنا تھا کہ انقلابی اپنی بنیاد میں دراصل صوفی ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خدا میں ضم ہو جانے کی خواہش اور انقلاب کے لئے جان سے گزرنے کی آرزو، نفس کی ایک ہی حالت کے دو رخ ہیں۔ صوفی خدا کے عشق میں گرفتار ہوکر اس کے لئے فنا ہو جانا چاہتا ہے اور انقلابی، انقلاب کے لئے فنا ہوتا ہے۔ دونوں ہی گرفتار محبت ہیں اور محبت وہ شے ہے کہ جس ظرف یعنی دل میں رکھی جاتی ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے جسم سے سات ہزار سال پہلے پیدا فرمایا اور مقام قرب میں رکھا۔

دوستوں میں ان کے فلسفے کا خوب مذاق اڑتا لیکن مذاق اڑانے والے جانتے تھے کہ یہ نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود ماسٹر فیض بخش کس قدر ''قابل اعتبار'' ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مشکل سے مشکل مقام پر پیغام پہنچانے کے لئے انہی کو منتخب کیا جاتا اور ہر مرتبہ وہ کامریڈوں کے اعتماد پر پورے اترے۔

کانپور ہی میں ان کی ملاقاتیں بھگت سنگھ سے ہوئیں۔ اس سے گفتگو کے دوران انہیں شدت سے یہ احساس ہوا تھا کہ انگریزوں کے مظالم نے ایک بہت عالم نوجوان کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں اس کے لئے بم بنانے یا بم مارنے اور خونریز انقلاب کے بغیر ہندوستان کی آزادی کا تصور بھی محال ہوگیا ہے۔ وہ کتاب کا کیڑا تھا، انہوں نے اس کے تھیلے میں ہمیشہ موٹی موٹی کتابیں بھری ہوئی دیکھیں تھیں۔ جب وہ سوشلزم، مارکسزم اور کمیونزم کے بارے میں بولتا تو اتنی بہت سے کتابوں کے حوالے دیتا کہ انہیں اپنے آپ سے شرم آنے لگتی۔ وہ عمر میں اس سے بڑے تھے۔ تاریخ کے استاد تھے، لیکن ان نظریوں اور نظریہ سازوں سے ناواقف تھے۔

کانپور میں انہوں نے پانچ سال گزارے، لیکن پھر اچانک گھر انہیں اتنی شدت سے یاد آنے لگا کہ وہ خوشی رام اور شعلہ کانپوری کی ناراضگی مول لے کر اور اسکول سے استعفے دے کر چل پڑے۔ گھر آئے تو مہینوں نوری کے سحر سے نہ نکلے۔ وہ اب چھ سال کی ہوگئی تھی اور اس کی ایک ایک ادا انہیں گریہ ناک کر دیتی تھی۔ بس انداز کئے ہوئے روپے ختم

ہونے لگے تو ایک واقف کار کے ذریعے انہیں حیدرآباد کے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی، لیکن دو سال میں ہی وہاں سے بھی ان کا جی بھر گیا۔ سینے کے اندر ایک بیقراری سی تھی، کچھ کرنے کی، کچھ بننے کی، لیکن وہ کیا کریں، کیا بنیں، یہ ان کی سمجھ میں آج تک نہ آیا تھا۔

اب وہ کئی برس سے گھر میں تھے۔ سر پر وقت کا بھبھوت اتنی تیزی سے جما تھا کہ وہ ماسٹر فیض بخش سے سائیں فیض بخش ہوگئے تھے۔ اب ان کی گزران گاؤں کے بچوں کو قرآن یا سندھی اور اردو پڑھانے پر تھی۔ بعض بچے لنگز ریڈر پڑھنے آتے تھے اور وہ انہیں سی اے ٹی، کیٹ اور آر اے ٹی، ریٹ یاد کرواتے تھے۔ فارسی پڑھنے اب کوئی نہیں آتا تھا اور تاریخ سے بھی کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کلہوڑہ، سومرہ اور تالپر خاندان کے شجرہ ہائے نسب کتابوں کے صفحوں میں ملتے تھے اور شہروں میں ابھی تک انگریز کی عملداری تھی۔

نوری کی ماں اس بے سروسامان زندگی سے اتنی ہلکان ہوئی کہ جانبر نہ ہوسکی۔ مرحومہ زندہ تھی تو گھر میں چار کا بسیرا تھا۔ وہ چلی گئی تو رہ جانے والوں میں وہ خود تھے، نوری تھی اور غربت۔ اور غربت ہی اس گھر میں آخر تک رہنے والی تھی۔

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ زندگی اتنی تیزی سے گزر گئی جیسے گزری ہی نہ ہو۔ وہ کچھ دیر تک خالی الذہن بیٹھے رہے پھر انہوں نے مثنوی کا چوتھا دفتر اٹھا لیا۔ اس کے درمیان سے مور کا پر نکالا اور بے ساختہ اسے چوم لیا۔ یہ وہ حسن تھا جسے خریدنے کے لئے سکوں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی جبکہ زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے تو ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکے ہی کام آتے ہیں۔ پیٹ بھرنے کے لئے، تن ڈھانکنے کے لئے، پیروں میں کچھ پہننے کے لئے، کہیں آنے یا جانے کے لئے، انہیں خیال آیا کہ اتنی دیر وہ اپنی یادوں میں گم رہے ہیں تو چراغ کا تیل بے سبب جلا ہے۔ وہ اتنے امیر کہاں تھے کہ چراغ میں جلتے ہوئے تیل کو سوچنے میں ضائع کرتے۔ کیا چراغ میں جلتا ہوا تیل، اس سے پھیلتی ہوئی روشنی اور اس روشنی میں چمکتے ہوئے لفظ، نوری کی بھوک سے زیادہ اہم تھے؟ یہ ایک قاتل خیال تھا۔ وہ اپنے آپ سے گھبرا گئے، انہوں نے دفتر بند کیا پھر وہ اٹھے اور اوطاق کی تنگی میں ٹہلنے لگے۔

ٹہلتے ہوئے ان کی نظر ایک چھوٹی سی پٹاری پر پڑی جو طاق کے ایک کونے میں رکھی تھی اور چراغ کی روشنی میں اس پر جمی ہوئی گرد صاف نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے اسے برسوں سے نہیں کھولا تھا۔ اس میں کتنی پرانی یادیں بند تھیں۔ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس گرد آلود پٹاری میں کیسے کیسے نام سوتے ہیں۔ وہ چند لمحوں تک اسے غور سے دیکھتے رہے' پھر انہوں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اسے اتار لیا' پھونک مار مار کر اس پر جمی ہوئی گرد اڑائی اور اسے کھول کر بیٹھ گئے۔

اس میں سکھ دیو' چندر شیکھر آزاد اور درگا دیوی کے چند خط تھے۔ ''ہنس راج وائرلیس'' کی ڈائری تھی۔ ہنس راج وائرلیس بھی خوب چیز تھا۔ وہ ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کا بہت اہم ممبر تھا۔ بجلی کے کام میں اسے اتنی مہارت تھی کہ مشکل سے مشکل کام وہ چٹکی بجاتے کر گزرتا۔ تب ہی دوستوں نے اس کے نام کے ساتھ وائرلیس کا اضافہ اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ وہ ہنس راج کی عرفیت بن کر رہ گیا تھا۔

سائیں فیض بخش اس سے پہلی مرتبہ کانپور میں ہی ملے تھے۔ ان دنوں وہ کلکتہ' لاہور' امرتسر اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں بم مارتا پھر رہا تھا۔ وہ کانپور چھوڑ کر حیدر آباد چلے گئے۔ اس دوران انہیں اس کے دو تین خط ملے پھر ایک روز اچانک وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا حیدر آباد چلا آیا۔ ان دنوں وہ وائسرائے کی ٹرین کو بارودی سرنگ سے اڑانے اور لاہور کانسپریسی کیس میں پولیس کو مطلوب تھا۔ وہ سائیں فیض بخش کے گھر کئی روز مہمان رہا۔ پولیس اس کی تلاش میں سرگرم تھی' پھر ان کے منع کرنے کے باوجود وہ وہاں سے چل پڑا۔

جاتے جاتے اس نے اپنی ڈائری اور چند کامریڈوں کے خطوط حفاظت کے خیال سے ان کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ وہ کسی ''مشن'' پر تھا اور اسے مکمل کر کے دوبارہ ان کے گھر آنے کا ارادہ رکھتا تھا' لیکن وہ ڈائری اور خطوط ان کی پٹاری میں آج تک محفوظ تھے۔ ہنس راج ان چیزوں کو لینے نہیں آ سکا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر وہ حیدر آباد کے مضافات میں چلا گیا اور وہاں ایک آٹا مل کے کمپاؤنڈ میں ایک کامریڈ کے گھر ٹھہر گیا۔ وہ گھر اس کے مشن کی تکمیل کے لئے زیادہ مناسب تھا۔ وہاں پہنچنے کے دو ہی دن بعد اسے اس وقت

گرفتار کر لیا گیا جب وہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہا تھا اور اپنے خیال میں نہایت محفوظ مقام پر تھا۔

سائیں فیض بخش کو یہ خبر ملی تو وہ کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ ہنس راج سے انہیں ایک خاص تعلق تھا' لیکن وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

انہوں نے اس کی ڈائری کی ورق گردانی کی۔ ایک صفحہ پر 1930ء لکھا ہوا تھا اور اس کو سرخ روشنائی سے نشان زد کیا تھا۔ سنہ کے نیچے بریکٹ میں لکھا تھا:

''کامریڈ سین کے دورے کے بعد سندھ میں ہونے والے واقعات۔''

1-16 ستمبر...... کراچی سٹی پولیس اسٹیشن پر بم پھینکا گیا۔

2-19 ستمبر...... ریواچند بلڈنگ' کراچی میں بم پھٹا' جیٹھانند اور خیرات رام گرفتار ہوئے لیکن ناکافی شہادتوں کی بنیاد پر رہا کئے گئے۔

3-9 نومبر...... کراچی سٹی پولیس اسٹیشن پر ایک بار پھر بم پھینکا گیا۔

4-25 نومبر...... کراچی کے ایک گھر سے بم بنانے کا سامان پکڑا گیا۔

5-28 نومبر...... حیدرآباد میں سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے کمپاؤنڈ میں بم مارا گیا۔

ان پانچ اندراجات کے بعد کوئی اور واردات نہیں لکھی گئی تھی اور جون 1932ء میں ہنس راج خود ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ جانے 1931ء میں ان لوگوں نے اور کیا کچھ کیا ہوگا؟ سائیں فیض بخش نے سوچا پھر وہ خطوط کو الٹنے پلٹنے لگے۔ ان میں خوشی رام کے بہت سے خط تھے۔ مٹیالے کاغذوں پر نیلی روشنائی قدرے دھندلا گئی تھی۔ خطوں کے جیب میں زیادہ دنوں تک رہنے اور پسینہ جذب کرنے کے سبب تحریریں پھیل گئی تھیں۔ لفظ کہیں کہیں سے اڑ گئے تھے۔

انہوں نے ایک گہری آہ بھری۔ یہ سب اس زمانے کی یادگاریں تھیں جب وہ تاریخ پڑھاتے پڑھاتے چند گھنٹوں یا چند دنوں کے لئے روپوش مسافروں کے میزبان بن جاتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ تاریخ کا دھارا' امن اور شانتی کی گردان سے موڑا نہیں جا سکتا اور یہ بھی کہ بادشاہوں اور ظالموں سے لڑنے کے لئے اور اپنا حق چھیننے کے لئے تقریروں کی

نہیں ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزادی کے پیرخون سے دھلائے جائیں تب ہی وہ لکشمی کی طرح ہر گھر کے آنگن میں جھانجھنیں بجاتی ہوئی اترتی ہے۔ یہ سب کچھ انہیں تاریخ کی کتابوں نے بہت پہلے سکھا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی ان کی طبیعت بم بنانے اور بم مارنے کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ عملی طور پر کچھ نہ کرنے کا کفارہ انہوں نے اس طرح ادا کیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف دہشت گردی کی سرگرمیاں انجام دینے والوں کے خط ادھر سے ادھر پہنچاتے' کبھی کسی مفرور دہشت پسند کو اپنے گھر ٹھہراتے اور کبھی اپنے تھیلے میں کوئی اشد ضروری ''سامان'' رکھ کر اس پر سے دو چار کتابیں اور طالب علموں کی کاپیاں بھر کر شفیع آباد سے چمن گنج اور ہیلٹ نگر سے سول گنج جاتے۔

ان خطوط کو لکھنے والوں میں سے اب کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا۔ سب پھانسی گھاٹوں سے ہو کر بسنتی چولا پہن کر سرخ تتلیوں اور آتشیں رنگ جگنوؤں کی تلاش میں چلے گئے تھے۔ وہ اور ان جیسے دوسرے بے عمل اور بزدل زندہ تھے اور آئندہ بھی برسوں زندہ رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

انہوں نے تہ کیا ہوا ایک کاغذ کھولا۔ یہ سنگل لائن والی اسکول کاپی کا ایک ورق تھا۔ خط پر 10 اپریل 1931ء کی تاریخ تھی۔ یہ خط انہیں خوشی رام نے لکھا تھا اور ساتھ ہی اس میں بھگت سنگھ کے آخری اشعار بھی نقل کیے گئے تھے۔ آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی ان کی آنکھیں لفظوں کا تعاقب کرنے لگیں۔

اسے یہ فکر ہے ہر دم نیا طرزِ جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

یہ شعر بھگت سنگھ نے پھانسی گھاٹ میں کہے تھے۔ بسنتی چولا پہننے سے صرف سولہ دن پہلے۔ ان کے آنسو ان اشعار پر نثار ہوتے رہے۔

وہ جانتے تھے کہ اگر کسی کو گمان بھی ہو جائے کہ ان کے پاس یہ کاغذات موجود ہیں اور یہ کہ ماضی میں ان کا دہشت پسندوں سے کوئی تعلق بھی رہا ہے تو قید بامشقت ان کا مقدر ہوگی اور در در کی ٹھوکریں نوری کا۔

کسی نے تیز آواز میں کنڈی کھٹکھٹائی۔ ان کا دل ایک لحظ کے لئے تیزی سے دھڑکا۔ اس وقت کون آسکتا ہے؟ انہوں نے پٹاری سے نکلے ہوئے کاغذ تیزی سے واپس اسی میں رکھے۔ اسے بند کیا اور طاق پر رکھ ہی رہے تھے کہ کنڈی کی آواز دوبارہ آئی۔ انہیں نوری کی آواز سنائی دی۔ وہ انہیں پکار رہی تھی۔

وہ اسے تسلی دیتے ہوئے اوطاق سے نکلے۔ آنگن سے گزر کر اپنے شکستہ دروازے تک گئے اور زنجیر ہٹائی۔

سامنے وڈیرہ اللہ ڈنوں کا کارندہ کھڑا تھا۔ سلام اور احوال طلبی کے بعد اس نے بتایا کہ وڈیرہ سائیں کے کچھ مہمان آئے ہیں اور وڈیرہ سائیں نے انہیں بلایا ہے۔

''تم چلو...... میں آتا ہوں۔'' انہوں نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور پلٹ گئے۔

''کون تھا بابا؟'' نوری کی آواز میں امید کا لپکا تھا۔ گاؤں کے بعض بچے بابا کے پاس پڑھنے آتے تھے۔ کچھ نوجوان شاہ کے کلام کی تفسیر اور شرح سمجھنے کے لئے آجاتے تھے' کبھی کبھی انہیں میں سے کوئی کھیر کا پیالہ یا بریانی کی طشتری پہنچا جاتا تھا۔

آخر استاد کا حق بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔

''وڈیرہ سائیں نے بلوایا ہے۔ ان کے مہمان آئے ہیں۔'' سائیں فیض بخش نے دھیمی آواز میں کہا اور نوری کی آواز تیل سے خالی چراغ کی طرح بھڑک کر بجھ گئی۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے اوطاق میں آئی۔ خاموشی سے پلنگ کے نیچے سے ان کے جوتے نکالے صندوق سے ان کی دھندلائے ہوئے رنگوں والی اجرک نکال کر ان کے ہاتھ میں تھمائی اور باہر چلی گئی۔

سائیں فیض بخش نے اس کی پیٹھ دیکھی تو سینے میں خنجر اتر گیا۔ وہ بھی بھگت سنگھ

اور جتن داس کی راہ چلتے تو آج یہ فکر تو انہیں نہ ہوتی۔ جانے والوں کو بھلا کیا نظر آتا ہے، لیکن اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ تاریخ میں نام لکھوانے کا وقت گزر چکا تھا۔ انہوں نے گھسے ہوئے جوتے پیر میں ڈالے۔ اجرک اوڑھی، چراغ اٹھا کر باہر آئے، نوری ٹھنڈے چولہے کے قریب بے چراغ چھپر میں سر نہوڑائے بیٹھی تھی۔

''یہ رکھ لے بیٹا۔'' انہوں نے جلتا ہوا چراغ اس کی طرف بڑھایا۔

''نہیں بابا، اسے بجھا دو۔ ابھی چاند چڑھے گا تو سارے میں چانن ہو جائے گا۔'' نوری نے ان کے ہاتھ سے چراغ لیا پھر اس کی ایک پھونک نے چراغ کی لو کو کھا لیا۔

گھر میں اندھیرا بچھ گیا۔

''کنڈی چڑھا لے۔'' ان کی لرزتی ہوئی آواز نے کہا اور پھر وہ سایہ سے گھر سے باہر نکل گئے۔

گلیوں سے گزرتے ہوئے اکا دکا راہ گیروں کے مودبانہ سلام لیتے ہوئے وہ وڈیرہ سائیں کی حویلی کے سامنے پہنچے۔ باہر کئی اونٹ بیٹھے جگالی کر رہے تھے اور ڈکرا رہے تھے۔ کارندوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ بڑے احترام سے اندر پہنچائے گئے۔ وڈیرہ سائیں کے اوطاق میں ہنڈے جل رہے تھے۔ انگریزی وضع کی کرسیوں پر کئی لوگ بیٹھے تھے۔ اندھیرے کی عادی ان کی آنکھیں اتنی بہت سی روشنی سے چندھیا گئیں اور انہیں آنکھوں پر اپنے ہاتھ کی اوٹ کرنی پڑی۔

''آؤ سائیں، آؤ...... خیر سلامت۔'' یہ وڈیرہ سائیں کی کراری اور بھری پُری آواز تھی۔

''خیر سلامت سائیں۔'' وہ قریب ترین خالی کرسی پر جلدی سے بیٹھ گئے۔ اب ان کی آنکھیں آہستہ آہستہ روشنی کی عادی ہو رہی تھیں۔ انہوں نے عاجزی و انکساری سے مسکراتے ہوئے ان لوگوں کی طرف دیکھا جو وڈیرہ سائیں کے مہمان تھے اور بڑے تکلف سے بیٹھے تھے۔ ان کی سیاہ اچکنیں اور چوڑی دار پاجامے، سفید براق شلواریں، سروں پر مور کے پروں ایسے کلف لگے ہوئے اور گردن کی جنبش کے ساتھ ساتھ تھرکتے ہوئے طرے، یہ

سب تو بہت دور سے آئے تھے۔

سائیں فیض بخش سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بڑے شہروں کا شور اور ان کی چہل پہل کہیں بہت دور سے انہیں آواز دینے لگی۔ برسوں پیچھے سے۔ انہیں ان لوگوں پر رشک آیا۔ ان کے گھروں کو جانے والی سڑکیں پکی تھیں۔ ان کی عورتوں کو پانی کے لئے میلوں نہیں چلنا پڑتا تھا' ان کے ہاں قدم قدم پر اسکول کالج اور اسپتال تھے' انہیں روزگار کے کتنے بہت سے مواقع نصیب تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہاں بجلی بھی آ گئی تھی اور ہر وقت یہ دھڑکا نہیں رہتا تھا کہ تیل ختم ہو گیا تو کتاب کیسے پڑھی جائے گی۔

''یہ لوگ ایک تجویز لے کر آئے ہیں سائیں۔'' وڈیرہ سائیں نے اپنی انگلیوں میں پھنسی ہوئی انگوٹھیوں سے کھیلتے ہوئے کہا اور وہ اپنے خیالوں سے چونک گئے۔

''کیسی تجویز سائیں؟''

''ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارا گاؤں راستے سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ پکی سڑک نہیں ہے' کھیتوں کے لئے پانی نہیں ہے' سرکاری شفا خانہ نہیں ہے۔ یہ لوگ بڑی دور سے آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہاں ریل کی پٹڑی بچھائیں گے تو پھر یہ سب چیزیں یہاں بھی ہو جائیں گی۔ گاؤں کے لوگوں کو روزگار ملے گا' ملیں لگیں گی' شفا خانہ اور اسکول کھلے گا' بجلی آئے گی۔''

سائیں فیض بخش اسکول اور بجلی کے نام پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ان کے خون کی دھندلائی ہوئی سرخی میں کہیں امید کا جگنو چمکنے لگا...... آنے والوں میں بھی ایک ایک کر کے بولنے لگے' اپنی اپنی تجویز کے حق میں دلیلیں دینے لگے۔

''سائیں اب آپ ہی بتاؤ۔ آپ استاد ہو' ضلع بھر میں چرچا ہے آپ کے علم کا' مشورہ دو اپن کو۔''

''آپ خود سوچیں جناب' خبر ہے کہ انگریز جا رہا ہے اور ہم مسلمانوں کو نئی مملکت ملنے والی ہے۔ یہ پسماندہ علاقوں کو بڑھاوا دینے کا وقت ہے۔ آپ اپنے ہی علاقے کو لیں' تعداد میں مسلمان زیادہ ہیں' لیکن زور ہندوؤں کا ہے۔ یہاں سے ہندو کو اب جانا ہو گا۔

ہمارے مسلمان بھائیوں کو ان کا حق ملنا چاہئے۔''

مہمانوں میں سے ایک کف دردہن ہو گئے۔

''وقت آ گیا ہے کہ ہم مل جل کر اپنے مسلمان بھائیوں کی بہتری کے لئے صرف منصوبے ہی نہیں بنائیں' واقعی کچھ کر گزریں۔ اسی لئے اتنی دور سے چل کر ہم یہاں آئے ہیں۔'' دوسرے کی آواز بھی خاصی بلند تھی۔

''انگریز وعدہ کر چکا ہے کہ مسلمانوں کی مملکت ان کے اکثریتی علاقوں میں بنے گی تو ہم انتظار کیوں کریں' اپنا کام ابھی سے کیوں نہ شروع کر دیں۔ یہاں ریل کی لائن نہیں ہے جو کسی بھی علاقے کی ترقی کے لئے بنیادی شرط ہے۔ انگریز نے جب ہندوستان پر حکومت کا منصوبہ بنایا تھا تو سب سے پہلے تجارتی کوٹھیاں قائم کی تھیں پھر ریل کی پٹڑی بچھائی تھی۔ اس علاقے کا سروے بہت پہلے ہو چکا ہے' پٹڑی خاصی قریب تک بچھ چکی ہے۔ تھوڑا ہی سا کام رہ گیا ہے۔ ریلوے میں کچھ اپنے مسلمان افسر ہیں جو چاہتے ہیں کہ آزادی ملنے تک پٹڑی بچھنے کا کام ہو جائے۔'' ایک صاحب نے بردباری سے تمام صورتحال واضح کی۔

''آپ خود سوچیں کتنی سہولت ہو جائے گی۔ سرکاری ملازموں کو آنے کی' آپ کو غلہ منڈیوں اور کاروباری شہروں تک جانے کی' آڑھتی' دکاندار' بابو' کسان' مزدور' سب ہی فائدے میں رہیں گے۔ سب کچھ اپنا ہو گا' انگریز اور ہندو دونوں سے چھٹکارا ہو جائے گا۔''

سائیں فیض بخش کے دل پر گھونسا لگا۔ انہیں ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کی میٹنگیں یاد آ گئیں۔ ان میں شریک ہونے والے یاد آ گئے' میلے کپڑے' بڑھی ہوئی داڑھیاں' گھسی ہوئی کولہاپوری چپلیں' ان لڑکوں کا ان بردبار اور شاندار بزرگوں سے بھلا کیا موازنہ کیا جا سکتا تھا لیکن انہوں نے اپنی گفتگو میں انسانوں کو کبھی مذہب کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا تھا۔ ان میں سے بیشتر لڑکے ہندو تھے' سکھ۔ تھے' لیکن سائیں فیض بخش نے ان کی زبان سے کبھی ہندو بھائیوں کی بہتری یا سکھ بھائیوں کی بہتری کا جملہ نہیں سنا تھا۔

سانس کا پرندہ سائیں فیض بخش کے سینے میں پھڑ پھڑانے لگا۔ ''بہتری کی بات تو صحیح

ہے صاحب' پر مذہب میں کیا رکھا ہے؟ اُس اوپر والے کی لیلا ہے۔ کیا ہندو' کیا مسلمان' کیا رام اور کیا رحیم۔ سب چراغوں میں ایک ہی تیل جلتا ہے۔'' سائیں فیض بخش گلوگیر ہو گئے۔ ان لوگوں کے کہنے کے مطابق آزادی ملنے والی تھی۔ ان کی نگاہوں میں جتن داس' سانیال' اجے گھوش' بھگت سنگھ' رام محمد سنگھ آزاد اور کاما دیوی کے نام اور چہرے گھوم گئے۔ یہ آزادی جو ملنے والی تھی' اس میں کتنا بہت سا ہندو' مسلمان اور سکھ خون شامل تھا۔

''ریل کی پٹری سے ہندوؤں کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا؟'' وڈیرہ سائیں کے بڑے بیٹے نے ذرا بیکل ہو کر پوچھا' اس کے زیادہ تر دوست ہندو تھے۔

''نہیں میاں' ان کو کیا نقصان ہوتا وہ بھی فائدے میں رہیں گے' یہاں سے جانے میں انہیں آسانی رہے گی۔ ویسے ہم ریلوے کے دو افسر ساتھ لائے ہیں' وہ ساری اونچ نیچ سمجھتے ہیں۔'' ایک مہمان نے دھیمے لہجے میں میزبان کے بیٹے کو تسلی دی اور اپنے دو ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ہر چیز تیار ہے جناب' سروے مکمل ہے نقشے بن چکے ہیں۔ انگریز افسر بھی راضی ہے' سرکاری روپیہ میری تحویل میں ہے' بس آپ لوگوں کی اجازت کی ضرورت ہے۔'' ریلوے کے ایک افسر نے کہا۔

گفتگو کا لہجہ جوشیلا ہوتا گیا' سائیں فیض بخش کو وحشت ہونے لگی۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ جوشیلی باتیں سنی تھیں۔ بم بنانے کی' بم مارے کی' ریل اڑانے کی' لیکن اپنی صلح جُو طبیعت کے باوجود ان منصوبوں سے انہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی جبکہ یہ لوگ تو ریل کی پٹری بچھانے کی باتیں کر رہے تھے۔ شاید وہ بوڑھے ہونے لگے تھے اسی لئے انہیں نئے لوگوں اور نئے ماحول سے اختلاج ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو سمجھایا' پھر کسی نے بجلی کے تار کھنچنے اور اسکول کھلنے کا ذکر کیا۔ سائیں فیض بخش کا ڈوبتا ہوا دل تھم گیا جب اپنا اسکول ہوگا تو اس میں پڑھانے کا ان سے زیادہ بھلا کس کا حق ہوگا۔ وہ تاریخ کے کتنے اچھے استاد ہیں۔ سندھی تو خیر ان کی مادری زبان ہے۔ فارسی اور اردو بھی جانتے ہیں۔ وہ ان سے کہیں گے کہ سائیں آپ بے شک مجھے صرف ایک مضمون پڑھانے کی تنخواہ دینا'

لیکن میں سب کچھ پڑھا لوں گا۔ ایک ہی تنخواہ میں سب کچھ۔ پھر آٹے کا کنستر بھی بھرا رہے گا اور تیل کا پیپا بھی...... لیکن پھر تیل کے پیپے کی تو ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بجلی آ جائے گی اور بجلی ان کے گھر میں تو سب سے پہلے آئے گی۔ وہ استاد ہیں' علم کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ ان کے گھر میں اندھیرا تو ممکن ہی نہیں رہے گا۔ دل کے طاق پر امید کے ننھے ننھے دیئے جل اٹھے۔

ملازم نے آ کر وڈیرہ سائیں کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے سر ہلایا' پھر ایک طرف فرش پر دسترخوان بچھنے لگے۔ سائیں فیض بخش ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اچھا سائیں اجازت میں اب چلتا ہوں۔''

''ابھی کہاں' سائیں فیض بخش' بیٹھو بابا بیٹھو' ہمارے دسترخوان کو عزت بخشو۔'' وڈیرہ سائیں نے ہنس کر کہا۔

''نہیں سائیں' کھانا تو میں سرِ شام ہی کھا لیتا ہوں۔'' سائیں فیض بخش کے مرجھائے ہوئے چہرے پر پھیکی سی ہنسی پھیل گئی۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ارے بابا آپ بیٹھو تو سہی' آپ کی باتوں میں تو نشہ ہے سائیں نشہ' آپ رہو گے تو سب کا جی لگا رہے گا۔'' وڈیرہ سائیں نے کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔ سائیں فیض بخش جانتے تھے کہ یہ درخواست نہیں حکم ہے۔ ان کے کندھے ڈھلک گئے اور وہ بھی دوسرے مہمانوں کے ساتھ فرش پر ڈھے گئے۔

اوطاق طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو سے بھر گیا' بریانی' پلہ مچھلی' کھانڈ کی کھیر' حریرہ' گرم کھانے سے اٹھتی ہوئی بھاپ۔

سائیں فیض بخش کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ وڈیرہ سائیں اور ان کے مہمانوں کے اصرار کے باوجود وہ سر جھکائے خالی پلیٹ پر کڑھے ہوئے پھولوں سے کھیلتے رہے۔ ایک بے چراغ گھر کی بھوک چینی کی پھولدار پلیٹ میں پھن کاڑھے بیٹھی رہی' ان کی انگلیوں کو ڈستی رہی' اور اس کا زہر کھانوں کی خوشبو کے ساتھ نتھنوں کے راستے ان کے معدے میں اترتا رہا۔

چند ہی ہفتوں بعد گاؤں بھانت بھانت کے لوگوں سے بھر گیا۔ طرح طرح کی بولیاں بولنے والے مزدور' فولاد کے ٹکڑوں اور سلیپروں سے بھرے ہوئے ٹرک' دن بھر سائیں فیض بخش کے گھر کے سامنے والے میدان میں دندناتے رہتے۔ سامان اترتا رہتا۔ مزدور شور مچاتے رہتے۔ ریل کی پٹڑی ان کے گھر سے بس چند ہی گز کے فاصلے سے گزرنے والی تھی۔ قریب ہی ریلوے کالونی بننے کا منصوبہ بھی تھا۔ ان دنوں سائیں فیض بخش کو کانپور بہت یاد آتا تھا۔ ویسا ہی شور' ویسی ہی ٹھک ٹھک' کھٹ کھٹ' مزدوروں کے چائے پانی' سگریٹ بیڑی اور کھانے کے لئے کئی کھوکھے وجود میں آ گئے تھے۔ سائیں فیض بخش ہفتے میں ایک دو بار گھر سے نکل کر اس سارے منظر کو دیکھتے آپ ہی آپ مسکراتے اور پھر اوطاق میں آ کر کوئی کتاب کھول کر بیٹھ جاتے۔ ان کی بصارت خوبصورت اشعار اور سماعت ہتھوڑوں کی آوازوں' مزدوروں کے شور و غوغا' اوورسیروں کے احکامات سے بھر جاتی۔

جلد ہی وہ وقت بھی آ ہی گیا کہ کام ختم ہوگیا اور ریل کی پٹڑی بچھ گئی۔ ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بن گیا۔ اس سے متصل چند کوارٹر تعمیر ہو گئے جنہیں ریلوے کالونی کا نام دیا گیا تھا۔ ایک بار پھر سائیں فیض بخش کی وڈیرہ اللہ ڈنو کی حویلی میں طلبی ہوئی۔ سائیں فیض بخش وہاں پہنچے تو مہمانوں کے ہجوم میں وڈیرہ سائیں میزبان بنا بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ آج ریلوے اسٹیشن کے نام کا مرحلہ درپیش ہے۔

سائیں فیض بخش نے ان سب لوگوں کو دیکھا۔ اچانک وہ لوگ انہیں بہت پیارے لگے۔ کیسے بے غرض تھے یہ لوگ' اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر یہ بار بار اس ویرانے میں آتے تھے' محض اس لئے کہ دوسروں کو سہولتیں مہیا کر سکیں' ان کا ناتا دنیا سے جوڑ سکیں' انہیں شفاخانے' اسکول' بجلی اور پانی فراہم کر سکیں۔ کیسے بے نفس لوگ تھے۔ ان کی آنکھیں کناروں سے چھلکنے لگیں۔

''اتحاد ریلوے اسٹیشن کیسا نام رہے گا۔؟'' سائیں فیض بخش نے کچھ دیر غور کرنے

کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا اور وڈیرہ سائیں کو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ وڈیرہ سائیں نے زندگی میں ایک ہی تو سبق سیکھا تھا کہ بااثر لوگوں کی ہر واہ کے نیچے اپنی واہ کا ایضاً بھی لگاتے جاؤ' اللہ نے چاہا تو زندگی خوب بھری پری گزرے گی۔

اس روز سارے گاؤں میں میلے کا سماں تھا' اور کیوں نہ ہوتا۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ انگریز کا جانا اور ریل کا پہلی مرتبہ آنا' دونوں خوشیاں اکٹھی ہوگئی تھیں۔ اسٹیشن کے ساتھ ہی گڑھے کھود کر چولہے بنائے گئے تھے۔ ان پر چاندی کی طرح چمچماتی ہوئی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں' ان کے نیچے لکڑیوں کے گٹھے سلگ رہے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو ٹھہرانے کے لئے شامیانے لگ چکے تھے۔ شامیانے اور پلیٹ فارم کو کاغذ کی رنگین جھنڈیوں سے سجا دیا گیا تھا۔

سائیں فیض بخش نے اس روز نہا کر اپنا سب سے اچھا جوڑا پہنا' بیوی کے زمانے کی عطر کی شیشی نکالی جو ایک چوتھائی بھری ہوئی تھی۔ اس میں سے بہت احتیاط سے انگشت شہادت کی پور پر چند قطرے نکال کر سینے پر ملے' پیروں میں جوتے پہن کر گھر سے نکلے اور اسٹیشن کی طرف چلے۔ گھر سے نکلتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ نوری نے پلنگ گھسیٹ کر آنگن کی دیوار سے لگا دیا ہے اور اس پر کھڑی ہو کر اس رونق کا نظارہ کر رہی ہے۔ اس نے بابا کی زبانی دھواں اڑاتی' چھک چھک کرتی ریل کا ذکر بہت سنا تھا لیکن ریل کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ اب اس کی زندگی میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا کہ وہ کہانیوں کی ریل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے سائیں فیض بخش کو قدرے حیرت ضرور تھی کہ وڈیرہ سائیں کا کارندہ اب تک انہیں بلانے کیوں نہیں آیا' لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا' وہ راستے میں کہیں رہ گیا ہوگا' اتنے بہت سے کام ہیں' کسی انتظام میں اسے دیر ہوگئی ہوگی۔ ریلوے اسٹیشن کا نام انہوں نے رکھا تھا' وڈیرہ سائیں اور اس کے مہمان ان کی بہت عزت کرتے تھے' کہتے تھے کہ ضلع بھر میں ان ایسا عالم و فاضل کوئی نہیں' ظاہر ہے وہ لوگ اسٹیشن

کے نام والی تختی کی نقاب کشائی بھی انہی سے کرائیں گے۔

وہ عطر سے مہکتے ہوئے اسٹیشن پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ نام کی تختی پر سبز ریشم کا نقاب ہوا سے اڑ رہا ہے اور نیچے سے نستعلیق میں لکھا ہوا نام جھلکیاں مار رہا ہے۔ ہر طرف کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ان لوگوں کے ہجوم کے درمیان وڈیرہ سائیں کی جھلک نظر آئی۔ وہ بھیڑ کے درمیان سے راہ بناتے ہوئے وڈیرہ سائیں تک جا پہنچے۔ وڈیرہ سائیں نے انہیں دیکھا۔ اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیا اور پھر اس طرف متوجہ ہوگیا جس طرف ریل کی کوکتی ہوئی آواز ابھی آئی تھی۔ سب لوگ جھک جھک کر اشتیاق سے دن کی روشنی میں پارے کی طرح چمکتی ہوئی پٹڑی کو اور اس پر بھق بھق کرتی' دھواں اڑاتی' تیزی سے اپنی طرف اڑتی چلی آتی ریل کو دیکھ رہے تھے۔ پلیٹ فارم اس کی آمد سے لرزنے لگا' پھر بریکوں کی آواز آئی اور وہ تھمتے تھمتے سروں پر آ پہنچی۔

ریل کے رکتے ہی وڈیرہ اللہ ڈنوں فرسٹ کلاس کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ سائیں فیض بخش اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے مور کے پروں ایسے طروں والے اور سیاہ اچکنوں والے اترے۔ سائیں فیض بخش نے آگے بڑھ کر مہمانوں سے ہاتھ ملانا چاہا لیکن وڈیرہ سائیں کے کارندے آنے والوں کے گلوں میں گلاب کے ہار پہنانے میں مصروف تھے۔ مہمانوں کی گل پاشی کرنے والے کارندوں کے ریلے نے انہیں قدرے پیچھے دھکیل دیا۔ انہوں نے وڈیرہ سائیں کو فرسٹ کلاس کے ڈبے سے نکلنے والے ایک انگریز کی طرف لپکتے دیکھا' لیکن پھر فوراً ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ باہر آنے والا انگریز نہیں' انگریزی لباس پہنے ہوئے ہے۔ وڈیرہ سائیں نے آگے بڑھ کر اس کے قدم لئے۔ اسے اپنے ہاتھوں سے گلاب کا سب سے دبیز قدموں کو چھوتا ہوا ہار پہنایا' پھر سب لوگ اس تختی کی طرف چلے جس کی نقاب کشائی ہونی تھی۔

سائیں فیض بخش نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ یہ نہ ہو کہ مہمانوں کے سامنے وڈیرہ سائیں کی سبکی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے کہ جسے نقاب کشائی کرنی ہے وہ اس قدر پیچھے ہے۔ لوگوں کو ہٹاتے ہوئے وہ جب تختی تک پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ انگریزی لباس والے

شخص کی انگلیاں سبز ریشمی نقاب کی ڈوری کو کھینچ رہی ہیں۔ سائیں فیض بخش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ خطِ نستعلیق میں لکھا ہوا اور ان کا رکھا ہوا نام ''اتحاد'' دھوپ میں پلکیں جھپکانے لگا۔ اسٹیشن تالیوں سے گونج اٹھا تو ان کے ہاتھ بھی میکانکی انداز میں تالی بجانے لگے لیکن ایک سوئی سی ان کے سینے میں ٹوٹ گئی۔ ''یہ نام تو میں نے رکھا تھا۔ یہ حق تو میرا تھا'' پھر انہی کے اندر سے دوسری آواز آئی ''لیکن نہیں ''اتحاد'' کا تو مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ سب کی محنت' سب کی مشقت' سب کی ہوتی ہے۔'' انہوں نے اپنے آپ کو سمجھایا پھر بے اختیار گھوم کر گھر کی سمت دیکھا۔ نوری کا چہرہ ادیوار پر ٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں۔

پہلی ٹرین سے اترنے والوں کا سامان پلیٹ فارم پر ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ چلنے کی جگہ بھی نہیں رہی تھی۔ ڈیوڑھے' دوسرے اور تیسرے درجے میں سفر کرنے والے سارے لوگ ریل سے اتر چکے تھے۔ کچھ دیر بعد دیگوں کے ڈھکن اتار دیئے گئے۔ گرما گرم سالن اور مصالحہ دار چاولوں کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ سائیں فیض بخش کی بھوکی ہوئی آنتوں تک یہ خوشبو پہنچی تو وہ تیز تیز قدم اٹھا کر پلیٹ فارم سے اترے اور اپنے گھر کی طرف چلے گئے۔

....

چند ہی ہفتوں میں زمین و آسمان بدل گئے۔ ملکانی گئے' للوانی گئے' مہتانی گئے' سندھو کی تہہ میں سوئی ہوئی پرکھوں کی راکھ رہ گئی۔ اڈوانیوں کے بنوائے ہوئے پیاؤ رہ گئے۔ عاملوں کے لگائے ہوئے پیڑ رہ گئے۔ انسان چلے گئے' اشیاء رہ گئیں' ریل چلتی رہی۔ پرانے جاتے رہے' نئے آتے رہے۔ خون کی بو سے بھیگی ہوئی اور زنا کی غلاظت سے لتھڑی ہوئی خبریں آتی رہیں۔

سائیں فیض بخش دیوانوں کی طرح گلیوں میں پھرتے رہے۔ اب تو تپل کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ شاید وہ بھی چلا گیا' پر فقیروں کا' ان کے بول بچن کا بھی کوئی دھرم ہوتا ہے؟ وہ تو سب کے ہوتے ہیں' آوازوں کا پرساد بانٹتے پھرتے ہیں۔ دل میں میرے دوست کا ڈیرا' بیچ بہے گنگا' بیچ بہے دجلہ۔

گنگا میں اب لاشیں بہتی تھیں اور زندہ رہنے والوں کی آنکھوں سے دجلہ۔

مہینوں وہ اسی طرح بولائے بولائے پھرتے رہے۔ کبھی کسی کیکر کے نیچے بیٹھ کر ریل کی پٹڑی کو تکتے اور کبھی تیل کی کپی لے کر شام کو ویران مندر کی طرف نکل جاتے۔ ہوحق کرتے ہوئے مندر میں دھنوان اور دیالو مورتیاں انہیں تنہائی سے خوف کھاتی ہوئی اور انسانوں کی دوسراہت کا دان مانگتی ہوئی نظر آتیں۔ وہ اداسی سے ان مورتیوں کو دیکھتے پھر طاق پر رکھے ہوئے دیئے میں تیل کی کپی سے چند قطرے تیل کے ٹپکاتے' دیا روشن کرتے' تھوڑی دیر وہاں بیٹھے رہتے' کبھی ویرانی سے گھبراہٹ ہوتی تو پُرسوز آواز میں شاہ کی کوئی وائی یا مولانا روم کے اشعار گانے لگتے۔

آدمی دیدست باقی پوست است'
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است'
خشک تار و خشک چوب و خشک پوست'
از کجا می آید ایں آواز دوست'

''خوشی رام میرے سوہنڑے سائیں' میرے مٹھڑے سائیں' پھر سے تان اڑاؤ' سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ' خوشی رام کی آواز کا پرندہ ان کے وجود میں اپنے پَر مارنے لگتا' اس کی آواز اپنے پنکھ کھولنے لگتی' اللہ ساڈا اسکا۔ میں آپیں کعبہ مکہ' بستیوں سے انسان کہاں چلے گئے تھے' ان میں حیوان کہاں سے آن بسے تھے۔

رات کا رنگ زہر کھائے ہوئے بدن کی طرح اودا ہونے لگتا تو لٹے ہوئے قافلے کے میرِ کارواں کی مانند وہ گھر کو آتے......۔

....

سال گزرا تو گاؤں کا حلیہ ہی بدل گیا۔ کھلے ہوئے میدانوں میں نئے نئے گھر تعمیر ہو رہے تھے۔ ان دکانوں پر جہاں دن میں بھولے بھٹکے ہی کوئی خریدار آتا تھا' اب وہاں گاہکوں کی ریل پیل تھی۔ نئے آنے والوں نے نت نئے سامان کی سجی سجائی دکھانیں کھول لی تھیں۔ گلیوں میں لوگ زیادہ ہو گئے تھے اور چلنے کا رستہ کم پڑ گیا تھا۔ دائیں بائیں سے

کانوں میں ہر وقت اجنبی بولیاں آنے لگیں تھیں۔ سائیں فیض بخش کبھی کبھار کسی اشد ضرورت سے گھر سے نکلتے تو گاؤں انہیں اپنا گاؤں نہ لگتا' یوں محسوس ہوتا جیسے راستہ بھول کر وہ کہیں اور چلے گئے ہیں۔

شفا خانے کی عمارت تعمیر ہو چکی تھی اور اس کا افتتاح بھی ہو گیا تھا۔ ایک بار نوری وہاں سے ملیریا کا مکسچر اور سر درد کی گولیاں بھی لے کر آئی تھی۔

اسکول کی عمارت بن چکی تھی اور چند ہی مہینوں میں اسکول کھلنے والا تھا۔ ان کی ہمت تو نہیں پڑتی تھی لیکن نوری کے بار بار کہنے پر انہوں نے سوچا کہ انہیں اب وڈیرہ سائیں کے پاس جانا چاہئے اور اپنی خدمات پیش کرنی چاہئیں۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد ایک دن انہوں نے نہا کر بالوں میں تیل ڈالا' صاف جوڑا پہنا' داڑھی میں کنگھی کی' نوری سے مانگ کر آنکھوں میں سرمہ لگایا اور پھر وڈیرہ سائیں کی حویلی جا پہنچے۔ حویلی اب خاصی بدل گئی تھی۔ نئی وضع کا سامان آ گیا تھا اور وڈیرہ سائیں کی شان میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اوطاق میں پہنچ کر انہوں نے وڈیرہ سائیں سے بات شروع کی اور انہیں اطمینان دلانا چاہا کہ ایک ہی تنخواہ میں وہ تین چار استادوں کی جگہ سنبھال لیں گے تو وڈیرہ سائیں نے درمیان سے ہی ان کی بات کاٹ دی۔ انہیں یہ سن کر چکر آ گیا کہ استادوں کی تعیناتی تو بہت پہلے ہو چکی اور چند ہی دنوں میں ریل ان استادوں کو لے کر آنے والی ہے۔

''لیکن سائیں اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں جو موجود ہوں۔ اب آپ دوسروں کو اتنی دور سے زحمت دو گے۔'' سائیں فیض بخش کے لہجے کی لاچاری آنسوؤں سے گوندھی گئی تھی۔

''ہاں سائیں' وہ تو آپ صحیح کہتے ہو لیکن آپ اب آرام کرو' بوڑھے ہو گئے ہو آپ۔ یہ نئے لوگ ہیں' جوان ہیں' سائیں، آپ تو یوں بھی ریٹائر ہو چکے ہو۔ اللہ اللہ کرو۔'' وڈیرہ سائیں نے ریڈیو کے لٹو کو گھماتے ہوئے کہا۔ نئے وزیر اعظم کی تقریر آنے والی تھی۔

سائیں فیض بخش اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھے تو ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ انہوں نے نوری کے لئے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ ملازمت مل جائے گی تو اس کے لئے کچھ دان دہیز جمع کریں گے۔ ہاتھ پیلے کردیں گے اس کے۔ اچھے کھانے اور ڈھنگ کے کپڑوں کو ترس گئی ہے وہ دو چار جوڑے بنائیں گے' چوڑیاں خریدیں گے اس کے لئے۔ ''پٹی والی سنہری چپل انہوں نے ایک دکان پر دیکھی تھی' اس پر 3 روپے 15 آنے قیمت چھپی ہوئی تھی' سنہرے ہی رنگ سے' وہ خریدیں گے اس کے لئے۔

اب وہ کس منہ سے اس کے پاس جائیں' کیسے کہیں کہ ریل نئے استادوں کو' نئے خون کو کہیں دور سے لے کر آ رہی ہے۔

اس روز جب شام ہوئی اور نوری چراغ لے کر آئی تو انہوں نے چراغ پھونک مار کر بجھا دیا۔ ''آج سر دکھ رہا ہے بیٹا' چراغ کو آج بجھا ہی رہنے دو۔'' وہ ''دل ہوا ہے چراغ مفلس کا'' کی تفسیر بنے ہوئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ چراغ کی روشنی میں نوری ان کے چہرے پر لکھی ہوئی تفسیر پڑھ لے۔

فولاد سے ڈھلی ہوئی پٹڑیوں نے جس ہزار داستان سفر کا آغاز کیا تھا' وہ طے ہوتا رہا۔ لوگ اتحاد ریلوے اسٹیشن پر اترتے رہے۔ گڑھوں میں دہکتے ہوئے چولہوں پر چڑھی ہوئی دیگوں کے کھانے کھاتے رہے اور کھلے ہوئے میدانوں میں چھاؤنیاں بچھاتے رہے۔ اب لوگوں کے آنے پر کسی کا اختیار نہیں رہا تھا۔ وڈیرہ سائیں کا بھی نہیں۔ زندگی' ''ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی'' تصویر بن گئی تھی۔

گاؤں پہلے قصبہ بنا پھر شہر میں بدل گیا۔ آنے والے اپنے ساتھ بے شمار مسائل لائے تھے۔ ان میں سے کچھ ہجرتیں پرانی ہوئیں اور کچھ ہجرتوں کا نیا پن وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ آنے والوں نے کھیت کھلیان خریدے' دکانیں' مکان خریدے۔ پھر کچھ کرنل جنرل تھے جنہیں ان کی خدمت کے عوض صرف تنخواہیں نہیں دی گئیں' زمینیں بھی مفت دی گئیں۔ پھر وہ ہر طرف پھیلتے چلے گئے۔ پرانے لوگ سمٹتے گئے' پیچھے ہٹتے گئے۔ انہیں ملازمتوں کے نہ ملنے کی' سہولتوں کے نہ ہونے کی وہی پرانی شکایتیں رہیں۔ سائیں

فیض بخش فضا میں پھیلے ہوئے تناؤ کو آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ دیکھ رہے تھے کہ شکایتیں تلخیوں میں بدل رہی ہیں، کدورتیں ابھر رہی ہیں، چشمکوں نے گھر دیکھ لیا ہے اور پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ نفرتوں نے شاخِ دل پر آشیاں بنالیا۔ زمینیں آباد ہوگئیں اور دل برباد ہوگئے۔

آنے والوں اور آباد ہونے والوں میں یوں تو بہت سے تھے لیکن ایک مَیالی شیروانی والے بھی تھے جن کا نام تو جانے کیا تھا لیکن وہ اپنے تخلص ''مہجور'' سے پکارے اور پہچانے جاتے تھے۔ بڑے ڈاک خانے کے باہر لکڑی کا ایک خستہ حال قلمدان لے کر بیٹھتے اور دوسرے شہروں کو ہر مہینے منی آرڈر بھجوانے والوں کے فارم بھرتے تھے یا ان کے بولے ہوئے خط لکھتے تھے اور روزی کماتے تھے۔

آہستہ آہستہ جانے کس طرح سائیں فیض بخش اور مہجور صاحب میں شناسائی اور دوست داری کا ایک رشتہ استوار ہوگیا۔ دونوں زندگی کی تیز اور آگے بڑھتی ہوئی رو سے کٹے ہوئے لوگ تھے۔ گھنٹوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ماضی کی راکھ کریدتے رہتے۔ مہجور صاحب مشاعرے پڑھنے کئی مرتبہ کانپور گئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ سائیں فیض بخش کئی برس کانپور میں رہ چکے ہیں تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔ اب وہ دونوں اکثر کانپور کا تذکرہ کرتے۔ کئی بار سائیں فیض بخش نے کانپور کے حوالے سے کامریڈ دوستوں کا ذکر چھیڑنا چاہا تو مہجور صاحب ان مشاعروں کا قصہ لے بیٹھے جو انہوں نے لُوٹے تھے۔ ان مشاعروں میں پڑھی جانے والی طرحی غزلیں ان غزلوں کو لکھ کر دینے والے استادوں کی آپس کی چشمکیں اور اسی طرح کی داستانیں، چند کوششوں کے بعد سائیں فیض بخش کی پھر ہمت نہ پڑی کہ وہ بھگت سنگھ، جتن داس یا اجے گھوش کا ذکر کرتے۔ مہجور صاحب بہت اچھے انسان تھے۔ اسی لئے ان سے ایک تعلق خاطر تھا سو رہا۔

نوری کنوار پن کی دہلیز پر بیٹھی رہی۔ وقت کا چرخہ اس کے بالوں میں کپاس کاتتا رہا پھر وہ ایک دن موت کی اندھی کالی حویلی میں رہنے کے لئے چلی گئی۔ سائیں فیض بخش کے لئے زمانہ تھم گیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ کس کے لئے جئیں۔ کھانا پینا، سونا

جاگنا' سب ان کے لئے بے معنی ہوگیا تھا۔ ''شاہ جور سالو'' ''مثنوی مولانا روم'' اور ''گلستان و بوستانِ سعدی'' میں اب ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ کبھی کوئی کتاب کھول لی' موتیا کی ماری ہوئی آنکھوں نے دھندلے دھندلے سے چند لفظ چن لئے اور بس۔ ذہن' صحرائے تھر کی طرح پیاسا تھا اور اشعار کی تفہیم کے بادل اب بھولے بھٹکے ہی برستے تھے۔

اب جبکہ ان کا جانا صبح اور شام کی بات ٹھہر گئی تھی' انہیں کانپور والے انقلابی دوست بہت یاد آنے لگے تھے۔ شاید وہی صحیح تھے' جب وہ کہتے تھے کہ کانگریس ہو یا مسلم لیگ دونوں انگریز سے اقتدار حاصل کر کے مطمئن ہو جائیں گے' لیکن اس سے عوام کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ سماج وادی' سماج کا قیام چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک کھیتوں میں بیج بکھیرتا ہوا کسان اور کارخانوں میں مشینوں کو حرکت دیتا ہوا مزدور بیدار نہیں ہوگا اقتدار کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے گا' تب تک انسانوں کی تقدیر نہیں بدلے گی۔

انسانوں کی تقدیر نہیں بدلی تھی' ان کی اپنی تقدیر نہیں بدلی تھی۔ وہ اپنی تقدیر پر اب شاکر ہو چکے تھے اور تمام آرزوئیں ان کے وجود سے رخصت ہو چکی تھیں۔ وہ خواب جو ان کے دوستوں نے انہیں کانپور میں دکھائے تھے' وہ لمحوں کے پروں پر بیٹھ کر اتنی دور نکل گئے تھے کہ تصور کے جال میں بھی نہیں آتے تھے۔ ایک دوسرا خواب وہ تھا جو وڈیرہ سائیں کے اوطاق میں آنے والے مہمانوں نے دکھایا تھا' وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ریزہ ریزہ ہوا تھا۔ اب خواہشوں سے حقیقتوں کا وصال نہیں ہوتا تھا اور زمانے کے بطن میں خواب قرار نہیں پاتے تھے۔ آنکھوں میں کہیں سے روشنی کا مژدہ نہیں اترتا تھا اور دل تیتر کے پنجوں سے کھدی ہوئی زمین ہوگیا تھا۔

انہیں دنوں ایک سہ پہر ان کے گھر کی کنڈی کھٹکی۔ انہیں حیرت ہوئی' ان کے گھر کا دروازہ اب دن رات کھلا رہتا تھا۔ گھر میں رہ کیا گیا تھا جسے محفوظ رکھنے کے لئے کنڈی لگائی جاتی۔ پھر کون تھا جو کھلے ہوئے شکستہ دروازے پر دستک دے رہا تھا؟

''کون ہے؟'' انہوں نے برآمدے میں پڑی ہوئی جھلنگا چارپائی سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''آپ سے ملنے آیا ہوں۔'' یہ کوئی اجنبی آواز تھی۔ نوجوان اور مودب۔

''آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔'' انہوں نے جالا کھائی آنکھوں سے آنے والے کو پہچاننے کی کوشش کی۔

''میرا نام محمد جام چِل ہے۔'' آنے والے نوجوان نے ان کے پیر چھوئے' مصافحہ کر کے ہاتھ سینے پر رکھا اور ادب سے پلنگ کی پائینتی پر ٹک گیا۔

انہوں نے اپنی بوڑھی ہڈیوں کو اور جگہ جگہ سے جھولتی ہوئی کھال کو سمیٹا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''مجھ فقیر کے پاس کیوں آئے ہو بیٹا؟''

''فارسی پڑھنے آیا ہوں آپ سے۔'' نوجوان نے سادگی سے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''اس زمانے میں فارسی پڑھ کر کیا کرو گے؟ ہمارے زمانے ہی میں فارسی پڑھنے والے سے کہا جاتا تھا کہ پڑھو فارسی' بیچو تیل۔ پڑھنی ہے تو عربی پڑھو' سنا ہے عربی جاننے والوں کو ہزاروں ملتے ہیں عرب میں۔'' سائیں فیض بخش نے اداسی سے ''ہزاروں'' کا لفظ ادا کیا اور زندگی میں پہلی بار یہ حقیقت ان پر وحی کی طرح اتری کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی پانچ سو روپے بھی اکٹھے ہاتھ میں نہیں تھامے ہیں۔

''آپ درست کہتے ہیں سائیں' عربی اب قارون کے خزانے کی کنجی ہوگئی ہے' لیکن مجھے تو فارسی پڑھنی ہے۔ اپنی شاگردی میں لے لیں' آپ مجھے۔'' اس نے ان کے پیروں کو تھام لیا۔

''نہ بیٹا نہ' مجھے گہنگار مت کرو۔'' انہوں نے جلدی سے پیر کھینچ لئے۔ ''تم آجایا کرو میرے پاس' بس جلدی جلدی آؤ' چند سانسیں رہ گئی ہیں سینے میں' جو کچھ میرے پاس ہے لے جاؤ پھر تو سب کچھ مٹی میں مل جائے گا۔''

انہوں نے اپنی آنکھوں کے گوشوں میں جمع ہونے والے آنسو پور میں لئے اور پلنگ کی پٹی سے پونچھ دیئے۔

محمد جام دوسرے دن سے ہی ان کے پاس آنے لگا۔ وہ ان کی ہدایت کے مطابق

''آمدنامہ'' اور ''گلستان'' لے کر آیا تھا۔ یہ محمد جام عجب مست مولا تھا۔ عموماً وہ سہ پہر کو آتا۔ کبھی ان کے لئے گڑ کی روٹی لاتا' کبھی حریرہ اور کبھی ابلے ہوئے انڈے۔ اکثر جھاڑو لے کر اوطاق اور برآمدے کو صاف کر دیتا' کبھی صابن کی بٹی لے آتا اور ان کے میلے کپڑے دھو کر ڈال جاتا۔ اس کی بغل میں ہر وقت کتابیں اور رسالے دبے رہتے۔ کسی دن ''گریک ٹریجڈی'' اور ''رومن ہسٹری'' پر کتابیں ہوتیں اور کسی دن مارکس اور اینگلز کے پشتارے۔

اسے دیکھ کر اور اس کی کتابیں دیکھ کر انہیں بے اختیار کانپور کے دن اور راتیں یاد آ جاتیں۔ بیڑی پینے کا وہی انداز' کپڑوں کا وہی بے ڈھنگا پن' پیروں میں اسی طرح کی گھسی ہوئی چپلیں اور مزاج کی وہی درویشی۔ ان دنوں سندھی میں کتابیں دھڑا دھڑ ترجمہ ہو رہی تھی۔ ایک روز انہوں نے اس کے پاس ناول ''سدھارت'' دیکھا۔ یہ کسی جرمن ناول کا ترجمہ تھا۔ بہت عرصے بعد ان کا دل چاہا کہ اس ناول کو پڑھیں لیکن لفظ اب ان کے لئے شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی بجائے فضا میں اڑتے ہوئے پکھیرو ہو گئے تھے اور نگاہوں کی پکڑ میں نہیں آتے تھے۔

محمد جام نے چند ہی مہینوں میں گلستان اور بوستان دونوں ختم کر لیں۔ اب وہ اسے مُلّا جامی کی یوسف و زلیخا پڑھا رہے تھے۔ اسے پڑھانے میں انہیں لطف آنے لگا تھا اور عرصہ دراز کے بعد ان کے اندر زندگی کی رمق بیدار ہو گئی تھی۔

''اب تو بتا دو کہ اتنی محنت سے کیوں پڑھ رہے ہو؟'' ایک روز وہ اچانک اس سے پوچھ بیٹھے۔

''سائیں آپ سے کیا چھپانا' ہمارے پاس ایران سے کچھ رسالے آتے ہیں' کتابچے آتے ہیں' وہ سب فارسی میں ہوتے ہیں' ان کا ترجمہ ہمیں درکار ہوتا ہے۔ باہر کے کسی آدمی سے ہم یہ کام کرا نہیں سکتے' اسی لئے میری ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ فارسی پڑھوں۔''

سائیں فیض بخش کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ محمد جام کی نہیں سکھ دیو یا ہنس راج کی آواز ہے۔ وہی جملے' وہی راز داری' ویسی ہی صورتحال۔

''تم کمیونسٹ ہو؟'' ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

محمد جام ان کا سوال سن کر مسکرانے لگا۔ ''اور کیا آپ کامریڈ نہیں ہیں؟'' اس نے جواباً ایک سوال داغ دیا اور وہ برسوں بعد بے اختیار ہنس دیئے۔ اس روز کے بعد ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر پھر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ شاید اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ایک دن انہیں اسی کی کتابوں میں ایک پنجابی کتاب نظر آئی۔ انہوں نے کتاب کی ورق گردانی کی۔ یہ شیخ ایاز کی نظموں کا پنجابی ترجمہ تھا۔ شیخ ایاز کا نام وہ برسوں سے سن رہے تھے۔ وہ کتاب اٹھا کر اپنی آنکھوں کے قریب لے گئے اور نظموں کے عنوانات پڑھنے لگے جو کہ جلی خط میں تھے۔ ورق الٹتے ہوئے ایک عنوان نے ان کی انگلیوں کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ نظم کا عنوان تھا ''بھگت سنگھ دی پھانسی'' ان کے خون میں یادوں کی باڑھ آنے لگی۔ برسوں سے بندھے ہوئے بند ٹوٹنے لگے۔ کانپور کی گلیاں زندہ ہوگئیں۔ ریلوے کالونی کے ایک کوارٹر میں بولتا ہوا' بحث کرتا ہوا' سیاہ گھنی کمان ایسی بھوؤں کے نیچے جادو جگاتی ہوئی' بڑی بڑی آنکھوں والا نوجوان گنگنانے لگا۔ ''ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے۔'' انہوں نے اشعار کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن لفظوں پر نمکین پانی کی چادر بچھ گئی اور ٹائپ کی باریک عبارت اس چادر میں ڈوب گئی۔

''جام بیٹا اسے پڑھو۔ مجھے سناؤ۔''

محمد جام نے ان کی بھرائی ہوئی آواز سنی تو قدرے حیرت سے انہیں دیکھا' پھر کتاب کے صفحے کو۔ یہ ایک گیت ناٹک تھا۔ بھگت سنگھ' چندر شیکھر آزاد' کشوری لال' سکھ دیو' ڈاکٹر گیا پرساد اور راج گرو اس کے کردار تھے۔ مقام لاہور سنٹرل جیل کا پھانسی گھاٹ تھا۔

محمد جام کی آواز نے سکھ دیو کا کہا دہرایا پھر وہ بھگت سنگھ کے مکالمے ادا کرنے لگا۔

جھٹ پٹ جو پھانسی دا جھٹکا
بھن دیندا بندے دا منکا
مڑ لاش ہوا وچ جھلدی اے
تے ایس دھرتی نوں تھلدی اے

کچھ صدیاں لئی بھونچال جیویں
ایہہ اپنی موت سوال جیویں

ایک بھاری اور گمبھیر آواز اس شکستہ گھر کے درودیوار میں گونجنے لگی اور سائیں فیض بخش جن کی آنکھوں سے نوری کی موت پر ایک آنسو نہیں گرا تھا' دھاڑیں مارنے لگے۔ گلوگیر آواز میں جام نے کہا۔

تاریخ دے وچ اوہ دھڑک رہے
کچھ پل بجھ کے مُڑ بھڑک رہے
جو اپنی اگ جالاندے نئیں
دھوناں دے پھند گاندے نئیں

سائیں فیض بخش نے بے قرار ہوکر اپنی پیشانی پلنگ کی پٹی پر رکھ دی۔ ''جب سب آگ جلا رہے تھے' جب سب آگ میں جل رہے تھے تو میں کیوں اپنا دامن بچائے کھڑا تھا' خوشی رام مجھے گھسیٹ کیوں نہیں لیا تو نے۔ میرے سوہنے سائیں۔''

رات جب تمام دن کا اور زندگی بھر کے پچھتاووں کا زہر پی کر سیاہ پڑ گئی اور خنکی ان کی بوڑھی ہڈیوں میں گودا جمانے لگی' تب بھی ان کی نگاہوں کے سامنے پینسٹھ برس کی تاریخ مختلف جھانکیاں دکھاتی رہی۔ اس رات انہیں بار بار اپنی پٹاری کا خیال آیا جس میں واپس نہ آنے والوں کی امانتیں تھیں۔ انہوں نے سوچا کل محمد جام آئے گا تو یہ پٹاری اس کے سپرد کر دوں گا۔ امانتیں اصل وارثوں کے ہاتھ میں ہی پہنچنی چاہئیں۔

محمد جام نہ دوسرے دن آیا اور نہ تیسرے دن۔ چوتھے دن مجبور صاحب اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ علاقے کے لڑکے دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہوگئے ہیں' ان میں سے ایک محمد جام بھی ہے۔

سائیں فیض بخش کی سمجھ میں نہ آیا کہ جانے والے آنے کا وعدہ کر کے آتے کیوں نہیں؟ محمد جام کی ذات نے ماضی سے ان کا رشتہ عجب طرح جوڑ دیا تھا۔ اور ان کے بیتے

میں مایوسیوں کی راکھ کے نیچے دبی ہوئی ایک چنگاری سلگا دی تھی، وہ اس کی رخصت کے ساتھ بجھنے کے بجائے بھڑک اٹھی۔ لوگ زلیخائے آزادی کی آرزو کرنے کی سزا میں کب تک کال کوٹھریوں میں زندگی تیر کرتے رہیں گے؟ یہ سوال ان کے ذہن میں پھن پھیلائے انہیں ڈستا رہا اور ان کے اوطاق کی زنگ آلود سلاخ دار کھڑکی کے طاق میں رکھی ہوئی مثنوی یوسف و زلیخا کے ورق پھڑ پھڑاتے رہے۔

چند دن انہوں نے خاموشی سے سوچتے ہوئے اور بجھتے ہوئے گزار دیئے پھر اچانک وہ گلیوں میں نکلنے لگے۔ ان کی جان پہچان کے لوگ خال خال ملتے تھے لیکن انہیں لوگوں کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو آس پاس کی فضا کو محسوس کرنے کے لئے نکلتے تھے۔ کبھی وہ ڈاک خانے چلے جاتے اور اس کی سیڑھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے مجبور صاحب کے پاس تک جاتے۔ کبھی وہ اس گھنٹہ گھر کے پاس جا بیٹھتے جو آٹھ برس پہلے بنا تھا اور جس کے گھڑیال کی آواز دور دور تک سنی جاتی تھی۔

وہ گھنٹہ گھر کے سامنے بیٹھے ہوئے اپنی مندی مندی آنکھوں سے سیاہ سوئیوں کو رومن ہندسوں پر حرکت کرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ وقت کی دیمک بڑے انہماک سے ہر چیز کو کھا رہی تھی لیکن کسی کو بھی کھائی ہوئی چیز کا ختم ہو جانا نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں سلیمان بادشاہ کی یاد آتی جو ہیکل بنواتے ہوئے مر گیا تھا اور جس کی ٹھوڑی اس کے عصا پر برسوں ٹکی رہی تھی۔ اس کی رعیت اس کے خوف سے ہیکل کی تعمیر میں مصروف رہی تھی پھر دیمک نے جب اس کے عصا کے آخری ریزے کو بھی کھا لیا تھا تب سلیمان بادشاہ کی لاش منہ کے بل زمین پر آ رہی تھی اور لوگوں نے اپنے سر پر خاک ڈالی تھی کہ جس حکمران کی ہیبت و جبروت سے وہ اتنے دنوں دہشت کھاتے رہے ہیں وہ تو کب کا بے جان ہو چکا تھا۔

گھنٹہ گھر کی سوئیاں حرکت کر رہی تھیں۔ عصائے سلیمانی کو وقت کی دیمک چاٹ رہی تھی اور فضا ایک نامعلوم تناؤ سے بھرتی جا رہی تھی۔ اب وہ گھر سے نکلتے تو انہیں سڑکوں پر سے چھوٹے چھوٹے جلوس گزرتے ہوئے نظر آتے۔ انہیں گزرے ہوئے زمانے یاد آتے۔ کیسی مماثلت تھی ان میں اور آج کے دنوں میں۔ ان کے خیال میں یہ مماثلت محض

ظاہری تھی۔ تاریخ خطِ مستقیم میں سفر نہیں کرتی۔ وہ وقت کے ہمالہ پر کوہ پیماؤں کی طرح دائرے بناتی ہوئی اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے بعض لوگوں کو گمان گزرتا ہے کہ تاریخ دائرں میں سفر کرتے ہوئے اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے سونگھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ بات کچھ اور آگے بڑھ گئی ہے۔ تاریخ کا گھومتا ہوا راستہ کچھ اور طے ہو گیا ہے۔

حبس بڑھتا گیا' اعتماد گھٹتا گیا۔ ان دنوں سائیں فیض بخش کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی۔ وہ کئی دن سے شہر میں نہیں نکلے تھے۔ ایک روز وہ اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے تو مجبور صاحب خبر لائے کے عوام کو شرپسندوں اور تخریب کاروں کی کارروائیوں سے تحفظ دینے کے لئے ریل سے فوجی دستے پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے اسٹیشن کے ساتھ چھولداریاں لگا دی ہیں۔

سائیں فیض بخش نے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر دیکھا تو دور میدان میں انہیں چھولداریوں کی ایک بستی آباد نظر آئی اور ان کی آنکھوں میں برسوں پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب اسی میدان میں شامیانے لگے تھے' دیگیں چڑھی تھیں' رنگین جھنڈیوں سے ماحول ست رنگا ہو گیا تھا اور آنے والوں کے استقبال کے لئے سارا علاقہ امڈ آیا تھا۔ اس روز میزبانوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ...... نہیں' انہوں نے تو جو کچھ بھی سوچا تھا' اچھا ہی سوچا تھا۔

کئی دن گزر گئے' سائیں فیض بخش کی طبیعت نہیں سنبھل رہی تھی۔ مجبور صاحب روزانہ ان کے پاس آتے' کبھی دلیہ کبھی کھچڑی لے کر آتے۔ انہیں بیٹھ کر کھلاتے۔ ان کا دل بہلانے کے لئے باتیں کرتے لیکن ان دنوں سائیں فیض بخش کا دل باتوں سے نہیں بہلتا تھا۔

ایک دوپہر جب مجبور صاحب ساگودانے کا پیالہ لے کر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سائیں فیض بخش صاف ستھرا جوڑا پہنے بیٹھے ہیں اور ان کے کپڑوں سے خوشبو آ رہی ہے۔

"آج تو فیض بھائی تمہاری طبیعت بہت اچھی لگ رہی ہے۔" انہوں نے ٹوپی سر سے

اتار کر پلنگ کے پائے کو پہنائی' چھڑی کو پلنگ پر لٹاتے ہوئے کہا اور خود پائینتی بیٹھ گئے۔

''ہاں بابا۔ آج طبیعت بھلی چنگی ہے۔ دل چاہا آج نہا لوں سو نہا لیا۔ کپڑے بدل لئے۔'' سائیں فیض بخش مسکرائے۔

''بھیا آج تو عطر بھی لگایا ہے تم نے' بڑی لپٹیں آ رہی ہیں۔''

''آج پٹاری میں کچھ ڈھونڈ ھ رہا تھا تو تمہاری مرحومہ بھابی کی نشانی اس کی عطر کی شیشی مل گئی۔ میں تو بھول ہی گیا تھا اسے پٹاری کی تہہ میں رکھ کر۔ ایک ہی بوند رہ گئی تھی اس میں' بس وہی سینے پر مل لی ہے۔ پرانے زمانے کی چیز ہے اس لئے ایک بوند کی اتنی خوشبو ہے۔ آج کی چیزوں میں یہ بات کہاں۔'' سائیں فیض بخش نے ایک آہ بھری۔

''ہاں فیض بھائی' درست کہتے ہو' پرانی باتیں تو گزرے ہوئے زمانوں کے ساتھ چلی گئیں۔'' مہجور صاحب آبدیدہ ہو گئے۔

''آؤ سائیں۔ ذرا بازار گھوم آئیں'' سائیں فیض بخش نے ساگودانے کا پیالہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

''اس ٹیکم ٹیک دوپہریا میں کہاں جاؤ گے۔ ہفتوں سے تو پلنگ پر پڑے ہو۔ اب اس وقت بازار جانے کی کیا تک ہے۔ کچھ خریدنا ہے کیا؟'' مہجور صاحب نے آنگن میں پھیلی ہوئی دھوپ کو دیکھ کر کہا۔

''کیوں مذاق کرتے ہو بابا' ہم بھلا کیا خریدیں گے۔ بس جی چاہ رہا ہے گھر سے نکلنے کا۔'' سائیں فیض بخش کے لہجے میں اتنا اصرار تھا کہ مہجور صاحب نے پلنگ کے پائے سے ٹوپی اٹھا کر سر پر جمائی اور چھڑی پر بوجھ ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ دونوں باہر آئے' ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ فضا نعروں سے گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ہی چھولداریوں کی بستی بھی جاگ گئی۔ خاکی وردی والوں کی چال سے زمین دھمکنے لگی۔ ان کے دوڑتے ہوئے وجود بڑے بڑے ٹرکوں میں سمانے لگے۔

''سوا صدی پہلے دلّی کو خاکی وردی والوں نے لوٹ لیا تھا۔ اب ویسی ہی پوشش والے یہاں کیوں آ پہنچے۔ اللہ اپنا رحم کرے۔'' مہجور صاحب نے اس منظر کو دیکھا تو شیروانی

کے ٹوٹے ہوئے بٹن سے الجھنے لگے۔ ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ان کا بھی ایک بیٹا کالج میں پڑھتا تھا۔ ہر وقت زندہ باد مردہ باد کی باتیں کرتا تھا اور انہیں معاملات سے کٹ کر زندگی گزارنے کے طعنے دیتا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بہت سہمتے تھے۔

سائیں فیض بخش نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے چلتے رہے۔ ان کے پاس اب کسی سوال کا کوئی جواب نہیں رہا تھا۔ گزرتے ہوئے ان کی نظر اسٹیشن کے نام کی تختی پر پڑی۔ انہوں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ تختی بہت میلی ہوگئی ہے اور نستعلیق میں لکھے ہوئے نام کو کھرچ کر کسی نے خطِ نسخ میں اسٹیشن کا نام لکھ دیا ہے۔

نعروں کی آواز اب بہت قریب آ گئی تھی۔ سامنے سے ایک بس نمودار ہوئی۔ بس پر موٹے حروف میں یونیورسٹی کا نام لکھا ہوا تھا۔ لڑکوں کے سر کھڑکیوں سے نکلے ہوئے تھے۔ بعض آدھے دھڑ سے باہر لٹک رہے تھے۔ کچھ چھت پر چڑھے بیٹھے تھے اور خاکی وردی والوں کو مکے دکھا رہے تھے۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر ان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ان کی بس ریلوے کراسنگ کی طرف بڑھی جس کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ بس ابھی وہاں تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ایک جیپ بس کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکلی۔ اس میں سے ایک افسر کود کر اترا اور بھاگتا ہوا پھاٹک تک پہنچا۔ اس نے پھاٹک والے کو پھاٹک بند کرنے کا حکم دیا اور پھاٹک آہستہ آہستہ بند ہوگیا۔

بس رک گئی' کچھ لڑکے نعرے لگاتے ہوئے بس سے نیچے اترنے لگے۔ سائیں فیض بخش کا دل پسلیوں کے پنجرے میں بے قراری سے پر مارنے لگا۔ وہ تیز تیز قدموں سے بس کی طرف بڑھے۔

''فیض بھائی کیا کرتے ہو' آگے مت جاؤ' رک جاؤ۔'' مہجور صاحب نے لپک کر سائیں فیض بخش کی آستین تھام لی جسے انہوں نے ایک جھٹکے سے چھڑا لیا اور آگے بڑھتے گئے۔ مہجور صاحب گھبرائے ہوئے ان کے پیچھے تھے۔ سائیں فیض بخش نے' مہجور صاحب نے دیکھا تھا کہ ٹرکوں سے اترنے والے اپنے افسر کے حکم پر شست باندھ چکے ہیں۔ ان دونوں نے تو بس ''فائر'' کی آواز سنی۔ جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کی آواز بھی لوگوں نے

یوں ہی سنی ہوگی۔

فضا رائفلوں کی باڑھ سے گونج اٹھی۔ ٹین کے پتروں سے بنی ہوئی بس چھلنی ہوگئی اور اس میں بھرے ہوئے لڑکے خون اگلنے لگے۔ جو لڑکے نیچے اتر چکے تھے وہ پلیٹ فارم کی طرف بھاگے تو گولیاں انہیں چن چن کر شکار کرنے لگیں۔

طیش سائیں فیض بخش کے بدن میں آتش فشاں کے لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔ وہ پلٹ کر پلیٹ فارم کی طرف دوڑے۔ ان کی سوکھی ہوئی اور کانپتی ہوئی ٹانگوں نے جانے کس طرح پلیٹ فارم کی اونچائی کو پھلانگا۔ یہ کیسا اندھیر تھا۔ انہوں نے ناقابل یقین حیرت سے ان خاکی وردی والوں کو دیکھا۔ یہ کیسے لوگ تھے ایک بھگت سنگھ بھی تو تھا۔ اس نے سب کے لئے جان دے دی تھی اور یہ اپنوں ہی کی جان لینے کے لئے آگئے تھے؟

ایک گولی ریلوے اسٹیشن کے نام کی تختی پر لگی اور ''اتحاد'' کے ''الف'' کو چھیلتی چلی گئی۔ ہانپتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے سائیں فیض بخش نے رہ جانے والے ''تحاد'' کو دیکھا اور ان کے منطقی ذہن نے اس لمحے بھی ''المنجد'' کی اس عبارت کو یاد کیا جس کے مطابق ''تحاد'' کے معنی ایک دوسرے سے ناراض ہونے اور باہم غضبناک ہونے کے ہیں۔

مہجور صاحب پلیٹ فارم سے نیچے کھڑے ہوئے انہیں آوازیں دے رہے تھے۔ واپس بلا رہے تھے لیکن سائیں فیض بخش کے کانوں میں ایک بھولے بسرے گیت کی گونج تھی، سینکڑوں آوازوں کا لحن تھا۔ ''میرا رنگ دے بسنتی چولا۔''

انہیں اپنی گلی کا ایک نوجوان نظر آیا جو نشانے کی زد میں آچکا تھا۔ وہ اسے بچانے کے لئے بڑھے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ زمین پر گر چکا تھا اور اس کے سینے پر لالے کے پھول کھل رہے تھے۔ انہوں نے اس کا ڈھلکتا ہوا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اسی لمحے ایک دہکتا ہوا انگارہ ان کے بدن میں بجھ گیا۔ ان کی گردن جھکتی چلی گئی۔ مندتی ہوئی آنکھوں نے پلکوں کا کبھی نہ اٹھنے والا پردہ گرنے سے پہلے دیکھ لیا کہ آخری بوند کی خوشبو سے مہکتا ہوا ان کا چولا بسنتی ہوگیا ہے اور وہ اس ایمان کی سلامتی کے ساتھ رخصت ہوئے کہ دیمک عصائے سلیمانی کو کھا چکی ہے اور بادشاہ کا بے جان بدن زمین پر گرنے ہی والا ہے۔ ○○

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	پھول جیسے لوگ (ناول)	انور خان	120.00
۲۔	یاد بسیرے (افسانے)	انور خان	80.00
۳۔	لمحوں کی قید (افسانے)	کشور سلطانہ	40.00
۴۔	انتخاب افسانہ ۸۹ء (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	60.00
۵۔	قند و زقند (طنز و مزاح / نیا ایڈیشن)	فیاض احمد فیضی	150.00
۶۔	برزخ (افسانے)	ہاجرہ شکور	40.00
۷۔	نیلام گھر (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
۸۔	گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے)	علی امام نقوی	50.00
۹۔	بھوکا ایتھوپیا (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	110.00
۱۰۔	کاغذ کی دیوار (افسانے)	محافظ حیدر	60.00
۱۱۔	ڈار سے بچھڑے (افسانے)	سید محمد اشرف	100.00
۱۲۔	آخری داستان گو (ناول)	مظہر الزماں خاں	60.00
۱۳۔	دختر ابلیس (افسانے)	محمد شبیر علی محمودی	60.00
۱۴۔	ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے (سفرنامہ)	پروفیسر علیم اللہ حالی	50.00
۱۵۔	راہ میں اجل ہے (افسانے)	زاہدہ حنا	100.00
۱۶۔	اپٹا اور اردو ڈراما (تحقیق)	شاہد رزمی	60.00
۱۷۔	روتا ہوا آدمی (افسانے)	رئیس نجمی امروہوی	80.00
۱۸۔	کنیادان (ڈرامے)	وجے تنڈلکر (اردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق)	80.00
۱۹۔	اردو فکشن کی تنقید (تنقید)	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	250.00
۲۰۔	سنگ اٹھانے کا حوصلہ (افسانے)	رضاء الجبار	80.00
۲۱۔	پوسٹر (افسانے)	قاسم خورشید	60.00
۲۲۔	جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	90.00
۲۳۔	ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ)	ڈاکٹر قمر رئیس	100.00
۲۴۔	کن فیکون (افسانے)	رضوان احمد	90.00
۲۵۔	رابطہ (تنقید)	جوگندر پال	90.00
۲۶۔	منڈی (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۲۷۔	سوئی کی نوک پر رکا لمحہ (افسانے)	حسین الحق	80.00
۲۸۔	ٹھہرے ہوئے لوگ (افسانے)	انجم عثمانی	80.00

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۹۔	ادب کی تفہیم (تنقید)	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	80.00
۳۰۔	آئینے کی گرد (افسانے)	شکیل جاوید	80.00
۳۱۔	سب رس: جدید اردو میں (تنقید)	قاضی انیس الحق	200.00
۳۲۔	وینس کا پھول (افسانے)	سہیل اعجاز صدیقی	90.00
۳۳۔	موسم عذابوں کا (افسانے)	علی امام نقوی	80.00
۳۴۔	غلام بخش اور دیگر کہانیاں (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	120.00
۳۵۔	شام اودھ (ڈرامے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	100.00
۳۶۔	جھلتے جنگل (ناول)	انور عظیم	100.00
۳۷۔	دس دن (ناول)	ڈرواسا	90.00
۳۸۔	پرندے (افسانچے)	جوگندر پال	110.00
۳۹۔	ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)	مجتبیٰ حسین	100.00
۴۰۔	معاصر اسلامی تحریکات اور فکرِ اقبال (تنقید)	ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	150.00
۴۱۔	ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید (تنقید)	احمد سہیل	200.00
۴۲۔	ذبح (ناول)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۴۳۔	زندہ اپنی باتوں میں: بیدی، عصمت اور عباس (انٹرویوز)	فیاض رفعت	100.00
۴۴۔	اردو میں قصیدہ نگاری (تنقید)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	150.00
۴۵۔	لابوہیم (افسانے)	انور عظیم	150.00
۴۶۔	بساط (ناول)	علی امام نقوی	100.00
۴۷۔	مٹی کے حرم (ناول)	ساجدہ زیدی	250.00
۴۸۔	اصطلاحات نفسیات: تشریح و تفہیم	سید اقبال امروہوی	250.00
۴۹۔	کارواں گزر گیا (افسانے)	ایم۔ ایچ۔ خان	150.00
۵۰۔	حاضر حال جاری (افسانے)	سریندر پرکاش	250.00
۵۱۔	واپسی سے پہلے (افسانے)	صغیر رحمانی	150.00
۵۲۔	نادید (ناول)	جوگندر پال	150.00
۵۳۔	گمشدہ آدمی (افسانے)	یٰسین احمد	150.00
۵۴۔	جدید نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سید اقبال امروہوی	150.00
۵۵۔	غمِ دل وحشتِ دل (ناول)	ڈاکٹر محمد حسن	250.00
۵۶۔	بھگت سنگھ کی واپسی (ڈرامے)	ساگر سرحدی	150.00
۵۷۔	مسیح کی موت (افسانے)	قاضی انیس الحق	200.00
۵۸۔	شہر نگاراں (ناول)	رفعت سروش	200.00

کتاب	مصنف	قیمت
۵۹۔ فساد (ناول)	مہرالدین خاں	100.00
۶۰۔ تنقیحات (تنقیدی مضامین)	ڈاکٹر نیّر جہاں	120.00
۶۱۔ جوگندر پال کی کہانیاں (افسانے)	جوگندر پال	180.00
۶۲۔ جوش ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ	مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس	200.00
۶۳۔ تپش (افسانے)	ولی محمد چودھری	150.00
۶۴۔ رودادِ انجمن (رپوتاژ)	حمید اختر	200.00
۶۵۔ عورت: زندگی کا زنداں (مضامین)	زاہدہ حنا	250.00
۶۶۔ اُردو ناول کے اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	250.00
۶۷۔ ایک کتاب اور..... (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	150.00
۶۸۔ روزمرّہ کی نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سید اقبال امروہوی	180.00
۶۹۔ مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر نیّر جہاں	250.00
۷۰۔ پریم چند: نئے تناظر میں (تنقید)	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	200.00
۷۱۔ عورت اور سماج (تنقید)	ڈاکٹر محمد شہزاد شمس	140.00
۷۲۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا (قلمی شخصیات)	انیس امروہوی	280.00
۷۳۔ خیال کی مسافت (مضامین)	شمیم حنفی	300.00
۷۴۔ سفر کہانی (پاکستانی سفرنامہ)	مرغوب علی	120.00
۷۵۔ ناکام محبت: ساحر لدھیانوی (شخصیت)	اظہر جاوید	180.00
۷۶۔ صحرائی شب و روز (ناول)	سُنیل گنگوپادھیائے (مترجم: نوٹن مکھرجی، اے۔ آر۔ منظر)	120.00
۷۷۔ جاتے جاتے (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	150.00
۷۸۔ راستہ بند ہے (ناول)	مصطفیٰ کریم	220.00
۷۹۔ چاہت کے رنگ (ناول)	طاہر تنویری	250.00
۸۰۔ رات، شہر اور زندگی (مضامین)	شمیم حنفی	220.00
۸۱۔ دکنی نثر پر ایک نظر (تنقید)	ڈاکٹر مجید بیدار	200.00
۸۲۔ قندِ مکرر (طنز و مزاح)	فیاض احمد فیضی	150.00
۸۳۔ شالملی (ناول)	ناصرہ شرما	150.00
۸۴۔ دُور نہیں منزل (ناول)	دلشاد امروہوی	150.00
۸۵۔ اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (تحقیق)	سید تنویر حسین	160.00
۸۶۔ سخنورانِ عہد پہلوی (تذکرہ)	ڈاکٹر غلام اشرف قادری	180.00
۸۷۔ گھنگھرو ٹوٹ گئے (سوانح عمری)	قتیل شفائی	440.00

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۸۸۔	راستے کی بات (شاعری)	ارمان نجمی	180.00
۸۹۔	سایہ اونچے پیڑ کا (افسانے)	شکیل جاوید	150.00
۹۰۔	جہانِ فکشن (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	220.00
۹۱۔	کلاسکی شاعری کا مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر فاطمہ بیگم پروین	200.00
۹۲۔	رشتوں کی دیوار (افسانے)	اکرام الدین شبنم	140.00
۹۳۔	دہلیز سے اُترے پاؤں (افسانے)	شکیل جاوید	150.00
۹۴۔	ایک اور چکمہ (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	160.00
۹۵۔	چاردیواری (ناول)	شوکت صدیقی	500.00
۹۶۔	یہ خلد بریں ارمانوں کی (شہروں کا تذکرہ)	مرتب: ڈاکٹر شکیل اختر	300.00
۹۷۔	غارِ حرا میں ایک رات (سفرنامہ)	مستنصر حسین تارڑ	300.00
۹۸۔	جہانِ دگر (افسانے)	فیاض رفعت	300.00
۹۹۔	آنگن آنگن پُروائی (شاعری)	رفیعہ شبنم عابدی	150.00
۱۰۰۔	ڈوبتے سورج کی روشنی (افسانے)	رئیس نجمی امروہوی	150.00
۱۰۱۔	ترسیل (مکتوبات بنام اختر شاہجہاں پوری)	مرتب: مدہوش بلگرامی	150.00
۱۰۲۔	برگِ نو (شعری مجموعہ)	اختر شاہجہاں پوری	150.00
۱۰۳۔	**نسیم اللغات** (اُردو لغت)	سید قائم رضا نسیم امروہوی	زیرِ طبع
۱۰۴۔	صادقین بتی سے بھلایا نہ جائے گا (سوانح)	عنبرین عباس	زیرِ طبع
۱۰۵۔	بہشت زہرہ (ناول)	ناصرہ شرما	زیرِ طبع
۱۰۶۔	شاید یعنی گمان (شاعری)	جون ایلیا	زیرِ طبع
۱۰۷۔	شکستہ ستون پر دھوپ (ناول)	عطیہ حسین / ترجمہ: انتظار حسین	زیرِ طبع
۱۰۸۔	پسِ پردہ (قلمی مضامین)	انیس امروہوی	زیرِ طبع
۱۰۹۔	ضمیر کی آواز (مضامین)	زاہدہ حنا	زیرِ طبع
۱۱۰۔	سلیم اختر خصوصی مطالعہ (شخصیت)	مرتبین: مرغوب علی، انیس امروہوی	زیرِ طبع
۱۱۱۔	ایک اور بنوارہ (تنقید)	مرتبین: مرغوب علی، انیس امروہوی	زیرِ طبع
۱۱۲۔	انتخاب کلیاتِ مصحفی (شعری انتخابات)	مرتب: مرغوب علی	زیرِ طبع
۱۱۳۔	کلیاتِ خلیل جبران (حصہ اول)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِ طبع
۱۱۴۔	نفسیات کے معمار (شخصیات)	سید اقبال امروہوی	زیرِ طبع

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092

PH. 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com

زاہدہ حنا ہندوستان میں صوبہ بہار کے شہر سہسرام میں پیدا ہوئیں۔ ہوش کراچی میں سنبھالا۔ ۱۶ برس کی عمر سے ان کے مضامین اور افسانے ملک کے اہم ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہونے لگے۔ ان کا شمار برصغیر کے جدید اردو افسانہ نگاروں کی صف اوّل میں ہوتا ہے۔ ایک ناول ''نہ جنوں رہا، نہ پری رہی'' اور کہانیوں کے دو مجموعے ''تیتری سانس لیتا ہے'' اور ''راہ میں اجل ہے'' پاکستان اور ہندوستان سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تراجم انگریزی، جرمن، روسی، ہندی، سندھی، مراٹھی، بنگلہ اور گورمکھی میں ہوئے ہیں۔ اُن کا ناول ''نہ جنوں رہا، نہ پری رہی'' اور کالموں کا مجموعہ ''پاکستان ڈائری'' وانی پرکاشن، نئی دہلی نے ہندی میں شائع کیے ہیں۔ انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی ایک کہانی کا انگریزی ترجمہ اردو کے بے مثال شاعر فیض احمد فیض نے کیا۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں ہندوستانی صدر جمہوریہ نے زاہدہ حنا کو سارک ادبی ایوارڈ برائے ۲۰۰۱ء عنایت کیا۔

اردو صحافت میں بھی زاہدہ حنا نے بڑا نام کمایا۔ ''اخبارِ خواتین'' اور روزنامہ ''مشرق'' سے وابستہ رہیں۔ گزشتہ اٹھارہ برسوں سے روزنامہ ''جنگ'' کے لئے ہفتہ وار کالم لکھ رہی ہیں، اس کے علاوہ ''اردو نیوز'' (جدہ) اور سندھی اخبار ''عبرت'' (حیدرآباد) میں بھی ان کے ہفتہ وار کالم چھپتے ہیں۔ گزشتہ سوا برس سے ہندی کے اخبار ''دینک بھاسکر'' میں ہر ہفتے ''پاکستان ڈائری'' لکھتی ہیں۔ اب تک ان کے تقریباً دو ہزار کالم اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

زاہدہ حنا ''بی۔ بی۔ سی اردو سروس'' سے وابستہ رہیں، ''وائس آف امریکہ'' اور ''ریڈیو پاکستان'' کے لئے کام کیا۔ ٹیلی ویژن کے لئے متعدد سیریل اور لانگ پلے لکھے۔ اُن کے سیریل ''دوسری دنیا'' کو ۲۰۰۰ء کی بہترین پرائیویٹ پروڈکشن کا ایوارڈ ملا۔ امن، جمہوریت، انسانی حقوق، خصوصاً عورتوں اور مذہبی اقلیتوں کے لئے مساوی حقوق کے حوالے سے ان کی تحریریں اور تقریریں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے ''عورت: زندگی کا زنداں'' اور ''ضمیر کی آواز'' ان کی اہم کتابیں ہیں۔

— انیس امروہوی

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092

Ph : 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com